احمد ندیم قاسمی بطور شاعر

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اُردو)

ریگولر پروگرام

سیشن ۲۰۰۴ء — ۲۰۱۰ء

مقالہ نگار:

عمارہ اقبال

لیکچرار شعبۂ اردو

گورنمنٹ کالج برائے خواتین خان پور، ضلع رحیم یار خان

نگرانِ مقالہ:

ڈاکٹر محمد سلیم ملک

پروفیسر شعبۂ اُردو

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

شعبۂ اردو

اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

D/ 1078-OD
9.2.2011

No-R/829/Dean
10/2/11

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ عمارہ اقبال بنت جام محمد اقبال نے ریگولر پروگرام کے تحت پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے ''احمد ندیم قاسمی بطور شاعر'' کے موضوع پر میری نگرانی میں تحقیقی مقالہ تحریر کیا ہے۔ان کا سیشن ۲۰۰۳ تا ۲۰۱۰ ہے۔ نگران مقالہ کی حیثیت سے میں نے اس مقالے کا اول سے آخر تک مطالعہ کیا ہے اور میں اس بات کی بھی تصدیق کرتا ہوں کہ مقالہ نگار نے اپنی اس تحقیقی کاوش کو نقل اور سرقے سے مکمل طور پر محفوظ رکھا ہے اور اوریجنل ریسرچ ورک سے مقالہ نگاری کا عمدہ معیار قائم کیا ہے۔

(نگران مقالہ)
محمد سلیم ملک
۲۰۱۱-۲-۹
پروفیسر شعبہ اردو
اورینٹل کالج جامعہ پنجاب لاہور

9/2/2011
صدر شعبہ اردو
صدر شعبہ اردو
اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

ڈین کلیہ علوم شرقیہ

10.2.11
Dean
Faculty of Oriental Learning
University of the Punjab
Lahore.

تصدیق نامہ

میں تصدیق کرتا ہوں کہ عمارہ اقبال بنت جام محمد اقبال نے پی ایچ ۔ ڈی (اردو) کی ڈگری کے لیے تحقیقی مقالہ بعنوان: ''احمد ندیم قاسمی بطور شاعر'' میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں مزید تصدیق کرتا ہوں کہ:

(الف) مذکورہ مقالے میں پیش کردہ حقائق ونتائج انفرادیت اور امتیاز کے حامل ہیں اور براہِ راست میری نگرانی میں اخذ کیے گئے ہیں۔

(ب) میں نے مقالہ نگار کی تحریر کا مطالعہ کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں بیان کیے گئے نکات تحقیقی صحت ومعیار کے لحاظ سے لائق اعتنا ہیں۔

(ج) اس مقالے میں بروے کار آنے والا تحقیقی مواد اور اس کے مصادر و منابع بہت اہم ہیں اور کسی ادارے میں ان کے حوالے سے کسی بھی ڈگری کے لیے تحقیقی کام نہیں ہو رہا ہے۔

(د) اس مقالے میں حقائق کی جمع آوری کے ساتھ ساتھ تحلیل و تجزیہ کا کام بھی عمدگی سے کیا گیا ہے۔ امیدوار کا اسلوب تحریر منجھا ہوا ہے اور اس میں کوئی قابلِ اعتراض مواد بھی نہیں ہے۔

(ہ) امیدوار نے یہ مقالہ میری نگرانی میں یونیورسٹی کے وضع کردہ طریق کار کے مطابق تیار کیا ہے۔

لہٰذا یہ مقالہ ہر اعتبار سے اس قابل ہے کہ اسے پنجاب یونیورسٹی میں مروّج طریق کار کے مطابق پی ایچ۔ڈی کی ڈگری کے حوالے سے جانچنے کے لیے پیش کیا جا سکے۔

ڈاکٹر محمد سلیم ملک
پروفیسر شعبۂ اردو، اورینٹل کالج
پنجاب یونیورسٹی، لاہور

فہرست ابواب

پیش گفتار

احمد ندیم قاسمی ایسی ہمہ گیر شخصیت کا نام ہے کہ جب ان کا ذکر کیا جا رہا ہو تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی ایک شخصیت کا ذکر نہیں ہو رہا بلکہ کئی شخصیات کے متعلق بات ہو رہی ہے۔ اُنھوں نے اُردو ادب کی مختلف اصناف میں خامہ فرسائی کی، وہ باکمال شاعر اور بہترین افسانہ نگار تھے۔ ندیم نے خوب صورت کالم لکھے اور تنقید کے فن سے بھی بیگانہ نہ رہے۔ تراجم اور علمی و ادبی مضامین میں بھی اُن کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ بچوں کے لیے بھی لکھا۔ ندیم جیسے بلند پایہ شاعر پر تحقیق کرنا میرے لیے جہاں دُشوار تھا، وہاں باعثِ فخر بھی۔ سو اِسی افتخار کے ساتھ میں نے کام کا آغاز کیا اور ''احمد ندیم قاسمی بطورِ شاعر'' میرے مقالے کا عنوان ٹھہرا۔

کسی بھی بڑی علمی و ادبی شخصیت کو ہمہ جہت بیان کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے، بہر حال میں نے ابواب کی صورت اپنے مقالے کو منقسم کیا اور احوال و آثار کو بیان کرنا شروع کر دیا۔ میرے مقالے کا پہلا باب جس کا عنوان ''سوانح و سیرت'' ہے دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصے میں ندیم کے احوال کا بیان عمل میں لایا گیا ہے جس میں اُن کی تعلیم و تربیت، ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی پرورش کے بارے میں بتایا ہے۔ پھر حالات و واقعات نے اُن کی فکر پر کیسے نقوش چھوڑے؟ ندیم نے لکھنا شروع کیا تو اُن کے تجربات و مشاہدات اُن کی تخلیقات پر کس طرح اثر انداز ہوئے؟ ندیم کی ادبی شخصیت کے ارتقا کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے اور اُن کے ہاں جو نیا رُجحان جنم لیتا ہے یا کوئی محرک اُن پر اثر انداز ہوتا ہے وہیں اُس کو زیرِ بحث لا کر اُن کی ادبی شخصیت کا جائزہ لیا گیا۔ دوسرے حصے میں ندیم کی سیرت کے نمایاں پہلو آئے ہیں۔ جن کا مواد زبانی استفسارات اور تعزیتی مضامین پر مشتمل ہے جن میں ندیم کی اُن خوبیوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کی تائید حالات و واقعات سے ہوتی تھی اور واقعات ایسے منتخب کیے جو قاری کے لیے قابلِ توجہ ہوں۔

ندیم کی شعری اصناف جن میں قطعات و رباعیات، نظم و غزل، حمد و نعت، دعا اور سلام شامل ہیں کا تعارف، دوسرے باب ''نگارشات کا جائزہ'' میں کرایا ہے۔ ندیم کی کتابوں کے شائع ہونے کی تفصیل اور دوسری ضروری معلومات بھی اِس باب میں فراہم کی گئی ہیں۔

تیسرے باب میں ''غزل گوئی'' کے زیرِعنوان ندیمؔ کی غزلوں کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ اِس باب میں یہ بیان گیا ہے کہ ندیمؔ کی غزلوں پر جہاں رومانیت کا اثر دکھائی دیتا ہے، وہاں وہ اپنی ذات کے حصار سے نکل کر معاشرے کی طرف رُخ کرتے ہیں اور سماج کے نسلی تفرقات کے خلاف آواز بلند کرتے دِکھائی دیتے ہیں اور ترقی پسند تحریک کے رُجحانات کو فروغ دیتے ہیں۔ اُن کی غزلیں انسانی عظمت، رواداری، اُخوت و مساوات کا درس دیتی ہیں۔ ندیمؔ کی غزلیں ایک محبِّ وطن شاعر کی عکاس ہیں۔ غزل ندیمؔ کی شاعری کا حسن ہے۔ اس لیے یہ باب، مقالہ ہٰذا کے سینے میں دِل کی طرح دھڑکتا ہے۔

غزل کے ساتھ ساتھ نظم بھی ندیمؔ کی شاعری کی نمایاں صنف ہے۔ جس پر چوتھے باب ''نظم گوئی'' کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ اُنھوں نے فنی پختگی کے ساتھ نظمیں لکھیں جب کہ اِن کی نظموں میں موضوعات کا تنوع بھی ملتا ہے۔ کمالِ فن سے طویل مضامین کو سادہ اور رواں انداز میں بیان کیا ہے۔ دیہات کے رومان کی تصویرکاری کے ساتھ ساتھ وہاں کے معاشرتی مسائل اور طبقاتی تضاد کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ پاکستانی قوم پر گزرنے والے ہر المیے اور کرب کو کس طرح محسوس کیا؟ سقوطِ ڈھاکا ہو یا مسئلہ کشمیر ندیمؔ نے پاکستانی مؤقف کو اُبھارا ہے۔ اِن کی نظموں میں خوب صورت تشبیہات، استعارات، تراکیب اور علامات کا استعمال جس حسن سے کیا گیا ہے، اُس کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

پانچواں باب ''قطعہ نگاری'' ہے جس میں ندیمؔ کے قطعات کے فنی محاسن اور شاعرانہ لوازم اُنہیں دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتے ہیں۔ حسن و عشق، حیات و کائنات اور عصری مسائل کو مخصوص انداز میں بیان کرنا ندیمؔ کا فن ہے۔ اُنھوں نے فنی پختگی کے ساتھ پنجاب کی دیہاتی ثقافت کو اُجاگر کیا۔ جب کہ تراکیب، تشبیہات اور استعارات کا برجستہ استعمال بھی نظر آتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے خوب صورتی سے قطعات میں ڈرامے کے اجزا مکالمہ، کش مکش، ارتقا، نقطہ عروج اور اختتام کے استعمال سے ندرت اور جدت پیدا کر دی ہے۔

پانچ باب کو سمیٹنے کے باوجود ندیمؔ کی اصنافِ شاعری ختم نہ ہوئیں۔ اِس لیے جو بچا اُسے چھٹے باب ''دیگر اصنافِ شعر'' کے تحت اسی باب کی گود میں ڈال دیا۔ وہ چاہے ندیمؔ کی رُباعی ہو یا حمد، نعت ہو یا سلام۔

یہی وجہ ہے کہ اِس باب میں کہیں تو مسائلِ حیات کو بیان کیا گیا ہے اور کہیں خدا کے جلال و جمال اور علیم و خبیر جیسی صفات کو، کہیں اُن کی نعت گوئی اُن کی گہری مذہبیت کا سُراغ دیتی ہے تو کہیں شہیدانِ کربلا خصوصاً امام حسینؓ کی جناب میں عقیدت مندانہ سلام و نیاز کا تحفہ ملتا ہے۔

مقالے کا آخری باب ''محاکمہ'' ہے، جس میں ندیم کی سوانح و سیرت اور علم و فن اِس طرح ملے ہوئے ہیں کہ کوئی فاصلہ نہیں رہا، اکائی سی بن گئی ہے۔ اِس باب کو ایک نشست میں، بلکہ ایک نظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔

مقالے میں پس منظر کی طوالت سے اجتناب کیا ہے۔ کسی صنف کا فنی جائزہ لیا بھی ہے تو مختصر، طویل اقتباسات سے مقالہ کو بوجھل نہیں ہونے دیا۔

اِس موضوع پر کام کرنے کا آغاز کیا تو بظاہر نظر آنے والی مشکلات، جس عظیم شخصیت کی وجہ سے آسانیوں میں تبدیل ہوتی گئیں، وہ میرے محترم اُستاد راہنما ڈاکٹر محمد سلیم ملک کی ہے۔ اِس مقالہ میں کوئی خوبی ہے تو وہ اُستادِ محترم ڈاکٹر محمد سلیم ملک کی رہنمائی اور محبت و شفقت کا ثمر ہے۔ جن کا شکریہ ادا کرنے کے لیے واقعتاً میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ ڈاکٹر محمد سلیم ملک کے لیے ''شکریہ'' جیسا مختصر لفظ اِن کے خلوص کا بدل نہیں ہوسکتا۔ میرے دل میں اُن کی عظمت کا جو اَن مٹ نقش ہے، رسمی شکریے کے لفظ سے اُسے دُھندلا نہیں کرنا چاہتی۔

میرے اساتذہ کرام محترم ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری، محترم ڈاکٹر تحسین فراقی، محترم ڈاکٹر زاہد منیر عامر، محترم ڈاکٹر محمد کامران، محترم ڈاکٹر ضیاء الحسن، محترم ڈاکٹر ناصر عباس نیر، محترم ڈاکٹر محمد اقبال شاہد نے ہمیشہ علمی و ادبی معاونت و رہنمائی کی۔ اِن اساتذہ نے جہاں ہر مشکل وقت میں اپنی شفقت سے نوازا، وہاں اپنی حوصلہ افزا باتوں سے میری خود اعتمادی میں اضافے کا باعث بنے۔ میں ان کی بہت احسان مند ہوں۔

ندیم کے خاندان میں ڈاکٹر ناہید قاسمی، محمد حیات قاسمی، نعمان قاسمی، شاہین قاسمی، نفیسہ قاسمی اور نیر حیات قاسمی کی بے حد شکر گزار ہوں جنھوں نے اِس مقالے کی تکمیل کے لیے میری مدد میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔

جس شخصیت نے میرے گونگے اشاروں کو قوتِ گویائی دی اور جس کی بے لوث محبت نے ہمیشہ مجھے حوصلہ دیا وہ میری پیاری امی جان فرحت اقبال ہیں۔ جس طرح پھل اپنے درخت کی محبت کا قرض نہیں چکا سکتا اِسی طرح میں اپنی والدہ کی شفقت کا ذکر کرتے ہوئے الفاظ کی تہی دامنی کا شدت سے احساس کر رہی ہوں۔

میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے عبدالواحد جیسا مجازی خدا ملا۔ جس نے تپتی دوپہروں اور ٹھٹھرتی راتوں کی پروا کیے بغیر اِس مقالہ کی تکمیل میں میرا ساتھ دیا۔ جس کی رفاقت نے میرے لیے ہر مشکل کام آسان بنا دیا۔ اُن کی شخصیت رسمی شکریے کی محتاج نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی مخلصانہ ہمدردی اور حوصلہ افزائی شاملِ حال نہ ہوتی تو یہ مقالہ شرمندۂ تکمیل نہ ہوتا۔

میرے بیٹے عبدالحنان کی شرارتوں نے مجھے کسی بھی مرحلے پر تھکن کا احساس نہیں ہونے دیا۔ اگرچہ میں نے اِس مقالہ کی تکمیل کے لیے اُس کو نظر انداز کیا مگر اُس کی محبت میں کمی نہ آئی۔

میں اپنی دوست ارم سلیم کی تہہ دل سے ممنون ہوں جس کی وجہ سے لاہور میں اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا جو کہ پہلی ملاقات میں مجھے اپنی لگی، پھر اپنی رہی اور انشاء اللہ ہمیشہ اپنی رہے گی۔

میں اپنے کرم فرماؤں میاں محمد ندیم، محمود خان، ڈاکٹر غلام اکبر، پروفیسر اعجاز احمد باجوہ، پروفیسر اورنگ زیب نیازی، پروفیسر صفدر عباس، پروفیسر ذیشان ممتاز، پروفیسر محمد اجمل بھٹی، پروفیسر شعیبہ معید اور ماریہ خان کا بھی خصوصی شکریہ ادا کرتی ہوں جن کے مشوروں نے اِس موضوع کو آسان بنانے میں میری مدد کی۔ اگرچہ وہ اپنے احسانات سے لاعلم ہیں لیکن اُن کی دعائیں ہمیشہ گھنے سائے کی طرح میرے ساتھ رہیں۔

آخر میں محمد کاشان اکبر کا بھی شکریہ ادا کرنا لازم ہے جنہوں نے شب و روز محنت کر کے میرے مقالے کو بروقت کمپوز کیا۔ میں اُن کے ذوقِ جمال کی معترف ہو گئی ہوں۔

عمارہ اقبال

باب اوّل

سوانح وسیرت

سوانح:

احمد ندیم قاسمی، جو کہ اعوان قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ اِن کے آباؤ اجداد عرب کے رہنے والے تھے۔ تبلیغِ اسلام کے لیے علما کے خاندانوں پر مشتمل ایک گروہ، ایران اور پھر افغانستان سے ہوتا ہوا ملتان آ کر بس گیا۔ اُن میں سے چند افراد پر مشتمل ایک تبلیغی جماعت کوہستانِ نمک کے سلسلے کے بلند و بالا پہاڑ ''ساکی سر'' کی وسیع جھیل کے کنارے وادی میں پہنچی۔ ''وادیٔ سون سکیسر'' کے بارے میں منو بھائی لکھتے ہیں:

> ''وادیٔ سون سکیسر، پانی سے باہر آنے والی دنیا کی پہلی خشکی ہے۔۔۔ روئے زمین پر پھیلے سمندر کے اِس پہلے اور واحد کنارے کا ثبوت ''کوہستان نمک'' ہے۔۔۔ بتایا جاتا ہے کہ مہابھارت کی جنگ بھی یہاں ہی لڑی گئی تھی۔ یہ وادی بدھ مت کی تہذیب کا مرکز رہی ہے اور سکندرِ اعظم نے اپنی پہلی چھاؤنی بھی یہاں ہی ڈالی۔۔۔ یہاں کی چٹانیں اپنی عمر کم از کم پچپن کروڑ سال بتاتی ہیں اور اِن پر اعتبار کرنا پڑتا ہے۔ ماہرینِ ارضیات نے اِس وادی کو ارضی علوم کا عجائب گھر قرار دیا ہے۔'' [۱]

ان کے بزرگ وادیٔ سون آ کر آباد ہو گئے۔

ندیم اپنے بزرگوں کے وادیٔ سون سکیسر آباد ہونے کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''جب بابر ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو ملتان کے چند بزرگوں کو علاقہ سون سکیسر کے صنم پرستوں کو تدریسِ توحید کے لیے منتخب کیا۔ ان حضرات میں میرے ایک بزرگ بھی شامل تھے۔ سکیسر پہاڑ کے قدموں میں ایک بہت بڑی جھیل آئینے کے فرش کی طرح بچھی ہوئی ہے اور اِس کے آس پاس ننھی ننھی ڈھیریاں کھڑی ہیں۔ اِن بزرگوں نے جھیل کے مشرق میں ایک پہاڑی پر ''اسلام آباد'' کے نام سے ایک گاؤں آباد کیا اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ مغلوں کے زمانے میں نہایت وقار کے ساتھ زندگی گزارنے کے بعد نادر شاہ درانی کی یلغار کے دنوں میں انہیں یہ گاؤں خالی کرنا پڑا اور وہ شمال مغربی پہاڑوں کی گپھاؤں اور جنگلوں میں چھپ گئے۔ جب درانی واپس ہوا تو یہ اپنی پناہ گاہوں سے نکلے۔ ''اسلام آباد'' لُٹ چکا تھا۔ اِس لیے اِس کے شمال مشرق میں ایک اور پہاڑی پر موجود گاؤں ''انگہ'' آباد کیا۔'' [۲]

''انگہ'' اب ضلع خوشاب میں وادیٔ سون سکیسر کا ایک پہاڑی گاؤں ہے۔ اِن کا گاؤں ''انگہ'' بی بی راستی اور

حضرت سلطان باہو کا گاؤں بھی تھا۔ ندیم کے خاندان کا شمار وادی سون سکیسر کے معزز ترین گھرانوں میں ہوتا ہے۔

ندیم کے والد پیر غلام نبی ''انگہ'' کے خوش حال اور پیروں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ پیر غلام نبی اہم صاحب کرامت بزرگ شخصیت کا درجہ حاصل کر چکے تھے۔ اُن کی شہرت دُور دُور تک پھیل چکی تھی۔ سیالکوٹ، کشمیر اور گجرات کے لوگ اُن کے مرید تھے لیکن انہیں نہ تو صلے سے سروکار تھا اور نہ ہی دنیاوی باتوں سے کوئی دل چسپی تھی۔ پیر غلام نبی کو لوگ احترام اور پیار سے پیر نبی چن کہتے تھے۔

پیر غلام نبی کے دس بھائی اور ایک بہن تھی۔ اِن کے بہن بھائی امیر اور خوش حال تھے۔ خوش حال خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود غریب تھے۔ کیوں کہ اُنھوں نے صرف اللہ سے لو لگا لی تھی اور انہیں دنیوی حشمت سے کوئی غرض نہ تھی۔ اِن کا خاندان تقویٰ، پرہیزگاری اور علمی فضیلت کی وجہ سے پہچانا جاتا تھا۔ حضرت چن پیر نے اپنے خاندان کی اِس روایت کو زندہ رکھا۔ پیر غلام نبی عرف نبی چن نے غلام بیوی سے شادی کی۔ جس کے بطن سے پانچ بچے پیدا ہوئے۔ جن میں اللہ بخش، محمد بخش، احمد شاہ، سعیدہ بانو اور ایک بچی جو کہ کم سنی میں وفات پا گئی، شامل ہیں۔ پیر غلام نبی نے ۱۹۲۳ء میں وفات پائی۔

ندیم کی والدہ غلام بیوی اپنے شوہر سے عمر میں خاصی کم تھیں۔ اِن کی پانچ بہنیں اور ایک بھائی تھا۔ غلام بیوی پُر مزاح گفتگو کرتی تھیں لیکن صابر و شاکر، حوصلہ مند، مہذب اور سلجھی ہوئی خاتون تھیں۔ اُنھوں نے غربت اور تنگی میں بھی پُروقار زندگی بسر کی۔ اپنے بچوں کی تربیت اچھے انداز میں کی۔ اِن کے خاوند نے اللہ سے لَو لگا رکھی تھی۔ اِس لیے بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ان پر تھی۔ اُنھوں نے زندگی کی کٹھن اور دشوار راہوں کو دیکھ کر ہمت نہ ہاری بلکہ ایسے راستے تلاش کیے جن پر چل کر اپنے بچوں کی خوشیاں ڈھونڈ لائیں۔ اُنھوں نے اپنے بچوں کے کھیلنے کے لیے چھینٹ کے کپڑوں اور روئی سے خوب صورت کھلونے اور گیندیں بنائیں، کیوں کہ ان میں انگریزی کھلونے خریدنے کی استعداد نہ تھی۔ اِن کے شوہر کے حصہ میں آنے والی چند ایکڑ زمین سے جو اناج حاصل ہوتا، اِسی پر سال بھر گزارا کرتیں۔ اُنھوں نے ۱۹۵۶ء میں وفات پائی۔

وادیٔ سون سکیسر کے گاؤں انگہ میں پیر غلام نبی کے ہاں ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء میں خوب صورت، گورے چٹے،

شہد رنگی چمکتی آنکھوں والے صحت مند بچے کی پیدائش ہوئی۔ اس بچے سے پہلے اِس گھر میں چار بچوں نے جنم لیا (دو بھائی اور دو بہنیں)۔ اِن میں سے دو حیات تھے۔ ایک بڑی بہن سعیدہ بانو اور ایک بڑے بھائی محمد بخش۔ اِس بچے کا نام اِس کی والدہ نے احمد شاہ رکھا۔ اِن کی والدہ نے یہ نام اپنے ننھیال کے ایک قابلِ احترام بزرگ کے نام پر رکھا جو کہ چوکھنڈی (ضلع چکوال) کے رہنے والے تھے۔ گھر والے احمد شاہ کو پیار سے ''شاہ'' یعنی بادشاہ کہتے تھے۔ شاہ بچپن سے بڑا ذہین اور شرارتی تھا۔ اس کی خوب صورت عادتیں اور ذہانت سب کو اپنی طرف متوجہ کرتی تھیں۔ گھر میں سب سے چھوٹا بچہ ہونے کی وجہ سے بھی بے حد لاڈلا تھا۔ اِس لیے سب کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔

پیرزادہ محمد بخش، احمد شاہ کے بچپن کا منظر اِس طرح دکھاتے ہیں:

> ''گھر کے صحن میں ایک گول مٹول، سرخ و سفید بچہ اُچھل کود میں مصروف ہے۔ بھرا بھرا جسم، گھنگریالے بال، موٹا مگر معصوم ناک نقشہ، کبھی اپنی بڑی بہن کو جا کر چھیڑتا ہے اور کبھی اپنے بڑے بھائی کو۔ کبھی امی کی گود میں دھم سے جا گرتا ہے اور کبھی آپا کی سہیلیوں کے چٹکیاں لے کر بھاگ جاتا ہے۔ جب سب خفا ہونے لگتے ہیں تو دُور ہٹ کر وہ کوئی ایسی چلبلی حرکت کرتا ہے کہ سب کھلکھلا کر ہنسنے لگتے ہیں۔ امی اُس کی بلائیں لینے لگتی ہیں، آپا اُس کا منہ چوم لیتی ہیں۔ بڑا بھائی سینے سے لگا لیتا ہے۔ یہ ہے ہمارا ''احمد شاہ''' ۳؎

احمد شاہ نے اپنے سے آٹھ برس بڑی بہن سعیدہ آپا کا دامن پکڑ کر چلنا سیکھا، انہیں احمد شاہ سے بہت پیار تھا۔ ندیمؔ کی بہن سعیدہ بانو کا ذکر پیرزادہ محمد بخش اِس طرح کرتے ہیں:

> ''آپا نے تو شاہ (ندیمؔ) کو باقاعدہ اپنی چھوٹی بہن بنا رکھا تھا۔ دونوں بیٹھے دیر دیر تک گڑیاں کھیلتے رہتے تھے۔ ویسے شاہ محلے بھر کے لیے ایک تحفہ تھا جس کے بغیر نہ لڑکوں کو آرام آتا نہ لڑکیوں کو چین۔ کبھی لڑکوں میں راجہ بنا بیٹھا ہے اور کبھی لڑکیوں کے جھرمٹ میں بیٹھا، اِن کے ساتھ اپنے گڈّوں کے بیاہ رچا رہا ہے۔ شاید اِسی لیے اس نے شاہ سے ندیمؔ بن جانے کے بعد کہا تھا:
>
> رچی ہوئی ہے رفاقت مرے رگ و پے میں
> کچھ اس طرح کہ اکیلا چلوں تو گھبراؤں'' ۴؎

شاہ نے ۱۹۲۰ء میں تعلیم کا آغاز درسِ قرآن سے کیا۔ اُنھوں نے یہ درس انگہ کی خاندانی مسجد سے لیا۔ جہاں اِن کے خاندان کے بزرگ دینی درس و تدریس کا فریضہ برس ہا برس سے انجام دیتے آ رہے تھے۔ مسجد اور اِس کے درس و تدریس کی اہمیت کی وجہ سے دُور دراز سے لوگ حجروں میں قیام کے لیے آتے اور اِن سے درس لیتے۔ ندیم اپنے ایک انٹرویو میں بتاتے ہیں کہ:

> ''میں چار برس کا ہوا تو انگہ کی اِسی مسجد میں قرآن مجید کے درس میں شامل ہوا، جہاں حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑویؒ نے میرے خاندان کے بزرگوں سے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔'' ۵

احمد شاہ نے جب اِس مسجد سے دس سپارے پڑھ لیے تو اِن کے چچا پیر حیدر شاہ نے اپنے بھائی کی مذہبی مصروفیات اور اُن کے گھر کی صورتِ حال کی وجہ سے دونوں لڑکوں کی تعلیم کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ کیوں کہ یہ اپنے باپ کی باقاعدہ نگرانی اور شفقت سے محروم تھے۔ پیر حیدر شاہ نے ہدایت کی کہ یہ بچے گاؤں کے اسکول سے پرائمری پاس کر لیں، پھر میں انہیں اپنے ساتھ شہر لے جاؤں گا اور تعلیم کے ساتھ ساتھ قرآن پاک کا درس اور دینی تربیت میں خود کروں گا۔ اِس طرح اِن کی دینی اور دنیوی تعلیم و تربیت مکمل ہو سکے گی۔

۱۹۲۱ء میں احمد شاہ نے انگہ کے پرائمری اسکول میں داخلہ لیا۔ ۱۹۲۳ء میں جب احمد شاہ تیسری جماعت میں تھے تو اُن سے آٹھ برس بڑی بہن سعیدہ بانو (معروف افسانہ نگار اور صحافی ظہیر بابر کی والدہ) کا بیاہ ہو چکا تھا اور اِن سے دو سال بڑے بھائی محمد بخش بھی اپنے چچازاد بھائی محمد حیات کے ساتھ پرائمری پاس کر کے کیمبل پور جا چکے تھے (اُس وقت پرائمری چار جماعتوں پر مشتمل ہوتی تھی)۔ اُس وقت اِن کے والد پیر نبی چن کی طبیعت ناساز ہوئی۔ اُن کے آخری وقت میں احمد شاہ اپنی مائے کے ساتھ اپنے 'بابو جی' کے قریب بیٹھے تھے۔ اُن کی بدلتی ہوئی حالت دیکھ کر، اِن کی والدہ رونے لگیں تو پیر نبی چن نے احمد شاہ کو اپنے پاس بلایا۔ اس حوالے سے ناہید قاسمی رقم طراز ہیں:

> ''والدہ، پیر صاحب کی بدلتی ہوئی کیفیت دیکھ کر رونے لگیں تو پیر نبی چن صاحب نے احمد شاہ کو پاس بلا کر اپنی شریکِ حیات سے کہا: ''روتی کیوں ہو؟ میں یہ دو شیر (محمد بخش اور احمد شاہ) تمہارے پاس چھوڑے جا رہا ہوں۔'' ۶

اِس کے بعد اِن کا انتقال ہو گیا۔ آٹھ برس کی عمر میں احمد شاہ نے یتیمی کا صدمہ سہا۔

احمد شاہ کی گھٹی میں ہی شعر و شاعری تھی، اِن کی 'مائے' جب اپنے گھریلو کاموں کے دوران اپنی مترنم اور سریلی آواز میں علاقے کے گیت گنگناتی تھی تو شاہ اپنی توجہ ہر طرف سے ہٹا کر اِن گیتوں کے بولوں کو غور سے سنتے تھے اور زیرِلب دہراتے رہتے تھے۔ پیرزادہ محمد بخش لکھتے ہیں:

''جب شاہ چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا، اُس وقت اُس کی عمر یہی کوئی آٹھ نو برس ہو گی۔ ہمارے ایک عزیز کی شادی ہوئی۔ عورتیں ڈھولک، گھڑا اور تھالی بجا کر گیت گانے لگیں۔ مرد محلے کی چوپال پر چلے گئے اور بچے مکان کی چھت پر جا بیٹھے۔ ہم بھی چھت پر بیٹھے، اِن دیہاتی گانوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ اچانک مجھے شاہ کا خیال آیا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو مجھے کہیں نظر نہ آیا۔۔۔ گاؤں بھر میں ڈھونڈ تھکا۔۔۔ میری تلاش کی آخری منزل اُن لڑکیوں اور بڑی بوڑھیوں کی ''محفلِ سماع'' تھی جس کا ذکر کر چکا ہوں۔ وہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ شاہ لڑکیوں کی ٹولی میں بیٹھا ہے۔ وہ گا رہی ہیں۔۔۔ جوں ہی ان کے گیت کی روانی ٹوٹنے لگتی ہے وہ شاہ پر جھکتی ہیں۔۔۔ شاہ کی مدد سے یہ لڑکیاں نئے نئے بول گاتی چلی جاتی ہیں۔ اِس دن کے بعد شاہ کو باقاعدہ بلاوے آنے لگتے۔ وہ نئے نئے ماہیے، ڈھولے اور ٹپے گھڑ گھڑ کر انہیں تھماتا جاتا۔ لڑکیوں کی جس ٹولی سے شاہ نتھی ہو جاتا۔ اِس کا مقابل ٹولی سے شکست کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔'' ؎

احمد شاہ بچپن سے ہی ذہین اور محنتی تھے۔ چوتھی جماعت میں وظیفہ کا امتحان ہوا تو ضلع بھر میں شاہ اوّل آیا۔ ایک سال کے بعد جب انہیں وظیفہ ملا جو کہ ۶۰ روپے تھا۔ اُنھوں نے یہ رقم اپنی مائے کے ہاتھ پر رکھ کر کہا کہ یہ میری پہلی کمائی ہے تو والدہ خوشی سے رو پڑیں۔ شاہ اپنی مائے سے جدا نہیں ہونا چاہتے تھے۔ ۱۹۲۵ء میں نو برس کی عمر میں انہیں تعلیم کے حصول کے لیے اپنی والدہ سے جدا ہونا پڑا۔ ماں نے بھی اپنے بچوں کے بہترِ مستقبل کے لیے تنہائی اور جدائی قبول کر لی اور شاہ کو کیمبل پور (اٹک) روانہ کر دیا۔

احمد شاہ اپنے چچا پیر حیدر شاہ، چچی شرفاں بیوی اور اپنے بڑے بھائی پیرزادہ محمد بخش کے پاس کیمبل پور پہنچ گئے۔ اِن کے چچا، چچی کے ہاں اولاد نہ تھی لیکن انھوں نے خاندان کے بچوں پر دستِ شفقت رکھا۔ شاہ نے اِن کی محبت کا ہمیشہ ذکر کیا۔ شرفاں بیوی کی اِسی شفیق اور مخلص طبیعت کی وجہ سے شاہ انہیں ماسی یعنی ماں جیسی کہتے

تھے۔ چچا اور چچی کی توجہ اور شفقت نے ان بچوں کو دینی اور دنیوی تعلیم سے روشناس کیا۔ اِن کے چچا پڑھے لکھے انسان تھے۔ احمد شاہ کو اپنے چچا کے گھر میں ہر سہولت حاصل تھی۔ آرام دہ صوفے، عمدہ فرنیچر، آراستہ کمرے، خدمت کے لیے ملازم، سواری کے لیے کار، لیکن اپنی اچھی تربیت کی وجہ سے توازن اور وقار سے برتا اور پوری توجہ اور لگن سے تعلیم حاصل کی۔ کیوں کہ اِسی تعلیم کے حصول کے لیے اپنی مائے سے جدائی برداشت کی تھی۔ ندیم اپنے ایک انٹرویو میں بتاتے ہیں:

> ''میرے والد صاحب کا انتقال ہو گیا تھا لہٰذا میں نے اپنے چچا کی سرپرستی میں ہی تعلیم حاصل کی۔ اگرچہ وہ سول سروس میں تھے مگر انہیں علم و ادب کا بے حد شوق تھا۔ ان کے ذاتی کتب خانے میں اعلیٰ درجے کی کتابیں ہوتی تھیں۔ اِس کے علاوہ گھر میں اِس زمانے کے معروف رسالے ''نگار''، ''صوفی'' اور ''ہمایوں'' وغیرہ بھی آیا کرتے تھے۔ ہمارے چچا ہمیں صبح سویرے عبدالحق محدث دہلوی کی لکھی ہوئی تفسیر حقانی پڑھایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ہم سے تاریخ اور علم کے بارے میں بھی دل چسپ اور معلومات افزا گفتگو کیا کرتے تھے جو میرے اور میرے بھائیوں (سگے بھائی اور کزنز) کے لیے بہت مفید ثابت ہوتی تھی۔'' ۸

شاہ کو اپنے چچا سے علامہ اقبال، ظفر علی خان کے ساتھ دیگر شعرا کے اشعار بھی سننے کو ملتے اور گھر میں آنے والے ادبی جرائد و رسائل نے بھی اِن کا معیاری ادب کا ذوق نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔ موسم گرما کی تعطیلات میں جب گاؤں جاتے تو ان تین ماہ میں انگہ کے اسکول کی مختصر سی لائبریری سے کتابیں لے کر پڑھتے۔ یہیں پر اُنھوں نے پریم چند کے افسانوی مجموعے پڑھے۔ شاہ کی اپنی تعلیم کے ساتھ سچی لگن کے حوالے سے ان کے ہم مکتب احمد شفیع لکھتے ہیں:

> ''اپنی کتابوں کے ساتھ احمد شاہ کی لگن اور کرید اُسے دوسرے طالب علموں سے ہمیشہ الگ رکھتی تھی اور اُس کی باوقار خاموشی میں مستقبل کا ایک جری دانش ور پرورش پا رہا تھا۔'' ۹

۱۹۲۶ء میں جب احمد شاہ چھٹی جماعت میں تھے تو ایک روز سب بھائی چاقو سے گنا چھیل چھیل کر چوس رہے تھے تو چاقو سے اِن کے چہرے پر ایک بڑا گھاؤ لگا جو کہ نشان چھوڑ گیا۔ چاقو ان کے گال کو ہونٹ سے

گردن تک چیرتا ہوا نکل گیا۔

بقول محمد طفیل:

''قاسمی کے چہرے پر ایک بڑا گھاؤ ہے جو قطب شمالی سے قطب جنوبی تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے بارے میں ان سے معلوم ہوا کہ بچپن میں ایک دن بھائی محمد بخش چاقو سے گنا چھیل چھیل کر مزے سے چوس رہے تھے۔ میں نے حصہ مانگا، انکار پر چھینا جھپٹی شروع ہوئی تو چاقو کی تیز دھار رخسار پر تیرتی چلی گئی۔'' ۱۰

احمد شاہ نے یہ زخم اپنے چچا جان سے چھپائے رکھا اور شروع شروع میں اِن کو درد بھی بہت ہوا، خون بھی بہا لیکن انھوں نے نہ تو کسی سے شکایت کی اور نہ ہی کسی کو پتہ چلنے دیا۔ بھائی نے اِن کے زخم میں راکھ بھر دی۔ درد کی وجہ سے شروع شروع میں ان کو کھانا کھانے میں بھی مشکل ہوتی تھی۔ ان دنوں زخم چھپانے کی وجہ سے گال پر ہاتھ رکھ کر کھانا کھاتے۔ ایک ماہ کے بعد شاہ کا یہ زخم اُن کی چچی نے دیکھا اور وہ گال پر سرخ داغ دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ ڈاکٹروں کے پاس بھی لے کر گئیں، آہستہ آہستہ اُبھار ختم ہو گیا لیکن داغ ختم نہ ہوا۔

پیرزادہ محمد بخش رقم طراز ہیں:

''جن دنوں شاہ اس زخم کو اپنے ہاتھ سے چھپائے پھرتا تھا، میں نے اس کی تیمارداری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ ایک بار جب میں اس کے زخم پر ویزلین لگا رہا تھا تو اس نے ایک پرانے شعر کی پیروڈی کی اور بولا:

میرے زخموں پر مت رکھو مرہم
میرے بھائی کی یہ نشانی ہے'' ۱۱

۱۹۲۷ء میں جب احمد شاہ گیارہ برس کے تھے تو پیرزادہ محمد بخش نے یہ ارادہ کیا کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں گاؤں جا کر ''انجمنِ نوجوانانِ اسلام'' بنائیں گے اور وہاں لوگوں کو نماز روزے کی طرف راغب کریں گے اور قرآن کا ترجمہ پڑھائیں گے۔ محمد بخش نے اس کا ذکر احمد شاہ سے کیا تو اُنھوں نے اِس کا منشور تیار کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ اِس حوالے سے پیرزادہ محمد بخش لکھتے ہیں:

''میں نے شاہ سے اِس کا ذکر کیا تو کہنے لگے کہ اِس کا ''منشور'' میں تیار کرتا ہوں اور میری حیرت کی حد نہ رہی جب ایک ڈیڑھ گھنٹے کے اندر شاہ اپنے ہاتھ میں منظوم

منشور لیے میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا (مجھے بے حد افسوس ہوا کہ اس کا مسودہ مجھ سے ضائع ہو گیا ورنہ آج اُس کا مطالعہ دل چسپ ہوتا)۔ میں نے اس انجمن کے مقاصد کے بارے میں جو کچھ سوچا تھا وہ سب اس نظم میں بڑی خوبی اور سلاست سے آ گیا تھا۔ یہ شاہ کی ابتدائی اُردو شاعری تھی۔" [۱۲]

گیارہ برس کی عمر میں منظوم منشور لکھنا، ان کے چچا کی تربیت ہی کا نتیجہ تھا۔ بچپن سے ہی شاہ کو شعر و شاعری کا شوق تھا۔ چھٹیوں میں جب انگہ جاتے تو گیت کہتے۔ علاقائی بولی میں ٹپے اور ماہیے کہتے اور لڑکیاں شادی بیاہ کے موقع پر اُنہیں اپنے ساتھ شامل رکھتیں۔ اس طرح بچپن سے ہی احمد شاہ اپنے گاؤں اور قریبی علاقوں میں بطور شاعر مقبول ہو گئے۔

احمد شاہ جب ساتویں جماعت میں تھے تو اُنھوں نے پہلا ناول لکھا۔ ندیمؔ لکھتے ہیں:

"بارہ برس کی عمر میں مَیں نے ۸۰ صفحات کا ایک ناولٹ لکھا جو میرے ہم جماعتوں میں بہت پسند کیا گیا۔" [۱۳]

۲۹۔۱۹۲۸ء میں جب احمد شاہ آٹھویں جماعت میں تھے۔ ریڈ کراس سوسائٹی کے تحت مضمون نویسی کا مقابلہ ہوا تو شاہ نے اس مقابلے میں حصہ لیا اور پنجاب بھر میں اوّل رہے۔ احمد شاہ کو لکھنے پڑھنے کا شوق تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ کھیل کود میں بھی دل چسپی رکھتے تھے۔ خاص طور پر کبڈی اور والی بال شوق سے کھیلتے۔ اس کے ساتھ ساتھ احمد شاہ نے ہم نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ شاہ کے لیے تخلیقِ فن میں معاون اُن کا مشاہدہ اور تجربہ بھی رہا۔ جب گاؤں جاتے تو وادی میں دُور دُور تک گھومتے۔ اِس طرح اِن کی معلومات میں خوب اضافہ ہوا۔ احمد شاہ نے ۱۹۲۹ء میں گورنمنٹ مڈل اینڈ نارمل اسکول کیمبل پور سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ احمد شاہ جب میٹرک میں تھے تو اِن کے قریبی عزیزوں میں ایک ہی دن تھوڑے تھوڑے وقفے سے ماں اور بیٹی کا انتقال ہوا اور ان کے جنازے ایک ساتھ اُٹھے۔ اِن کے اِس پرملال انتقال پر احمد شاہ نے نظم کہی اور چچا کو بھی دِکھائی۔ حیدر شاہ یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ وزن اور بحر بالکل درست تھے۔ اُنھوں نے تلقین کی کہ اقبالؔ اور ظفر علی خان کی طرح قومی نظمیں کہا کرو۔

۱۹۳۰ء میں اِن کے چچا کا تبادلہ شیخوپورہ ہو گیا تو یہ بھی اُن کے ہمراہ وہاں آ گئے اور یہیں کے ایک اسکول

میں داخل ہو گئے۔ قومی رہنما مولانا محمد علی جوہر جو کہ ملک کی آزادی چاہتے تھے، شاہ اُن کے اِس قول سے بہت متاثر ہوئے جو اُنھوں نے انگلینڈ میں کہے کہ مجھے اپنے ملک کی آزادی کی طلب ہے۔ میں غلام ہندوستان میں واپس نہیں جانا چاہتا۔۔۔ اور وہ اِس غلام ملک میں واپس نہ آئے اور وہیں فوت ہو گئے۔ احمد شاہ پر اِس صدمے کا گہرا اثر پڑا اور اُنھوں نے اپنے احساسات کو نظم کی شکل دے دی۔ یہ پندرہ بیس اشعار پر مشتمل تھی۔ پیرزادہ محمد بخش لکھتے ہیں:

> ''(اسے) اس نے چچا جان کے سامنے رکھ دیا۔ وہ اسے پڑھ کر دم بخود رہ گئے۔ پھر ضبط نہ کر سکے اور زار زار رونے لگے۔ اُنھوں نے شاہ کو اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ اُن کے لیے یقیناً یہ ایک معجزہ تھا کہ وہ شاہ جو اُن کی ہیبت اور احترام سے اُن کے سامنے ''جی، جی ہاں'' کے سوا کوئی لفظ نہیں بولتا تھا، ایک ایسا مرثیہ لکھ لایا ہے جس کی توقع دسویں جماعت کے ایک طالب علم سے نہیں کی جا سکتی۔ چچا جان کا ذوقِ شاعری نہایت اعلیٰ درجے کا تھا۔ اس لیے وہ شاہ کے لکھے ہوئے اِس مرثیے کے جذبہ واحساس کے علاوہ اِس کی فنی صحت سے بھی بہت متاثر ہوئے۔ اُنھوں نے اُسی وقت کار گیراج سے نکلوائی اور لاہور تشریف لے گئے۔'' [۱۴]

چچا نے یہ نظم لاہور کے ایک روزنامے کو دی۔ یہ نظم ۱۹۳۱ء میں روزنامہ ''سیاست'' جس کے مدیر سید حبیب تھے، کے سنڈے ایڈیشن کے فرنٹ صفحہ پر مختلف رنگوں کی آرائش اور خوب صورت کتابت کے ساتھ پیرزادہ احمد شاہ احمؔد کے نام کے ساتھ شائع ہوئی۔ اس نظم کے حوالے سے احمد شاہ کو بہت سے تعریفی خطوط موصول ہوئے۔ جس میں اہم داد علامہ اقباؔل کی تھی۔ اقباؔل کو جب اِس بات کا علم ہوا کہ یہ نظم چودہ برس کے ایک بچے نے لکھی ہے جس میں ایک بھی لفظ کی تصحیح کی ضرورت نہیں تو وہ حیران رہ گئے۔ اقباؔل کی داد اور دوسرے لوگوں کی حوصلہ افزائی سے احمد شاہ کو بے حد خوشی ہوئی۔ چچا حیدر شاہ نے تلقین کی کہ قومی نظمیں لکھو اور غزل سے اجتناب کرو۔ اس لیے احمد شاہ نے آغاز میں غزلیں کہہ کر بھی چھپائے رکھیں۔ اِس طرح جنوری ۱۹۳۱ء سے شاعری کا باقاعدہ آغاز ہوا جو آخر تک رہا۔

احمد شاہ نے شاطر غزنوی کے مشورے سے اپنا تخلص ''ندیؔم'' چُنا۔ اِس حوالے سے احمد شاہ لکھتے ہیں:

> ''جب میں میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ ایک بزرگ نے جن کا اسم گرامی مقبول انور داؤدی ہے، جو روزنامہ ''سیاست'' میں کام کرتے تھے، مجھے خط لکھا کہ اُن

کے نوجوان دوست شاطر غزنوی سے رہنمائی لوں۔ انہیں ایک غزل بھیجی جو اُنھوں نے
پوری کی پوری بدل دی اور مقطع میں اپنی تعریف شامل کر دی۔ مجھے یہ مہربانی اچھی نہیں
لگی۔ میں نے کلام بھیجنا بند کر دیا۔ البتہ اُن کے ایک احسان کو کبھی نہیں بھولوں گا کہ
اُنھوں نے شروع ہی میں میرا تخلص ''ندیمؔ'' تجویز کیا۔'' ۱۵

ندیمؔ اپنے تخلص کے بارے میں لکھتے ہیں:

یہ فقط میرا تخلص ہی نہیں ہے، کہ ندیمؔ
میرا کردار کا کردار ہے اور نام کا نام ۱۶

''ندیمؔ''، تخلص منتخب کرنے کے بعد پیرزادہ احمد شاہ احمد نے اپنا ادبی نام احمد ندیمؔ قاسمی رکھا۔ احمد اُن کے نام کا حصہ تھا، ندیمؔ تخلص، جب کہ قاسمی، اپنے گاؤں میں قاسم کی آل ہونے کی وجہ سے اپنایا۔ اِن کے نام کے حوالے سے ناہید قاسمی لکھتی ہیں:

''احمد ندیمؔ قاسمی کے نام کا خوب صورت، خوش آواز جگمگاتا ہوا مرکب تیار ہوا جسے
دنیائے علم وادب میں حیاتِ جاوداں حاصل ہوئی۔'' ۱۷

۱۹۳۱ء میں ندیمؔ نے گورنمنٹ ہائی اسکول شیخوپورہ سے میٹرک پاس کر لیا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد اِن کے چچا نے انہیں بہاول پور کے صادق ایجرٹن کالج میں سالِ اوّل میں داخل کروا دیا۔ کیوں کہ اُنھوں نے ۱۹۳۱ء میں سول سروس سے ریٹائر ہونا تھا اور بہاول پور کے نواب نے اِن کو ریاست کے مشیرِ مال کی حیثیت سے بہاول پور آنے کی پیش کش کی تھی۔ اسی لیے ندیمؔ کو اُن کے چچا نے عارضی طور پر ہوسٹل میں رہائش کا انتظام کروایا۔ لیکن حکومت نے اِن کی ملازمت دو سال کے لیے بڑھا دی۔ حیدر شاہ ۱۹۳۴ء سے پہلے بہاول پور نہیں جا سکتے تھے۔ اِس لیے ندیمؔ کو ہوسٹل میں ہی رہ کر تعلیم حاصل کرنا پڑی۔ یہاں پر ندیمؔ کو اچھے اساتذہ ملے جنھوں نے اِن کی صلاحیتوں کو خوب نکھارا اور اِس سے اِن کو نثر اور شاعری کی تخلیقات کو جاری رکھنے کا موقع بھی ملا۔ اِن اساتذہ کی رہنمائی میں ندیمؔ نے فارسی، اُردو اور انگریزی کے اہم شعرا اور ادبا کی تخلیقات بھی پڑھیں جس سے ان کا مطالعہ وسیع ہوا۔ خاص طور پر علی گڑھ یونیورسٹی سے آنے والے پروفیسر پیرزادہ عبدالرشید جو کہ وسیع مطالعہ رکھتے تھے۔ اِس کالج سے وابستہ ہو گئے۔ ندیمؔ کا نام بھی انہی کے گروپ 'سولجرز' میں شامل تھا۔ ان کی صدارت میں کالج میں ڈرامے، مباحثے، مشاعرے اور ادبی جلسے ہوئے۔ جس سے کالج میں نئی نئی تحریکوں کا آغاز ہوا۔ ندیمؔ کی شاعری بھی انہی

دنوں پروان چڑھی۔ 'سولجرز' کے اجلاس ہر ہفتے ہوتے تھے، ان میں ندیم اپنی نئی نئی نظمیں سنایا کرتا تھا۔ فورتھ ائیر میں ندیم سولجرز گروپ کا سیکرٹری بن گیا۔ ۱۹۳۵ء۔۱۹۳۱ء میں ندیم صادق ایجرٹن کالج بہاول پور کے میگزین ''نخلستان'' کے مدیر رہے۔ اِن کے ادبی ذوق کو نکھارنے میں ان کے دوست محمد خالد اختر نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ وہ مغربی ادب کا خوب مطالعہ رکھتے تھے، دونوں مل کر کتابیں پڑھتے اور اُن پر بحث مباحثہ کرتے۔ محمد خالد اختر کی تجویز پر ندیم نے افسانے لکھنے شروع کیے۔ اِس طرح اُنھوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ افسانے پر بھی توجہ دینی شروع کی۔

۱۹۳۴ء میں ندیم کے چچا مشیر مال مقرر ہو کر بہاول پور تشریف لائے۔ تقرر کے فوراً بعد دس دن کی رخصت لے کر گاؤں چلے گئے اور ایک صبح نماز کے بعد وہیں حرکتِ قلب بند ہو جانے سے وفات پائی۔ ندیم اُس وقت سالِ سوم کے طالب علم تھے۔ چچا کی وفات کے بعد تو ندیم کی دنیا ہی اُجڑ گئی۔ اِس سانحہ کی خبر سنتے ہی گاؤں پہنچے اور تعلیم ترک کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اُس وقت ایک تو ندیم دُکھی تھے، دوسرا لوگوں کے بدلتے ہوئے رویوں نے انہیں حیران اور مایوس کر دیا۔ ان کے بڑے بھائی نے بی۔اے تو کر لیا تھا لیکن ابھی کوئی ملازمت نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا اس شدید غم نے انہیں یتیمی کا احساس دلایا۔ اس لیے ندیم کسی ملازمت کا سوچنے لگا کہ وہ حالات کا مقابلہ کرے گا اور تعلیم کو پرائیویٹ طور پر مکمل کر لے گا۔ اِن حالات میں ندیم کے اُستاد مخدومی پیرزادہ عبدالرشید نے بھی اِن کی حوصلہ افزائی کی اور انہیں گاؤں سے بلا لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے چچا مرحوم نے مرنے سے قبل ان کی فیس کا بندوبست کر لیا تھا۔ اِس حوالے سے ندیم خود بتاتے ہیں:

> ''۔۔۔اب میرے اقتصادی حالات ایسے نہ تھے کہ میں (ہاسٹل میں رہ کر) اپنی تعلیم جاری رکھ سکوں۔ جب میں چچا کے انتقال کے بعد گاؤں گیا تو مجھے بتایا گیا کہ چچا تو میرے فورتھ ائیر کے آخری مہینے تک کی کالج فیس ایک عزیز کے پاس جمع کروا گئے ہیں! جس پر میں دوبارہ گاؤں سے واپس آ گیا۔ یوں میں نے گریجویشن کی لیکن مرحوم اگر ایسا بندوبست نہ کرتے تو میں ایف۔اے سے آگے تعلیم حاصل نہ کر پاتا۔'' ۱۸

ندیم جو کہ ذہین اور محنتی طالب علم تھا، اپنی اِسی ذہانت کی وجہ سے اُنھوں نے کبھی اساتذہ کے سامنے بیٹھنے اور بات کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی بلکہ ہمیشہ صفِ اوّل کے ڈیسک پر بیٹھتے تھے۔ اپنی سچی لگن کی وجہ

سے ۱۹۳۵ء میں ندیم نے بی۔اے پاس کر لیا۔ ان دنوں ندیم نے افسانے بھی لکھنا شروع کر دیے تھے جو کہ ادبی رسائل میں شائع بھی ہوئے۔ محمد خالد اختر لکھتے ہیں:

''۱۹۳۵ء میں (بی۔اے کے) نتیجے کے دنوں میں وہ دس پندرہ روز کے لیے ٹھہرنے کے لیے آیا۔ ہم شام کو ملتے، لمبی سیروں پر جاتے، ایک خزاں رسیدہ باغیچے میں بینچ پر بیٹھ کر دنیا جہان کی باتیں کرتے۔ ایک بار اسی بینچ پر میں نے ندیم کو ایک کہانی لکھتے دیکھا۔ اُس نے فخر سے پڑھ کر سنایا۔ اس کا عنوان بھی عجیب طور پر میرے ذہن میں اٹک گیا ہے۔ اُس کا نام ''کالا کوٹ'' تھا۔۔۔ کہانی مجھے پسند آئی اور میں ندیم کے کہانی لکھنے پر بڑا خوش تھا۔۔۔ یہ ندیم کی زندگی میں ایک نئی روش کی ابتدا تھی۔ ایک فیصلہ کن لمحہ! اس کے بعد اُسے کئی کہانیاں لکھنا تھیں۔'' [۱۹]

۱۹۳۵ء میں بی۔اے کرنے کے بعد ندیم اپنے بھائی کے پاس چلے گئے جو کہ لاہور میں ملازمت کر رہے تھے۔ محمد بخش نے ہر حوالے سے ندیم کا خیال رکھا تاکہ اُنھیں اپنے چچا کے بچھڑ جانے کا احساس شدید نہ ہو لیکن ندیم جو کہ ذہین اور حساس انسان تھا اور بلا کا خوددار بھی۔ اُنھیں اِس بات کا احساس تھا کہ اُن کے بھائی (لالہ) پر جو بوجھ ہے اُسے کم کرنا چاہیے۔ لہٰذا اُنھوں نے ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔ بڑی مشکل کے بعد (۱۹۳۶ء۔۱۹۳۷ء) انھیں الیکشن آفس میں محرری کی اسامی ملی۔ ندیم جیسے خوددار انسان کے لیے کسی کے ماتحت رہ کر کام کرنا بڑا دشوار تھا۔ اس ملازمت کے تلخ تجربے کے متعلق ندیم لکھتے ہیں:

''ملازمت کا پہلا تجربہ نہایت تلخ تھا۔ میں ریفارمز کمشنر کے دفتر میں بطور ''محرر'' بھرتی ہوا۔ (۱۹۳۷ء میں) بیس روپے ماہانہ تنخواہ تھی۔ دفتر گلاب سنگھ پریس کے قریب ایک تکون سی عمارت کی بالائی منزل میں تھا۔ افسر ایک پٹواری تھا جو پلنگ پر بیٹھتا تھا اور ہم محرر لوگ نیچے فرش پر بچھی ہوئی چٹائیوں پر ووٹروں کی فہرستوں کی چیکنگ کرتے تھے۔ دن بھر فلاں ولد فلاں سکنہ فلاں کی رٹ لگی رہتی تھی۔ ایک روز پٹواری نے مجھے حکم دیا کہ جاؤ پریس میں جا کر روشنائی بھر لاؤ۔ میں نے عرض کیا کہ اس کام کے لیے چپڑاسی موجود ہے جو باہر برآمدے میں بیٹھا ہے۔ میں محرر ہوں۔ میں محرری کا ہی کام کروں گا۔۔۔ اور اُس نے میری چھٹی کر دی۔'' [۲۰]

ندیم کی خودداری اور غیرت کا یہ عالم تھا کہ ایم۔اے انگریزی ادب کے لیے اُنھوں نے لاہور کے دو اہم کالجوں میں

درخواستیں دیں۔ میرٹ لسٹ میں ان کا نام بھی آ گیا لیکن داخلہ فیس نہ ہونے کی وجہ سے داخلہ نہ لے سکے۔ کیوں کہ ان کی خودداری نے انہیں کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے روکا۔ وقت گزر جانے کے بعد جب ان کے ہندو دوستوں منوہر اور نندکو اس بات کا پتہ چلا تو اُنھوں نے اس بات کا ذکر نہ کرنے کا گلہ کیا۔

ندیم گاؤں واپس آ گئے اور ملازمت کی تلاش بھی جاری رکھی۔ ملازمتوں کے اشتہار دیکھتے اور ان کے لیے درخواستیں بھجواتے رہے۔ اِس دوران خاندان کے مربیوں نے صرف اظہار ہمدردی فرمایا۔ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری، تحصیل داری، نائب تحصیل داری سے لے کر انجمن حمایت اسلام میں کلرکی تک کے لیے درخواستیں لکھیں۔ ندیم کو ان درخواستوں سے جب فرصت ملتی، اپنی وادی میں گھومنے نکل جاتے۔ ندیم نے اس دوران اپنے آباؤاجداد کی بستی ''اسلام آباد'' کے آثار اور سکیسر کے چپے چپے کا مشاہدہ کیا۔ مختلف دل ونظر رکھنے والے لوگوں سے ملے۔ چرند، پرند، پھول، پتھر، کنکر، موسم، روپے، دُکھ، سکھ، غرض ہر چیز کا گہرا مشاہدہ کیا اور اسے اپنے ذہن میں محفوظ رکھا اور اس کا تجزیہ کیا۔ ان مشاہدات نے ندیم کی سماجی اور ادبی شخصیت کو نکھارا۔ ان دنوں ندیم شعر اور افسانے لکھتے رہے اور انہیں شائع بھی کراتے رہے۔ ناول لکھنے کی خواہش کی وجہ سے ندیم نے دو تین ناولوں کے پلاٹ تیار کیے لیکن غمِ روزگار نے انہیں ناول نہ لکھنے دیا۔

انگہ میں اِسی قیام کے دوران بیس برس کی عمر میں ندیم کو جذباتی لگاؤ بھی ہوا لیکن اس کی مدت مختصر اور اثر دیر تک رہا۔ اِس وقت اِن کا ذہن نرم اور خوش گوار مسکراہٹ میں کھو گیا۔ ان کی زندگی میں یہ محبت ایک ایسا کوندا ثابت ہوئی جس نے چمک کی بجائے اندھیروں کا سنہری عنوان کھول دیا۔ دکھ سکھ کے معیارات کا ندیم کو احساس ہوا۔ اس طرح ان کے دل میں محبت کا دریچہ وا ہوا اور اِس محبت کی تلخی بھی سامنے آئی۔ ندیم اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''۱۹۳۷ء کے اواخر میں یہ کوندا تاباں رہنے کی ایک دردناک اور مایوسانہ کوشش کے بعد بجھ کر رہ گیا اور میرے خیالوں کے گلابی کہرے میں ایسی سرمئی لہریں دوڑا گیا جن کا آغاز کوندے کا غروب تھا اور انجام ہنوز ناپید ہے۔'' ۲۱

ندیم کو معاشی اور اقتصادی مسائل کی وجہ سے اکیسویں برس میں محبت میں ناکامی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ ندیم محبت کے اس حادثے کے بعد دوبارہ لاہور چلے گئے اور ۱۹۳۹ء۔۱۹۳۷ء اکثر لاہور میں ہی رہائش پذیر

رہے۔ اس دوران اختر شیرانی اور حامد علی خان کے خلوص نے بھی ان کو متاثر کیا۔ ان کی شاعری اور افسانے کی ادبی رسائل میں باقاعدہ اشاعت نے انہیں ادبی حلقوں میں پہچان دے دی لیکن ان کی ادبی شخصیت اور ادبی زندگی میں عبدالمجید سالک نے گہرے اور اَن مٹ اثرات ڈالے۔

ندیم کا پہلا افسانہ ''بدنصیب بت تراش'' ۱۹۳۶ء میں اختر شیرانی کے رسالے ''رومان'' میں شائع ہوا۔ اس کے بعد کئی اور افسانے بھی اس رسالے میں شائع ہوئے۔ ان کے افسانے منٹو کو بھی بہت پسند آئے۔ سعادت حسن منٹو نے ندیم کا افسانہ ''بے گناہ'' پڑھ کر اختر شیرانی کو خط لکھا کہ وہ ندیم سے تعارف حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا پتہ ملنے پر منٹو نے اس افسانے کی تعریف میں ندیم کو جنوری ۱۹۳۷ء میں خط لکھا اور کہا:

> ''آپ کا افسانہ ''بے گناہ'' واقعتہً میں نے بے حد پسند کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس قسم کے جذبات میں ڈوبے ہوئے افسانے اُردو میں بہت کم شائع ہوئے ہیں۔ آپ کے ہاتھ Plastic ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ افسانے کے موضوع کو آپ نے نہ صرف محسوس کیا ہے بلکہ اس کو چھو کر بھی دیکھا ہے۔ یہ خصوصیت ہمارے ملک کے افسانہ نگاروں کو نصیب نہیں۔ میں آپ کو مبارک باد دینا چاہتا ہوں کہ آپ میں یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود ہے۔'' ۲۲

ندیم نے چند دن دارالاشاعت پنجاب کے ہفت روزہ ''تہذیبِ نسواں'' کے لیے غیر ملکی کہانیوں کے تراجم بھی کیے۔ انہی دنوں ایک ہندو بزرگ آنحضورؐ کی حیاتِ طیبہ لکھنا چاہتا تھا لیکن اُس کی خواہش تھی کہ اُسے کوئی مسلمان لکھے۔ یہ بزرگ دیال سنگھ لائبریری کے ٹرسٹیز میں شامل تھے۔ عبدالمجید سالکؔ نے ندیم کا نام تجویز کیا۔ ان دنوں ندیم نے آنحضورؐ کی حیاتِ طیبہ پر تقریباً ساٹھ کتابیں پڑھیں اور ۵۰۰ صفحات کی کتاب لکھ کر ہندو بزرگ کو دے دی۔ اِس کتاب کا معاوضہ پچھتر روپے مقرر ہوا لیکن اُس نے کام سے خوش ہو کر نوے روپے دیے۔

ٹیلی فون آپریٹر کے لیے ندیم نے امتحان بھی دیا جس میں کامیابی پر اُنھوں نے اوکاڑہ منڈی میں ٹیلی فون آپریٹر کی نوکری بھی کی لیکن نو دن کے بعد ندیم اس ملازمت کو چھوڑ کر بھاگ آئے۔

۱۹۳۹ء میں ندیم اپنے پھوپھی زاد بھائی کیپٹن ملک امیر حیدر خان کی کوششوں سے محکمہ آب کاری میں سب انسپکٹر بھرتی ہو گئے۔ ۳/ جولائی ۱۹۳۹ء کو ندیم نے ملتان کے دفتر آب کاری میں کام کرنا شروع کیا۔ ان کے نام

کرشن چندر اور جوش ملیح آبادی نے پیغام بھی بھیجے۔

کرشن چندر نے پیغام بھیجا:

''بے کاری سے آب کاری بھلی۔۔۔''

جوش ملیح آبادی نے تحریر فرمایا:

''جناب قبلہ و کعبہ کی آب کاری ہے۔۔۔

شراب جو نہ پیئے آج کل وہ ناری ہے۔'' ۲۳

ندیم ملتان اور خانیوال میں چرس، افیون، شراب اور بھنگ کے کیس پکڑتا لیکن یہ ان کے مزاج کا کام نہ تھا۔ اُنھوں نے عبدالمجید سالک اور اپنے بھائی پیرزادہ محمد بخش سے ملازمت چھوڑنے کی اجازت چاہی۔ اُنھوں نے بھائی کو اس حوالے سے جو خط لکھا، اس کا ذکر پیرزادہ محمد بخش یوں کرتے ہیں:

''مجھے اس دوزخ سے نکالیے اور مجھے مستعفی ہونے کی اجازت دیجیے۔ آج میرے انسپکٹر صاحب نے اپنے کمرے سے مجھے آواز دی۔ میں مصروف تھا، سُن نہ سکا۔ اُنھوں نے جلتے ہوئے سگریٹ کا ٹرا انگوٹھے پر چڑھا کر میری طرف پھینکا جو میرے گال پر لگا۔ پلٹ کر میں نے پوچھا کہ یہ حرکت کس نے کی ہے؟ انسپکٹر صاحب نے جواب دیا۔ میرے پکارنے پر آپ نے کوئی جواب نہ دیا، اس لیے میں نے آپ پر سگریٹ پھینکا کہ شاید آپ اس طرح متوجہ ہو سکیں۔ میں نے سامنے پڑے ہوئے قلم دان میں سے ایک دوات اُٹھا کر یہ کہتے ہوئے، انسپکٹر صاحب کے سینے پر دے ماری کہ جواب عرض ہے۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ انسپکٹر صاحب اپنی آلودہ شیروانی کے ساتھ ایکسائز آفیسر کے ہاں پہنچے۔ مجھے بلایا گیا اور میں نے ساری صورتِ حال بتا کر عرض کیا کہ میں آئندہ بھی ایسی پکار کا یہی جواب دوں گا۔ ایکسائز آفیسر معقول آدمی ہے۔ اس نے انسپکٹر صاحب کو خاصا ڈانٹا مگر اب میں اس ملازمت میں نہیں رہنا چاہتا۔ میرے لیے سالک صاحب نے لاہور میں ہفت روزہ ''پھول'' اور ہفت روزہ ''تہذیبِ نسواں'' کی ادارت کا بندوبست بھی کر لیا ہے۔ بس آپ کی اجازت کا منتظر ہوں۔'' ۲۴

پیرزادہ محمد بخش نے انہیں فوراً اجازت دے دی اور ندیم ملازمت چھوڑ کر لاہور آ گئے۔ ندیم اس ملازمت

کو چھوڑنے کے بعد بہت خوش تھے اور اسے اپنی زندگی کا زریں ترین دن کہتے تھے۔ امتیاز علی تاج کو اپنے رسالے ''پھول'' کے لیے اچھے مدیر کی ضرورت تھی۔ ۲۵ر ستمبر ۱۹۴۲ء کو عبدالمجید سالک کی تجویز پر ندیم دو ہفت روزہ رسالوں ''پھول'' (بچوں کا رسالہ) اور ''تہذیبِ نسواں'' (خواتین کا رسالہ) کا مدیر بنا دیا گیا۔ اس طرح اُنھوں نے دارالاشاعت پنجاب (لاہور) میں بحیثیت ایڈیٹر کام کرنا شروع کیا۔ سالک بھی ندیم کی دل جوئی کے لیے اُن سے ملنے وہاں آجاتے۔ ''پھول'' میں ندیم نے بہت سی نظمیں لکھیں۔ سالک کے کہنے پر ندیم نے اپنی افسانوں کی پہلی کتاب ''چوپال'' دارالاشاعت پنجاب کے مطبع سے شائع کرائی۔ ندیم کو اپنی پسند کا کام مل گیا تھا۔ اس لیے اُنھوں نے دن رات محنت اور لگن سے کام کیا۔

۱۹۴۳ء میں ندیم نے ''ادبِ لطیف'' (لاہور) جو کہ مشہور ترقی پسند رسالہ تھا، اِس کی ادارت بھی سنبھالی لیکن مسلسل محنت اور آرام نہ کر سکنے کی وجہ سے بیمار ہو گئے۔ اِس حوالے سے بقول ہاجرہ مسرور:

> ''دو ہفت روزے اور ایک ماہنامہ مرتب کرنے کے علاوہ اُنھوں نے جی بھر کر نظمیں، غزلیں، قطعات اور افسانے لکھے۔ اِسی زمانے میں راجہ مہدی علی خان نے ندیم بھیا کی بسیار نویسی پر لطیفے گھڑے تھے۔ وہ دن رات محنت کرتے اور کم سے کم آرام کرتے۔ اس کا نتیجہ نروس بریک ڈاؤن کی صورت میں نکلا۔'' ۲۵

''ادبِ لطیف'' کے سالنامہ ۱۹۴۴ء میں منٹو کی ایک کہانی اور مضمون چھاپے پر منٹو اور ندیم کے خلاف مقدمہ چلا اور حکومتِ پنجاب نے ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت انہیں گرفتار کر لیا۔ یہ مقدمہ ایک سال چلتا رہا۔ مئی ۱۹۴۵ء میں اس مقدمہ سے بری ہو گئے۔ فروری ۱۹۴۶ء میں ندیم نے ''ادبِ لطیف'' کی ادارت بھی چھوڑ دی۔

۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء کے درمیان ندیم کو پڑھی لکھی، سلجھی ہوئی، سمجھ دار اور اچھی فیملی سے تعلق رکھنے والی ہم ذوق لڑکی سے محبت ہوئی لیکن مادی و طبقاتی تفاوت کی وجہ سے منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی اِن سے چھین لی گئی لیکن ندیم نے کبھی کسی سے اپنی محبوبہ کا ذکر نہ کیا اور نہ ہی اس کا نام بتایا۔ جب ندیم سے خالد سہیل نے پوچھا:

> ''قاسمی صاحب آپ نے اپنی اصلی محبوبہ کا نام پوشیدہ کیوں رکھا؟ تو ندیم صاحب نے جواب دیا: پاکستان میں محبوبہ کا نام نہیں بتایا جاتا۔۔۔ ویسے میں یہ کہہ دوں کہ جو شخص

محبت نہیں کر سکتا وہ شعر بھی نہیں کہہ سکتا۔ سو، محبت میں نے کی ہے لیکن آپ کو اس کی
تفصیل نہیں بتا سکتا۔" ۲۶

محبت میں ناکامی اور بیماری کی وجہ سے ندیمؔ اپنے بھائی اور بھانجے کے ہمراہ گاؤں انگہ واپس چلے گئے۔ مقدمہ کا الجھاؤ، سخت محنت اور محبت میں ناکامی نے ان کی صحت پر بُرا اثر ڈالا۔ ان دنوں بیماری کی وجہ سے ندیمؔ کمزور ہو گئے تھے اور ان کے ذہن پر جو بوجھ تھا، اُس کا ذکر اُنھوں نے کسی سے نہیں کیا۔ اِن کٹھن حالات میں ندیمؔ اس قسم کے شعر کہنے لگے:

جہاں پناہ مجھے بازوؤں میں لے لیجیے
مری تلاش میں ہیں گردشیں زمانے کی ۲۷

ماں کی توجہ اور انگہ کی آب و ہوا سے آہستہ آہستہ ندیمؔ کی صحت بہتر ہونے لگی۔ ۱۹۴۵ء میں جب یہ مکمل طور پر صحت یاب ہو گئے تو اِن کے اِردگرد تحریکِ پاکستان زوروں پر تھی۔ تب ندیمؔ نے اپنی توجہ اِس کے لیے وقف کر دی۔ امیر حسین اِن کی اِس جدوجہد کے متعلق لکھتے ہیں:

"۔۔۔۱۹۴۶ء میں "ادبِ لطیف" کی ادارت سے بھی سبک دوشی کے بعد مسلم لیگ کے
پلیٹ فارم سے تحریکِ پاکستان کے لیے عملی جدوجہد کا آغاز کیا۔" ۲۸

ندیمؔ جو کہ اسلام دوستی کا قائل تھا اور قائداعظم کی اِس تحریکِ پاکستان کے نظریات سے متفق تھا۔ ندیمؔ اب مسلم لیگ کا سبز جھنڈا لیے اِس میدان میں کود پڑا۔ اب اسے نہ تو ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کا ڈر تھا اور نہ ہی خاندان کے بزرگوں کی ناراضی کا۔ اسے اب کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ اس نے اس کا آغاز اپنے گاؤں کے نوجوانوں سے کیا اور انہیں ساتھ لے کر وادیٔ سون سکیسر کے گاؤں گاؤں گھومنے لگے۔ اسی طرح ندیمؔ اس تحریک کے لیڈر بن گئے۔ اُنھوں نے نہ صرف جلسے جلوس نکالے بلکہ نظمیں، ترانے اور اپنی علاقائی بولی میں ٹپے بھی لکھے۔ اِس طرح ندیمؔ نے اپنے فن کو وطن کی آزادی کے لیے مؤثر طور پر استعمال کیا۔ اپنے جلسے، جلسوں میں اِس زمانے کے نامور سیاسی لیڈروں کو بلوایا۔ اِن لیڈروں کے استقبال میں ایک اتنا بڑا جلوس نکلا کہ دیہاتی علاقوں میں اِس کی مثال نہیں ملتی اور یہ سب ندیمؔ کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ اِن دنوں حمید نظامی نے اِن کو "نوائے وقت" کے ادارے میں شامل ہونے کی پیش کش کی مگر اُنھوں نے معذرت کر لی لیکن لاہور کے اخباروں کو اِس علاقے کی سرگرمیوں سے آگاہ رکھا۔ اِسی دوران سجاد سرور نیازی جو کہ پشاور ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر تھے اور ندیمؔ کے گھرانے سے اُن کے خاندانی تعلقات

تھے۔ اِن کو پشاور بلوا بھیجا۔ ندیم واپس لاہور جانا چاہتے تھے لیکن اپنے بھائی کے سمجھانے پر مان گئے اور ۱۹۴۶ء کے اواخر میں نیازی صاحب کے پاس چلے گئے۔ وہاں اُنھوں نے ۱۹۴۸ء تک بحیثیت مسودہ نویس (سکرپٹ رائٹر) کام کیا۔

ندیم پشاور میں ہی تھے کہ اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان بن گیا۔ ندیم کہتے ہیں:

''اسی دوران جب پاکستان بنا تو ریڈیو پاکستان پشاور سے پہلا قومی نغمہ میرا لکھا ہوا نشر ہوا جسے معروف گلوکارہ ناہید نیازی کے والد سجاد سرور نیازی نے گایا تھا۔'' [۲۹]

ریڈیو سے وابستہ خاطر غزنوی نے کہا:

''۱۴راگست ۱۹۴۷ء کو پشاور ریڈیو اسٹیشن سے جو سب سے پہلے تین ترانے نشر ہوئے۔ وہ احمد ندیم قاسمی کے تھے، جس میں سے ایک ''پاکستان بنانے والے، پاکستان مبارک ہو'' بھی تھا۔'' [۳۰]

ندیم اپنے ایک مضمون ''چند یادیں'' میں بتاتے ہیں کہ:

''میں پشاور ریڈیو اسٹیشن میں پاکستانی نغمے لکھ رہا تھا۔ جب ایک پروگرام اسسٹنٹ نے ریڈیو اسٹیشن کی چھت پر چڑھ کر اپنے ریوالور سے ہوا میں فائر کیے اور اسٹیشن ڈائریکٹر نے سبز جھنڈا کھول دیا۔ یہ ۱۳راگست ۱۹۴۷ء کی تاریخ تھی اور اس وقت رات کے بارہ بجے تھے۔ دنوں تک میں سرشاری کے عالم میں رہا اور پھر ایک دن ریڈیو اسٹیشن سے واپس آتے ہوئے میں نے سڑک پر ہندوؤں اور سکھوں کی لاشیں دیکھیں۔۔۔ اور پھر جب پشاور شہر میں ہندوؤں کے محلے کو آگ لگا دی گئی تو میں صدر پشاور میں حواس باختہ بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا تھا۔ تب ایک دوست کی ننھی سی لڑکی میرے پاس بھاگی آئی، مجھ سے چمٹ گئی اور روتے ہوئے بولی: ''چچا جان! دیکھیے، آسمان جل رہا ہے۔'' [۳۱]

ندیم ملک کی اس صورتِ حال سے بہت پریشان تھے۔ اِن کی خواہش تھی کہ رہنماؤں کو ان کے وعدے یاد دلاؤں لیکن ندیم نے اِن امور میں اپنے قلم کی نوک کو مڑا ہوا پایا تو پشاور سے بھاگ کر لاہور آ گیا اور ۱۹۴۸ء۔۱۹۴۷ء رسالہ ''سویرا'' لاہور کے ابتدائی چار شماروں کے ایڈیٹر رہے۔ پشاور سے لاہور آنے کی ایک اور وجہ ان کی منہ بولی بہنیں ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور بھی تھیں۔ جو کہ لکھنؤ سے لاہور آ گئیں تھیں۔ لاہور آ کر ندیم نے محمد طفیل اور ہاجرہ مسرور کے تعاون سے رسالہ ''نقوش'' (۱۹۵۰ء۔۱۹۴۸ء) کا اجرا کیا۔ ندیم جو کہ ترقی پسند نظریات

رکھتے تھے اِس کی وجہ سے محمد طفیل گھبرا گئے اور اِن کے ساتھ چلنے سے معذرت کر لی۔ ''نقوش'' کے ابتدائی دس شمارے شائع ہونے کے بعد رسالہ اِن کے حوالے کر دیا اور خود بے روزگار ہو گئے۔

ندیم کی منگنی کئی برس پہلے اپنے قریبی عزیزوں میں ہو چکی تھی جو کہ وادیٔ سون سکیسر کے گاؤں سور کی کے رہنے والے تھے لیکن ندیم بہتر روزگار اور اچھے سے چھوٹے سے گھر کے حصول کے بعد بیاہ کرنا چاہتے تھے لیکن والدہ اور بھائی کے کہنے پر راضی ہو گئے۔ ۴/جولائی ۱۹۴۸ء کو رشتہ ازدواج میں بندھ گئے اور رابعہ اِن کی شریکِ حیات بن گئی۔ رابعہ عمر میں ندیم سے تیرہ برس چھوٹی (پیدائش: ۱۹۳۰ء۔ وفات: ۱۹۹۲ء) خوب صورت لڑکی تھی۔ گاؤں میں کوئی سہولت نہ ہونے کی وجہ سے تعلیم حاصل نہ کر سکیں۔ اپنے منگیتر کے شعر و افسانے والے رسالے ہی اُن کا سرمایہ تھا۔ اِن کا ارادہ شادی کے بعد تعلیم حاصل کرنے کا تھا لیکن اُنہیں شادی کے بعد بھی گاؤں میں ندیم کی والدہ کے ساتھ رہنا پڑا۔ سال میں چند ہی دنوں کے بعد ندیم انگہ آتے یا رابعہ لاہور چلی آتی۔ ۱۹۶۲ء میں رابعہ مستقل طور پر رہنے لاہور آ گئیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے بے حد مخلص تھے۔ اگر چہ کچھ باتوں پر اختلاف کے باوجود مشکلات کا مقابلہ کیا۔ رابعہ اور ندیم تین بچوں کے والدین تھے۔ ان کی اولاد میں دو بیٹیاں ناہید قاسمی (۱۹۴۹ء)، نشاط ندیم (۱۹۹۵ء۔۱۹۵۱ء) اور ایک بیٹا نعمان ندیم قاسمی (۱۹۵۶ء) ہے۔ دونوں نے مل جل کر بچوں کی اچھی تربیت کی، کفایت شاعری سے کام لے کر گھر بھی تعمیر کرایا۔ تینوں بچوں کی شادیاں کیں۔ پوتا پوتیاں، نواسے اور نواسیاں دیکھیں۔ ۱۹۸۷ء میں ندیم نے رابعہ کے ساتھ حج کی سعادت بھی حاصل کی۔

ندیم انجمن ترقی پسند مصنفین سے ۱۹۴۴ء میں وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۴۹ء میں کل پاکستان کانفرنس میں ندیم انجمن ترقی پسند مصنفین پنجاب کے سیکرٹری جنرل بنائے گئے اور ۱۹۵۲ء میں اُنہیں جنرل سیکرٹری انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان منتخب کیا گیا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اِن کی زندگی اور فن پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ اگر چہ ندیم مذہب بے زاری سے بہت دُور تھے اور اِن کے عقیدے اور نظریے میں تضاد نہیں تھا۔ بقول رؤف نیازی:

''ایمانیات کے مسئلے کو خدا اور بندے کے درمیان ہی رہنے دیا جانا چاہیے۔'' ۳۲

اُنھوں نے ہمیشہ سچ بولا اور نہایت جرأت اور بے باکی سے بات کی لیکن اُن کو ملحد اور مذہب بے زار کہا گیا۔

امجد رؤف خان کو انٹرویو دیتے ہوئے ندیمؔ نے کہا:

''الحمد اللہ! میں ایک مسلمان ہوں۔ میں نے پیروں کے خاندان میں آنکھ کھولی۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہوں۔ حضرت محمد ﷺ کو خاتم النبین مانتا ہوں۔ مذہب کو ایک قوت، محبت کی روشنی سمجھتا ہوں۔'' ۴۳

ندیمؔ کے اِس تحریک میں شامل ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اُنھوں نے جاگیرداروں، زمین داروں، پیروں فقیروں کے مظالم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اِس لیے اِس صورتِ حال کے خلاف تھے لیکن اس کی وجہ سے اِن کو کافر اور ملحد کہا گیا۔ اِن کے ایک ہی وقت میں کٹر مذہبی اور پکے ترقی پسند ہونے سے لوگ تذبذب سے دو چار ہو جاتے تو ندیمؔ نے اس کا جواب دیا اور لکھتے ہیں:

''میں ''کٹر مذہبی'' تو کسی صورت نہیں ہوں۔ میں تو بڑا فراخ دل مسلمان ہوں اور ہر اُس نیک آدمی کو دل سے لگانے کو تیار ہوں جو چاہے کسی دوسرے مذہب سے تعلق رکھتا ہو مگر عملاً نیک ہو۔ ''پکا ترقی پسند'' یقیناً ہوں۔ میرا مذہب، میری ترقی پسندی میں کسی طرف سے مزاحم نہیں ہے بلکہ میں تو کہتا ہوں، خود اسلام بے حد ترقی پسند مذہب ہے جس نے گورے، کالے، عربی، عجمی، امیر غریب اور بڑے چھوٹے کی تفریق ہی سرے سے ختم کر ڈالی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آج کا مسلمان بیشتر محض برائے نام مسلمان ہے___

میرا ایک شعر ہے:

بھیک مانگے کوئی انساں تو میں چیخ اُٹھتا ہوں
بس یہ خامی ہے میرے طرزِ مسلمانی میں

اس صورتِ حال میں میری مذہبیت اور میری ترقی پسندی کے ضمن میں احباب کا تذبذب اور گومگو میں مبتلا ہونا میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا ترقی پسندی کے لیے کافری ضروری ہے؟ کیا ترقی پسند کہلوانے کے لیے کمیونسٹ ہونا ضروری ہے؟ یقیناً نہیں۔ پھر یہ تذبذب چہ معنی ندارد۔'' ۴۴

ندیمؔ نے زندگی کے حقائق کو شعروں کا جامہ پہنایا اور سامراجی تشدد کے خلاف عمر بھر سرگرم عمل رہے۔ مساوات، عدل اور عالمی امن کے قیام کی خواہش میں ہی زندگی بسر کی۔ ندیمؔ انجمن ترقی پسند مصنفین ہونے کی وجہ

سے دو بار جیل گئے۔ پہلی بار مئی ۱۹۵۱ء تا نومبر ۱۹۵۱ء سیفٹی ایکٹ کے تحت، نواب زادہ لیاقت علی خان کے دور میں گرفتار ہوئے اور سنٹرل جیل لاہور میں بند کر دیئے گئے۔ دوسری بار ایوب خان کے دور میں اکتوبر ۱۹۵۸ء تا فروری ۱۹۵۹ء جیل میں رہے۔ جیل میں قیام کے دوران ندیم نے بہت سی مشکلات کا سامنا کیا۔ بے روزگاری کا بھی سامنا کرنا پڑا لیکن حق کے سامنے ڈٹے رہے۔ ۱۹۵۸ء میں قید کے دوران ان کے عزیزوں نے اِن کی ماں کی طرف سے معافی نامہ تیار کرایا تاکہ ندیم کو رہائی دلائی جا سکے۔ ان کی والدہ جو کہ خوددار خاتون تھیں۔ جب انگوٹھا لگوانے کے لیے اِن کے پاس گئے تو اُنھوں نے پوچھا کہ کیا لکھا ہے، جب اُنہیں معافی نامہ کا بتایا گیا تو اُنھوں نے انگوٹھا لگانے سے انکار کر دیا اور کہا:

''میرے بیٹے نے کبھی کوئی ایسا غلط کام نہیں کیا جس پر اسے یا مجھے معافی مانگنی پڑے۔'' ۳۵

۱۹۵۰ء میں ندیم ماہنامہ ''سحر'' جو کہ لاہور سے شائع ہوتا تھا کہ ایڈیٹر بنے لیکن اس کا صرف ایک شمارہ نکالا اور مارچ ۱۹۵۳ء میں ''امروز'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اُنھوں نے چھے ماہ اِس روزنامہ کی ادارت کی لیکن ۱۹۵۸ء میں جب ایوب خان نے پاکستان میں مارشل لا نافذ کر دیا تو ندیم ایک بار پھر بحیثیت ایڈیٹر ''امروز'' گرفتار ہوئے۔ لاہور اور راول پنڈی جیل کے علاوہ لاہور کے شاہی قلعے میں بھی قید رہے۔ اِس طرح ندیم نے اپنی قید کے سو(۱۰۰) دن پورے کیے۔ فروری ۱۹۵۹ء کو ندیم رہا ہوئے تو کچھ روز بعد ''امروز'' کی ادارت سنبھال لی۔ مارچ ۱۹۵۹ء میں پروگریسو پیپرز لمیٹڈ پر فوج اور پولیس نے قبضہ کر لیا۔ ایوب خان نے قدرت اللہ شہاب کے ذریعے ''امروز''، ''پاکستان ٹائمز'' اور ''لیل و نہار'' پر قبضہ کر لیا۔ ندیم نے اِس صورتِ حال میں احتجاجاً ''امروز'' کی ادارت سے استعفیٰ دے دیا۔ قدرت اللہ شہاب لکھتے ہیں:

''روزنامہ ''امروز'' کے مدیر احمد ندیم قاسمی تھے۔ میرے ذمے یہ ڈیوٹی لگی کہ میں اُن کو ''امروز'' کی ادارت پر فائز رہنے کی درخواست کروں۔ میں قاسمی صاحب کی خدمت میں یہ گزارش لے کر حاضر ہوا لیکن وہ نہ مانے۔'' ۳۶

ندیم نے ۱۹۶۳ء میں اپنے ذاتی رسالے ''فنون'' کا اجرا کیا اور اِس کے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھا۔ جس کی وجہ سے اِسے پسندیدہ مقام و مرتبہ حاصل تھا۔ ندیم نے انتقال تک اِس کے ۱۲۶ شمارے ترتیب دیے جب کہ اس کا ۱۲۷ واں

شمارہ مرتب کر رہے تھے۔

ندیمؔ نے اپنی زندگی میں اعلیٰ پایے کے فکاہی کالم بھی لکھے۔ ۱۹۵۲ء کے آخر میں ''امروز'' میں کالم نویسی کی۔ اِن کے فکاہیہ کالم ''حرف و حکایت'' کے نام سے شائع ہوئے۔ ۱۹۵۸ء۔۱۹۵۳ء روزنامہ ''امروز'' میں ''پنج دریا'' کے نام سے فکاہی کالم نویسی کی۔ ۱۹۵۹ء میں روزنامہ ''ہلالِ پاکستان'' میں ''موج در موج'' اور ''پنج دریا'' کے نام سے فکاہی کالم نویسی کی اور ۱۹۶۰ء میں روزنامہ ''احسان'' لاہور میں ''مطائبات'' کے نام سے کالم لکھے۔ ۱۹۷۲ء۔۱۹۶۴ء میں روزنامہ ''امروز'' کی ملکیت سرکاری سے نیم سرکاری ہوگئی تو ندیمؔ نے دوبارہ کالم لکھنا شروع کر دیے اور اِس بار ''عنقا'' کے نام سے لکھے۔ اِس کے ساتھ ہی ادبی اور تنقیدی مضامین ''تہذیب وفن'' کے عنوان سے تحریر کیے۔ ۱۹۶۸ء میں ندیمؔ نے روزنامہ ''جنگ'' کراچی سے ہفتہ وار کالم ''لاہور لاہور ہے'' کے عنوان سے لکھنا شروع کیے۔ اس کی نوعیت تہذیبی، ثقافتی اور سماجی تھی اور روزنامہ ''حریت'' کراچی سے اُنھوں نے روزانہ فکاہی کالم ''موج در موج'' کے عنوان سے اور ہفتہ وار کالم ''لاہوریات'' کے عنوان سے لکھے۔ ۱۹۷۲ء میں ندیمؔ دوبارہ روزنامہ ''جنگ'' لاہور سے منسلک ہو گئے اور ''رواں دواں'' کے نام سے کالم لکھنے لگے۔ اِن میں معاشرے کے زوال اور وطن سے محبت پر تبصرہ کیا جاتا تھا۔ ندیمؔ نے یہ کالم ۲۰۰۶ء تک لکھے۔ ان کا آخری کالم ان کی وفات سے پانچ روز پہلے شائع ہوا۔

ندیمؔ کے روزنامہ ''جنگ'' میں کالم لکھنے کے حوالے سے پروفیسر ڈاکٹر عبدالغفار کوکب لکھتے ہیں:

> ''عمر کے آخری عرصے میں ندیمؔ قاسمی صاحب ''رواں دواں'' کے عنوان سے روزنامہ ''جنگ'' میں کالم لکھ رہے تھے۔ اپنے مخصوص اسلوب اور مزاج کے برعکس اِن کے یہ کالم گہرے اندازِ فکر کے حامل تھے۔ اِن میں ہمیں سنجیدگی اور متانت کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ اِن کالموں میں ہمیں وہ شوخ و شنگ پیرزادہ احمد شاہ ندیمؔ کی بجائے وہ حساس شاعر اور افسانہ نگار احمد ندیمؔ قاسمی نظر آتا ہے جو اپنے وطن کے سادہ لوح عوام کے مسائل پر کڑھتا ہے، اظہار کرتا ہے۔'' ۳۷

ندیمؔ نے مختلف شاعروں اور ادیبوں پر تنقیدی مضامین بھی لکھے۔ ان کی تنقید کی پہلی کتاب ''ادب اور تعلیم کے رشتے'' ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئی۔ اِس کے علاوہ ''تہذیب وفن'' ۱۹۷۵ء، ''اقبال۔ایک محاکمہ'' ۱۹۷۷ء، ''پس الفاظ''

۲۰۰۳ء اور ''معنی کی تلاش'' ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئی۔ تنقید کے ساتھ اِن کے دل چسپ شخصی و سوانحی خاکہ نگاری کے دو مجموعے ''میرے ہم سفر'' ۲۰۰۲ء اور ''میرے ہم قدم'' ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئے۔

ندیم نے ''انگڑائیاں''، ''نقوش لطیف''، ''کیسر کیاری (منتخب طبع زاد اور ماخوذ تحریروں کا مجموعہ)'' ۱۹۴۴ء، ''کیسر کیاری (ندیم کے فکاہی کالم)'' ۱۹۹۹ء، ''منٹو کے خطوط بنام ندیم'' ۱۹۶۶ء، ''پاکستان کی لوک کہانیاں (ترجمہ)'' ۱۹۷۲ء اور ''نذر حمید اللہ خان'' ۱۹۷۷ء کی ترتیب و تدوین کی اور بچوں کا ادب ''آسمان کے گوشے میں (کھیل)'' ۱۹۴۳ء، ''دوستوں کی کہانیاں'' ۱۹۴۳ء، ''نئی نویلی کہانیاں'' ۱۹۴۴ء اور ''باغ کے گوشے میں'' ۱۹۴۴ء تخلیق کیا۔

ندیم کی تخلیقی شخصیت متنوع رنگ تھی۔ اُنھوں نے افسانہ نگاری اور شاعری میں نئی سمتوں کی نشان دہی کی ہے۔ اِن کے افسانوں کے ۱۸ مجموعے ''چوپال''، ''بگولے''، ''طلوع و غروب''، ''گرداب''، ''سیلاب''، ''آنچل''، ''آبلے''، ''آس پاس''، ''در و دیوار''، ''سناٹا''، ''بازارِ حیات''، ''برگ حنا''، ''سیلاب و گرداب''، ''گھر سے گھر تک''، ''کپاس کا پھول''، ''نیلا پتھر''، ''کوہ پیما'' اور ''پت جھڑ'' شائع ہوئے۔ اِن کی شاعری کے ۱۲ مجموعے شائع ہوئے جن میں ''دھڑکنیں''، ''رم جھم''، ''جلال و جمال''، ''شعلۂ گل''، ''دشتِ وفا''، ''محیط''، ''دوام''، ''لوحِ خاک''، ''جمال''، ''بسیط''، ''ارض و سما'' اور ''انوارِ جمال'' شامل ہیں۔

ندیم فلمی دنیا سے بھی وابستہ رہے۔ اُنھوں نے ۱۹۴۷ء میں مکمل ہونے والی فلم ''ادھورے خواب'' کے لیے نغمہ: ''چاہنے والوں کو ملتے نہیں خوشی ہو یا غم'' لکھا لیکن یہ فلم ریلیز نہ ہوسکی۔ اِسی دور میں ندیم کا نام فلم ''دھرم پتنی'' اور فلم ''بنجارہ'' میں بطور کہانی نگار و مکالمہ نگار ملتا ہے، لیکن یہ فلمیں مکمل نہ ہوسکیں۔ ۱۹۵۳ء میں ریلیز ہونے والی فلم ''آغوش'' کے مکالمے سعادت حسن منٹو اور ندیم نے مل کر لکھے۔ اُنھوں نے فلم ''دو راستے'' کے مکالمے لکھے۔ یہ فلم یکم اکتوبر ۱۹۶۱ء کو نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ فلم ''لوری'' کے مکالمے لکھے جس پر انھیں بہترین مکالمہ نگار کا ''نگار ایوارڈ'' دیا گیا۔ اِس فلم کی نمائش ۱۹۶۶ء میں ہوئی۔ ۱۹۷۰ء میں فلم ''درندہ'' کے لیے ندیم نے گیت لکھے جنھیں مہدی حسن، علی بخش ظہور اور نذیر بیگم نے گایا۔ پنجابی فلم ''خوفناک'' کے لیے صفدر حسین کی موسیقی میں ندیم کا گیت ریکارڈ ہوا اور اُنھوں نے فلم ''ہزار سال'' کے گیت بھی لکھے۔ اُن کے افسانہ ''گنڈاسا'' کی تھیم پر

۱۹۷۵ء میں پنجابی فلم ''وحشی جٹ'' بنائی گئی۔ اس فلم پر ندیم کو بہترین کہانی نویس کا ایوارڈ دیا گیا۔ اِسی طرح ۱۹۷۸ء میں بننے والی فلم ''نذرانہ'' کی کہانی بھی اِن کے افسانے ''فیشن'' پر رکھی گئی اور فلم ''کرتار سنگھ'' اِن کے مقبول افسانے ''پرمیشر سنگھ'' پر بنائی گئی۔ ان کے تخلیق کردہ کرداروں کو ادا کرنے کے حوالے سے سہیل احمد (اداکار) کہتے ہیں:

> ''احمد ندیم قاسمی کے تخلیق کردہ کرداروں کو ادا کرنے کی کوشش کرنا ایک اعزاز ہے۔
> ''پرمیشر سنگھ'' کے لیے ٹائٹل رول کرنے پر احمد ندیم قاسمی مجھ سے بہت خوش تھے۔
> اداکار منور سعید نے ''گنڈاسا'' میں مولا کا کردار ادا کرنے ۔۔۔ کو اپنے لیے اعزاز کہا اور قاسمی صاحب کو خراجِ تحسین پیش کیا۔'' ۳۸؎

ندیم شاعری، افسانہ نگاری، صحافت اور کالم، خاکہ نگاری، تنقید نگاری کے ساتھ ساتھ جس خوب صورتی سے فلموں کے گیت اور سکرین پلے کا سکرپٹ لکھتے تھے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ جس طرح فلمی رواج کے متعلق سکرین پلے لکھا، اُس کی خوب صورتی کے متعلق ناہید قاسمی لکھتی ہیں:

> ''آج سے تقریباً پینتیس چالیس برس قبل فلموں کے حوالے سے آغا گل صاحب سے اباجی کی کچھ نشستیں (قتیل شفائی صاحب کی موجودگی میں) گھر پر بھی رہی تھیں اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ تین چار کہانیاں ڈسکس بھی ہوئی تھیں۔ آغا گل سے طے شدہ کہانی کے مطابق لکھا۔ قاسمی صاحب کے سکرین پلے کا ایک سکرپٹ، اِن کے پرانے کاغذات میں رکھا ملا۔ جب تسلیم احمد تصور صاحب نے اپنے رسالے کے لیے ندیم صاحب کی کوئی ایسی تحریر دینے کو کہا، جو ابھی کہیں شائع نہ ہوئی ہو تو میں نے اس سکرین پلے کا ذکر کیا۔ ان کے کہنے پر ندیم صاحب کے اپنے ہاتھ سے تحریر کیے گئے اس سکرین پلے کے مکمل مسودے کا فوٹو پرنٹ انہیں بھجوا دیا۔ تصور صاحب کا کہنا تھا کہ یہ سکرین پلے احمد ندیم قاسمی کے تخلیقی کاموں کی ایک مختلف جہت کو سامنے لائے گا۔ یہ اس زمانے کے فلمی رواج، فیشن اور پسند کے مطابق سادہ سی فلمی کہانی کا سکرین پلے ہے لیکن ندیم صاحب نے اسے خوب صورت انداز میں لکھا ہے۔'' ۳۹؎

پاکستان کے علاوہ بیرونِ ملک کے ٹی۔ وی چینلز نے ندیم کے کئی افسانوں کو ڈرامائی تشکیل دی اور دنیا کے کئی ممالک اور زبانوں مثلاً ترکی، چینی، روسی، جاپانی، ہندی اور انگریزی میں ندیم کے فن پاروں کے تراجم شائع ہوئے ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں جب پروفیسر حمید احمد خان کا انتقال ہوا تو مجلسِ ترقیٔ ادب کی نظامت کی اسامی خالی ہوگئی۔

اِن دنوں پروفیسر فتح محمد ملک اُس کے عارضی پریس ایڈوائزر تھے۔ اِن کی تجویز پر ندیم کا نام اِس ادارے کے لیے منتخب ہوا اور ۱۹۷۴ء میں ندیم مجلس ترقیِ ادب لاہور کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ ان کی ملازمت میں ہر تین سال بعد توسیع ہو جاتی تھی۔ اِن کے دورِ نظامت میں دو سو سے زائد کتابیں اِس ادارے سے شائع ہوئیں۔ ندیم اِس عہدے پر ۲۰۰۶ء تک فائز رہے۔ ۲۰۰۶ء۔۱۹۷۴ء میں ندیم تحقیقی و تنقیدی ادبی رسالہ ''صحیفہ'' لاہور کے مدیر رہے۔ ۱۹۸۷ء۔۱۹۷۷ء میں ندیم ''بزمِ اقبال'' کے اعزازی سیکرٹری بنے اور ۱۹۸۸ء۔۱۹۷۷ء رسالہ ''اقبال'' لاہور کے اعزازی مدیر مقرر ہوئے۔

ندیم نے کئی ملک کے سفر بھی کیے جن میں انگلستان، چین، سکاٹ لینڈ، ناروے، جرمنی، بھارت، امریکا، کینیڈا، متحدہ عرب امارات، سعودی عرب اور سنگاپور وغیرہ شامل ہیں۔

ندیم کو بہت سے اعزازات سے بھی نوازا گیا جو اُن کی زندگی کے ماتھے پر جھومر کی طرح سجے ہیں۔ ۱۹۳۷ء۔۱۹۳۶ء میں انجمنِ حمایت اسلام (گولڈن جوبلی پر) کل پاکستان مقابلہ نظم بہ عنوان ''پیغامِ عمل'' ہوا، جس پر ندیم نے اوّل انعام اور گولڈ میڈل بابائے اُردو مولوی عبدالحق سے حاصل کیا۔ ۱۹۶۴ء میں ندیم کو اِن کے شعری مجموعے ''دشتِ وفا'' پر آدم جی ادبی ایوارڈ ملا۔ ۱۹۶۸ء میں انہیں پرائیڈ آف پرفارمنس دیا گیا۔ ۱۹۷۶ء میں ندیم کو شعری مجموعے ''محیط'' پر آدم جی ادبی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ۱۹۷۹ء میں اِن کو تین ایوارڈ ملے۔ پہلا ایوارڈ ''دوام'' شعری مجموعے پر آدم جی ایوارڈ، دوسرا دوحہ ادبی ایوارڈ (یو۔اے۔ای) اور تیسرا غالب ایوارڈ (دہلی، بھارت) ۱۹۷۹ء ملا۔ ۱۹۸۰ء میں ''ستارۂ امتیاز'' عطا ہوا۔ ۱۹۹۸ء۔۱۹۹۷ء میں اکادمی ادبیاتِ پاکستان کی جانب سے ملک کا سب سے بڑا اور پہلا ادبی ایوارڈ ''کمالِ فن'' دیا گیا اور ۱۹۹۹ء میں سول ایوارڈ ''نشانِ امتیاز'' عطا ہوا۔

اس حوالے سے بقول افتخار عارف:

> ''اِن کی نظمیں اور غزلیں اقبال کے بعد کی اُردو شاعری میں ہماری شعری شناخت کے حوالوں میں بہت اہم سمجھی جاتی ہیں۔ انہیں جہاں ایک طرف ملک کا سب سے بڑا سول ایوارڈ ''نشانِ امتیاز'' تفویض کیا گیا وہیں اکادمی ادبیاتِ پاکستان کی جانب سے ملک کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ ''کمالِ فن'' بھی دیا گیا۔ اس کے علاوہ بھی عالمی اور قومی سطح پر مختلف اداروں کی جانب سے ان کو وقتاً فوقتاً اعزازات دیئے جاتے رہے۔'' [۴۴]

۲۰۰۱ء میں ''فیض محمد ٹرسٹ'' بھکر نے سال کی بہترین تخلیقات پر ''احمد ندیم قاسمی ایوارڈ'' کا اجرا کیا۔ ۲۰۰۲ء میں اے۔آر وائے گولڈ ادبی ایوارڈ سے ندیم کو نوازا گیا۔

امجد اسلام امجد نے ندیم کی شخصیت اور فن پر اِن کی زندگی میں ڈوکومینٹری ویڈیو فلم ''احمد ندیم قاسمی۔ ٹریبوٹ ٹو اے لیجنڈ'' کے نام سے تیار کی۔ اکتوبر ۲۰۰۵ء میں پنجاب یونی ورسٹی کے پروفیسر احمد بلال نے ندیم سے بالمشافہ ملاقات پر دستاویزی فلم تیار کی۔

ندیم کی شاعری پر نفیسہ حیات قاسمی نے ''کالج آف آرٹ اینڈ ڈیزائن۔ پنجاب یونی ورسٹی لاہور'' سے ایم ایف اے (پینٹنگ) کا مقالہ مئی ۲۰۰۵ء میں مکمل کیا اور نومبر ۲۰۰۶ء کو اِن کے بنائے ہوئے ندیم کے پورٹریٹس کی نمائش الحمرا آرٹ گیلری لاہور میں ہوئی۔ نیوز پوسٹ انڈیا میں ندیم کی بچوں کے لیے لکھی گئی کہانیوں کے بارے میں یوں لکھا ہے:

> ''۲ راپریل ۲۰۰۸ء کو بچوں کے بین الاقوامی یومِ کتب کے موقع پر دہلی (بھارت) میں منعقدہ تقریب میں پیش کی گئی کہانیوں میں سے ندیم کی کہانی ''جلیبیاں'' بچوں میں بے حد پسند کی گئی اور وہ Huge hit قرار پائی۔'' [۴۱]

۲۰۰۹ء میں محکمہ ڈاک پاکستان نے ندیم کی تیسری برسی پر ''ندیم یادگاری ٹکٹ'' جاری کیا۔

ندیم نے اپنی ساری زندگی بہادری، عزت، شرافت، دیانت داری اور خودداری سے گزاری لیکن آخری برسوں میں انہیں اپنے اوپر لگائے گئے غلط الزام سے بہت دُکھ ہوا۔ ان پر ایک ادبی رسالے کے مدیر اظہر جاوید نے اپنے اداریے میں یہ الزام لگایا کہ اُنھوں نے آمر حکومت سے ذاتی مالی فوائد حاصل کرنے کے لیے درخواست کی ہے۔ اُن پر لگائے گئے اِس الزام کی خبر اخبارات کے ذریعے پوری دنیا میں پھیل گئی۔ اس الزام کے متعلق ندیم کے داماد محمد حیات قاسمی (ایڈووکیٹ) بتاتے ہیں کہ:

> ''چچا ندیم کی زندگی کا قریب سے مشاہدہ کرنے والے بہت سے افراد کو اِس الزام تراشی پر بہت غصہ آیا۔ خود ہمارے خاندان والوں اور بالخصوص بزرگوں نے کہا کہ ہم سے یہ سب برداشت نہیں ہوتا۔ تم مقدمہ کر دو۔ میری توقع کے مطابق، اکثر درگزر کر دینے اور معاف کر دینے والے چچا ندیم نے اس مشورے کی مخالفت کی۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ

آ کر معافی مانگ لے گا لیکن وہ تو اس کے بعد بھی غلط بیانی کرنے میں لگا رہا۔ تب خاندان کے بے حد اصرار سے مجبور ہو کر چچا جان مان گئے اور یوں ۱۳رجنوری ۲۰۰۵ء کو ہم نے ڈیفارمیشن ایکٹ ۲۰۰۴ء کے تحت مقدمہ دائر کر دیا۔ مدعی (چچا جان ندیم) کی طرف سے وکلا پینل میں میرے ساتھ ندیم الدین ملک، سردار ایم ایس طاہر اور محمد سہیل ٹیپو پیش ہوئے۔ یہ مقدمہ مختلف طویل قانونی و عدالتی مراحل سے گزرا۔ مخالفین کو بھی عدالت نے دفاع کرنے کے لیے مواقع دیے لیکن وہ چچا جان پر لگائے گئے الزام ثابت نہ کر سکے اور آخر ۲۸رفروری ۲۰۰۶ء کو جناب سلطان احمد ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج کی عدالت سے چچا ندیم کے حق میں فیصلہ دیا گیا جب کہ مدیر مذکور کو پچاس لاکھ روپے ہرجانہ ادا کرنے کا حکم دیا۔'' ۴۲؎

ندیم جو کہ دمہ کے مریض تھے لیکن اُنھوں نے کبھی بیماری کو اپنے تخلیقی کام میں آڑے نہ آنے دیا اور ہمیشہ اس کے سامنے سینہ سپر رہے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کا کوئی لمحہ ضائع نہ کیا۔ نہ صرف جوانی بلکہ بڑھاپے میں بھی سخت محنت کی اور ہمیشہ اپنی خود اعتمادی کے بل بوتے پر ادبی محافل میں شریک ہوتے۔ روزانہ کئی خطوط کے جواب لکھتے۔ ضعیف العمری میں بھی ندیم نے خود کو اتنا فعال رکھا کہ صبح سے شام تک کام کرتے اور دفتر میں موجود رہتے۔ کبھی ''فنون'' کے دفتر میں تو کبھی مجلس کے۔ اُنھوں نے وفات سے تین روز قبل تک دفتر میں کام کیا۔ اگرچہ اُن کے چہرے پر عمر اور بیماری کے اثرات نمایاں تھے لیکن ندیم نے کبھی ہمت نہ ہاری۔ اِن کی ہمت اور بہادری کے متعلق اِن کے معالج ڈاکٹر محمود ناصر رقم طراز ہیں:

''میں اُن کا معالج تھا اور خوب اچھی طرح سے جانتا تھا کہ عمر نے عناصر کے اعتدال کا کیا حال کر دیا تھا مگر وہ شخص ہی کچھ اور تھا۔۔۔ اُن کی گفتگو سے کبھی ایسا نہیں لگا کہ ایک شخص جو موت کی آہٹ سن چکا ہو۔ اتنا شانت، مطمئن اور آسودہ ہو سکتا ہے۔ جب کہ قاسمی صاحب تو اپنی تکلیف کا ذکر بھی بے حد مدہم انداز میں کرتے جیسے کسی دوسرے آدمی کا قصہ بیان کر رہے ہوں:

''ڈاکٹر صاحب! آج سانس کی تکلیف کچھ زیادہ ہے۔'' ۴۳؎

۲۰۰۶ء کی سخت گرمی اور بار بار کی لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے ندیم کی سانس کی تکلیف کا دورانیہ بڑھتا گیا

لیکن ان کے معمولات میں فرق نہ آیا۔ ناہید قاسمی لکھتے ہیں:

> ''۲۰۰۶ء کے ماہِ جون نے احمد ندیم قاسمی جیسے عظیم کہسار کو زیادہ تر زلزلے کی سی حالت میں رکھا۔۔۔ڈاکٹر محمود ناصر ملک، ہسپتال، گھر ایک دائرہ سا بن گیا۔ اس دائرے کا ایک اہم سٹاپ دفتر بھی تھا۔ وہاں کے معمولات میں کوئی زیادہ فرق نہیں پڑا۔ کام، کام اور کام ساتھ ساتھ مسلسل جاری رہا۔ اس دوران انہیں اپنوں کے سکھ دُکھ کا بھی خیال رہا۔ سال گرہوں پر مبارک باد دینا بھی یاد رہا اور وہ عزیزوں دوستوں کی مزاج پرسی بھی کرتے رہے۔ وہ کلینک میں تھے مگر اپنی طبیعت کے پورے ٹھیک نہ ہونے کے باوجود اپنی بھابھی (ہماری تائی صاحبہ، مسز ایم۔ بی۔ پیرزادہ) کی تدفین میں شرکت کے لیے میرے بھائی نعمان اور مجھے ۲۹/جون کو وادیٔ سن سکیسر کے دُور دراز گاؤں ''انگہ'' بھیجا۔ ہم اسی روز واپس آ گئے تو اباجی کو بہت بہتر پا کر تسلی ہوئی۔ اس سارے عرصے میں وہ جب بھی بہتر محسوس کرتے، دفتر چلے جاتے اور اپنے کاموں میں لگ جاتے۔'' ۴۴

ندیم طبیعت کی خرابی کی وجہ سے ۶/جولائی بروز جمعرات کو خلافِ معمول دفتر سے جلد گھر آ گئے۔ گھر پر آکسیجن اور نیبولائزر کا بندوبست تھا جس کے استعمال سے اِن کو افاقہ ہوا۔ اپنے بچوں کے اصرار پر ندیم نے جمعہ اور ہفتہ کو چھٹی کر لینے کا ارادہ کر تو لیا لیکن ناہید قاسمی سے کہا کہ میں گھر پر بھلا کیا کام کروں گا۔ ناہید قاسمی نے انہیں کاغذات ترتیب دینے کا کہا، کیوں کہ اِن کے میز اور شیلف پر بہت سے خطوط اور کاغذ جمع تھے۔ جمعہ کو ندیم کی قوتِ ارادی نے اِن کا ساتھ دیا اور دن بھر اُنھوں نے اپنے نئے مجموعہ کلام اور شخصی خاکوں پر مشتمل اپنی نئی کتاب ''میرے ہم سفر'' کی دوسری جلد ''میرے ہم قدم'' کے مسودے دیکھے۔ پروف چیک کیے اور فہرستیں تیار کرائیں اور اس کو پرنٹنگ کے لیے تیار کر لیا۔ اِن میں صرف یہ دیکھنا باقی تھا کہ کوئی کلام یا اہم مضمون ان میں شامل ہونے سے رہ نہ گیا ہو لیکن اُس رات طبیعت پھر خراب ہوگئی تو ان کو ہفتے کی صبح ہسپتال لے گئے۔ جس سے اتوار کو ڈاکٹرز کی بھرپور توجہ سے ان کی طبیعت خاصی سنبھل گئی۔ ندیم کی مزاج پرسی کے لیے اُن کے دوست احباب بھی آتے رہے اور وہ اُن سے مختلف موضوعات پر بھرپور انداز سے گفتگو کرتے۔ بس اُنہیں بات کرتے وقت زیادہ زور لگانا پڑتا۔ ندیم رات تک پُرلطف باتیں کر کے اپنے گھر والوں کو ہنساتے رہے اور کھانا جو کہ گھر کا بنا ہوا تھا، رغبت کے

ساتھ کھایا۔ ندیم بیماری کی وجہ سے ہسپتال جاتے لیکن ٹھیک ہو کر گھر لوٹ آتے تھے لیکن اس بار جیتے جاگتے، ہنستے بولتے ندیم گھر واپس نہ جا سکے اور سوموار ۱۰ / جولائی ۲۰۰۶ء کی صبح کو پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی، لاہور میں انتقال کر گئے۔

ناہید قاسمی اِن کی وفات کے متعلق رقم طراز ہیں:

> ’’سوموار ۱۰ / جولائی ۲۰۰۶ء کی صبح کو پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی لاہور میں میرے اباجی کو سی سی یو سے اوپر کی منزل میں آئی سی سی یو لے جانے کے لیے جب ان کے پہیوں والے بیڈ کی بڑی سی نیم قوس بناتی سلائیڈ کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو ۔۔۔ تب میں نے ایک انوکھا منظر دیکھا جو میری یاد میں ہمیشہ کے لیے جم کر رہ گیا۔ میں نے ابر آلودہ صبح کی ہلکی سی گلابی روشنی میں دیکھا کہ بڑے سے صاف ستھرے سفید بیڈ پر میرے اباجی اپنے نیلے سے گرے رنگ کے نفیس لباس میں سیدھے لیٹے تھے۔ ان کا سنجیدہ پُرسکون چہرہ میرے سامنے تھا۔ ان کے سنورے ہوئے سفید بال آہستہ سے لہرا رہے تھے۔ وہ اِس وقت بہت خوب صورت، بڑے مطمئن اور بے حد پُروقار دِکھ رہے تھے۔ ایک فاتح کی مانند جیسے پُرسکون نیند میں، دو تین گھنٹے پہلے کی دھیمی دھیمی ہل چل کے اب آثار تک نہ تھے۔ ہسپتال کا عملہ اِن کے بیڈ کو سلائیڈ پر اوپر کی طرف ہموار رفتار سے دھکیل رہا تھا اور ہمارے ندیم کا وجود اِس زمین سے اُٹھتا، بلندی کی طرف اِس نیلے آسمان کی طرف قوس بناتا ہوا اوپر ہی اوپر، اونچے بڑے دروازے کے پار لے جایا جا رہا تھا۔ میرا دل تو نہیں مانا مگر میں سمجھ گئی تھی کہ اس لمحے میرے اپنے بہت ہی پیارے اباجی سکون اور اطمینان کی کیفیت میں اپنے رب کے پاس جا چکے ہیں۔ اب ڈاکٹرز صرف اپنے پیشے کا آخری تقاضا پورا کریں گے اور بس! اس پل اپنے اباجی سے جدائی کے شدید دُکھ کی ٹیسیں میرے دل میں کھب گئیں۔‘‘ [۴۵]

۷۰ برس تک ادب کی خدمت کرنے کے بعد ندیم نوے برس کی عمر میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اُس وقت ندیم کی عمر ۸۹ برس، ۷ ماہ اور ۲۰ دن تھی۔

۱۰ / جولائی ۲۰۰۶ء کی شام ۵:۳۰ بجے اکبر علی شاہ (غالب کالونی کی مسجد کے امام جو کہ ندیم کے گھر کے قریب واقع ہے) نے اِن کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ اِن کا جسدِ خاکی تدفین کے لیے شاہ مشائخ قبرستان (جو کہ

ملت چوک، سمن آباد، لاہور میں واقع ہے) لایا گیا اور اُن کی شریکِ حیات کے قریب سپردِ خاک کیا گیا۔

قبر کے کتبے پر ندیم کا یہ شعر درج ہے:

میں مر بھی جاؤں تو تخلیق سے نہ باز آؤں
بنیں گے نت نئے خاکے میرے غبار سے بھی

ندیم کے انتقال پر ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے خصوصی پروگرام نشر کیے۔ ندیم کی وفات کی خبر کو ملکی اُردو اور انگریزی اخبارات نے شہ سرخیوں میں جگہ دی۔ گورنر پنجاب جنرل ریٹائر خالد مقبول، ناظم لاہور میاں عامر محمود اور سابقہ گورنر پنجاب غلام مصطفیٰ کھر سمیت ملک کی ممتاز ادبی اور سیاسی شخصیات نے ندیم کے جنازے میں شرکت کی جب کہ صدرِ پاکستان جنرل پرویز مشرف، سابقہ وزیراعظم پاکستان بے نظیر بھٹو، سابق وزیراعظم میاں محمد نواز شریف، سابق وزیراعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف، وزیر مملکت برائے داخلہ ظفر اقبال وڑائچ، صوبائی وزیر زکوٰۃ وعشر میاں خادم حسین وٹو، صوبائی وزیر خوراک چوہدری محمد اقبال، صوبائی وزیر برائے فروغ مذہبی ہم آہنگی حافظ محمد طاہر اشرفی، صوبائی وزیر تعلیم میاں عمران مسعود، سردار ذوالفقار کھوسہ اور صوبائی وزیر ثقافت و اُمورِ نوجوانان چوہدری شوکت علی بھٹی، بنگلہ دیش میں پاکستان کی پریس قونصلر اور ندیم کی منہ بولی بیٹی مسز ساجدہ اقبال، نے ندیم کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا اور کہا کہ ندیم اپنے تخلیقی کاموں کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ وزیراعلیٰ پنجاب پرویز الٰہی، وفاقی وزیر اطلاعات ونشریات محمد علی دُرانی اور جماعتِ اسلامی کے رہنما لیاقت بلوچ نے مرحوم کے گھر جا کر اُن کے اہلِ خانہ سے تعزیت کی اور ندیم کی ادبی خدمات کو سراہا۔

ملک کے مایہ ناز ادیبوں نے اپنے کالموں میں ندیم کی وفات پر گہرے دُکھ کا اظہار کیا اور اُن کی ادبی خدمات کو ادبی دنیا کا اثاثہ قرار دیا۔ اِن کی وفات کے بارے میں امجد اسلام امجد لکھتے ہیں:

''اُن کے جنازے پر جب بانو قدسیہ آپا نے اُن کی میت کا چہرہ دیکھنے کے دوران دو تین بار کہا کہ بیٹا مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ پوری اُردو دنیا کی ترجمانی کر رہی ہوں کہ ندیم صاحب کے جانے کے بعد اب دُور دُور تک کوئی اُن جیسا دکھائی نہیں دیتا اور کسی کو کچھ نظر نہیں آ رہا۔'' ۴۶

ندیم، غالب کالونی، سمن آباد، لاہور کے معدوم ہوتے ہوئے رنگ وروغن والے مکان سے رخصت ہوئے لیکن ان کا

نام اُردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ جگمگا تا رہے گا۔ ندیم کا اپنا کہنا ہے کہ:

''اگر مجھے زندہ رہنا ہے تو میرا لفظ مجھے زندہ رکھے گا۔ اِس لفظ میں جان نہیں ہے تو میں کیوں کسی کو یاد رہوں گا۔ چناں چہ میری کسوٹی وہ لفظ ہے جو میرے فن میں وارد ہوتا ہے۔'' ۴۷

سیرت:

ندیم وجیہہ و شکیل آدمی تھے۔ چہرہ گول اور رنگ سرخ و سپید تھا۔ ندیم کے بچپن کے ناک نقشہ کے بارے میں پیرزادہ محمد بخش لکھتے ہیں:

''گھر کے صحن میں ایک گول مٹول، سرخ و سفید بچہ اُچھل کود میں مصروف ہے۔ بھرا بھرا جسم، گھنگریالے بال، موٹا مگر معصوم ناک نقشہ۔'' ۴۸

محمد خالد اختر، ندیم کی جوانی کے حلیے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''احمد شاہ ایک چوڑے ہاتھ پاؤں کا کسرتی بدن والا نوجوان تھا اور اس میں اپنے جنم دیس کی سنگلاخ پہاڑیوں کی سی سختی تھی۔'' ۴۹

ندیم کے بال جوانی میں ہی سفید ہونے لگے تھے۔ ابتدا میں ندیم نے اپنے بالوں کو نہ رنگا لیکن کچھ عرصہ بعد بعض دوستوں کے مشورے سے اس کو رنگا تو دوبارہ جوان نظر آنے لگے۔

بقول مجتبیٰ حسین (دہلی):

''جب قاسمی کے احباب نے عین عالم شباب میں اُن کے بالوں کی سفیدی پر اعتراض کیا تو بعض احباب کے مشورے سے اُنھوں نے اپنے بالوں میں خضاب لگانا شروع کر دیا۔ یوں وہ پھر سے جوانِ رعنا بن گئے۔'' ۵۰

ندیم نے ہمیشہ صاف ستھرا، اُجلا ہوا لباس زیب تن کیا۔ ندیم جو لباس بھی پہنتے، دیہاتی ہوتا یا شہری، اُن پر جچ جاتا۔ اِن کا لباس دیکھ کر لوگ حیران رہ جاتے۔

بقول اسلم کھوکھر:

''ایک دفعہ اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں مرحوم کی سالگرہ منائی جا رہی تھی تو اُردو ادب کے خوش قسمت ترین اور معروف شاعر احمد فراز کا جملہ بھی کانوں میں رس گھول رہا ہے کہ وہ

جب احمد ندیم قاسمی سے زمانۂ طالب علمی میں ملے تو شاعروں کے بارے میں قائم ہوا تاثر سارے تکدر دُور ہو گئے۔ اس قدر خوب صورت سوٹ کہ احمد فراز انہیں دیکھتے ہی دنگ رہ گئے۔ کسی شاعر کا اتنی عمدگی سے زیب تن کیا ہوا لباس قابلِ تقلید تھا۔'' ۵۱

ندیم دوستوں کی محفل میں خوب چہکتے اور دوستوں کے ساتھ ایسا بھرپور مزاح کرتے تھے کہ وہ واہ واہ کر اُٹھتے تھے۔ ندیم نہ صرف خود مزاح سے لطف اندوز ہوتے بلکہ اپنے آپ پر دوستوں کے مزاح اور بعض اوقات طنزیہ فقروں کی بھی داد دیتے تھے۔ ندیم کے مزاح کے حوالے سے مسعود اشعر لکھتے ہیں:

''قاسمی، ملتان میں امروز کے دفتر آئے تھے۔ ہم باتیں کر رہے تھے تو ملتان کے ایک شاعر صادق مصور بھی آ گئے۔ باتوں باتوں میں یہ ذکر آ گیا کہ قاسمی صاحب ملتان بھی رہ چکے ہیں۔ مصور صاحب نے بڑے بھولپن سے کہا:

''مگر میرے زمانے میں تو آپ یہاں نہیں تھے۔''

اُنھوں نے جس بھولپن کے ساتھ یہ سوال کیا تھا، اسی طرح قاسمی صاحب نے نہایت سوکھے منہ سے جواب دیا: جی، میں جارج ششم کے زمانے میں یہاں تھا۔'' ۵۲

حاضر جوابی، لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی ندیم کے مزاج کا خاص وصف تھا۔ کوئی دل چسپ بات سناتے وقت بھی ندیم اپنے فنِ لطیف کا خاص خیال رکھتے تھے۔ بات کرتے وقت پُرمزاح پہلو تلاش کرنا اِن کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ افتخار مجاز ایک واقعہ سناتے ہیں:

''ایک مرتبہ کراچی کے مشاعرے میں فیض صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے دوران فیض صاحب نے لاہور کے دوستوں کی بابت نام بنام دریافت کرنا شروع کیا۔ قاسمی صاحب کہنے لگے مجھے شرارت سوجھی، میں نے درجہ بدرجہ سب کی خیریت بتانے کے بعد کہا: ان دنوں لاہور بلکہ پنجاب میں آپ کی غزل ''چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے'' بہت مقبول ہو رہی ہے۔ فیض صاحب جو ہمہ تن گوش تھے، مسکرائے اور بولے: ''اِس غزل کی مقبولیت کا اندازہ آپ نے کیسے لگایا؟'' قاسمی صاحب بولے: ''ایک میوزک ڈائریکٹر بتا رہے تھے کہ بازارِ حسن کی ایک گلشن نامی طوائف نے نہ صرف یہ مصرعہ ایک تختی پر لکھوا کر اپنے دروازے پر نصب کروا دیا ہے بلکہ وہ چھوٹے چھوٹے اشتہارات اور ہینڈ بل کی صورت میں اسے چھپوا کر جہازوں سے بھی پھنکوا رہی ہے۔'' ۵۳

ندیمؔ دل چسپ فقرہ کسنے کے ماہر تھے اور اگر ان پر کسی نے دل چسپ فقرہ کسا یا جس فقرہ کی زد میں ندیمؔ خود بھی آئے، اُس واقعہ کو بھی دوسروں کو سناتے تھے۔

ندیمؔ جو کہ بچپن سے ہی بڑے شرارتی تھے، ندیمؔ کی پیدائش کے ساتھ ہی ایک اداکار نے بھی جنم لیا۔ ندیمؔ اکثر دوسروں کی نقلیں اُتارتے رہتے تھے۔

احمد عقیل روبی لکھتے ہیں:

''قاسمی نے گھر سے باہر مداری کا تماشا دیکھا تو گھر میں آ کر مداری کی پوری پوری نقل اُتار دی اور اپنے ہاتھوں سے آگ کے انگارے مسل کر گھر والوں کو حیران کر دیا۔ اپنے خاندان کی حویلی میں جعلی داڑھی لگا کر پیر کی ایسی اداکاری کی کہ اصل پیر چکرا گئے۔۔۔ مداری کا رول کرتے کرتے رستم کے مقابلہ میں آ کھڑا ہوا اور آغا حشر کے ڈرامے میں سہراب کا کردار ادا کر کے کالج کے لڑکوں اور پروفیسروں کو حیران کر دیا۔'' ۵۴

ندیمؔ اپنی خوب صورت حرکات وسکنات سے دوسروں کو محظوظ کرتے اور گھر میں اکثر بچوں جیسی شرارتیں کرتے۔ بعض اوقات دو یا تین آم کھا کر بے تحاشا آم کھانے کی اداکاری کرتے۔ ہاتھ دھونے کے لیے جاتے ہوئے یوں ظاہر کرتے کہ ان کے لیے چلنا دشوار ہے۔

ندیمؔ نے جب پہلی بار جمال گوٹہ کا نام سنا تو انہیں اس پر شرارت سوجھی۔ کیوں کہ انہیں معلوم ہوا کہ جمال گوٹہ کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔ ندیمؔ اور اُن کے بڑے بھائی حکیم کی دکان سے جمال گوٹہ کا ڈبہ لے آئے۔ محمد طفیل ان کی اس شرارت کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''قاسمی نے دو آنے کا جمال گوٹہ خرید لیا۔ گھر آ کر سوچا کہ اب اس کا استعمال کیا ہو۔ بالآخر ذہن میں ایک بات آئی کہ چچا مرحوم کے جو دو تین ملازم ہیں اُن پر بسم اللہ کی جائے اور دیکھا جائے کہ کیا ہوتا ہے۔ چناں چہ ہم نے اُسے سالن میں ڈالا اور تینوں ملازموں کو کھلا دیا۔ ابھی آدھ گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ اُن میں سے ایک دوڑا لوٹا لے کر۔ ابھی پہلا فارغ نہیں ہوا کہ دوسرا بھی اُدھر، حتیٰ کہ تیسرا بھی۔ کیفیت یہ تھی کہ تُو چل میں آیا۔'' ۵۵

ندیمؔ مطالعہ باقاعدگی سے کرتے تھے۔ بعض اوقات لکھنے میں کئی کئی دن اور کئی کئی ہفتے بغیر قلم اُٹھائے

گزر جاتے تھے لیکن ذہنی طور پر ندیم جو کچھ سوچتے رہتے تھے۔ اِن کو اپنے دماغ کی تختی پر لکھتے جاتے تھے۔ ان کے لکھنے کا خاص وقت اور خاص مقام مقرر نہیں تھا۔ جاڑے کی راتوں میں بھی لکھا اور تپتی دوپہروں میں بھی۔ گھر، سفر اور پردیس میں بھی لکھا۔ ندیم عموماً لکھنے کے بعد خاصی کانٹ چھانٹ کیا کرتے تھے۔ بعض اوقات ایک ایک مصرعے کی تکمیل میں کئی کئی دن لگ جاتے تھے تاکہ ایک لفظ بھی فالتو نہ آسکے۔ کانٹ چھانٹ کرتے وقت کہیں جملے بڑھا دیتے تو کہیں فقرے گھٹا دیتے۔ لفظوں کو آگے پیچھے سرکاتے اور سطروں کو اوپر نیچے لے جاتے۔ لکھنے کے بعد کانٹ چھانٹ کے متعلق ندیم اپنے ایک انٹرویو میں لکھتے ہیں:

> ''لکھنے کے بعد خاصی کانٹ چھانٹ کرتا ہوں۔ شعر اور نثر دونوں کو جب صاف کرنے بیٹھتا ہوں تو ترمیم و تنسیخ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرے افسانوں کا تیسرا، چوتھا ورشن (Version) ہی آخری ورشن ہو پاتا ہے۔ غزل اور نظم کو بھی کئی دنوں تک فن کی ورکشاپ میں رکھتا ہوں۔'' ۵۶

ندیم کو شعر و ادب ہی کے رشتے سے قلم سے محبت تھی۔ اِن کے پاس قسم قسم کے قلم جمع تھے۔ عموماً عمدہ قلم ہی استعمال کرتے تھے۔ لکھنے کے لیے عمدہ قسم کے کاغذ کے دستے، اچھے قسم کے بال پوائنٹ اور پینسلیں بھی جمع ہوتی تھیں۔ اگر انہیں تحفے میں کوئی دوست قلم دیتا تو بے حد خوش ہوتے اور گھر والوں سے اِس کا ذکر کرتے اور قلم میں روشنائی بھر کر صفحے پر کچھ لکھتے تھے۔ اُنھوں نے قلم کے لیے ہی ساری زندگی وقف کر دی۔ اِن کا تنہا سہارا قلم ہی تھا۔ لکھتے وقت اِن پر سکون اور خوشی طاری رہتی تھی۔ ندیم کی لکھتے وقت کی کیفیت کا ذکر ناہید قاسمی نے یوں کیا ہے:

> ''پلائی وڈ کی ایک تختی اُٹھا کر قلم ہاتھ میں تھام لیں گے۔ تب ہم سمجھ جاتے ہیں کہ وہ کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔ چناں چہ ہم اُنہیں تنہا چھوڑ دیتے ہیں۔'' ۵۷

محمد طفیل ان کے لکھنے کے انداز کے متعلق یوں ذکر کرتے ہیں:

> ''اگر یہ چارپائی پر بیٹھے ہوں۔ تکیے سے ٹیک بھی لگا رکھی ہو اور یہ ایک دم اکڑوں بیٹھ جائیں، تو سمجھ لیجیے کہ یہ افسانہ لکھنے والے ہیں۔ اس وقت یہ سگریٹ پہ سگریٹ پئیں گے۔ خوب صورت سا کاغذ لیں گے، پنسل کو باریک بنائیں گے اور مہین مہین خط میں افسانہ

شروع کر دیں گے۔ آپ لاکھ شور مچائیں یہ لکھتے رہیں گے۔ البتہ شعر کہنے کے لیے تنہائی چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ انہیں ہلکا ہلکا گنگنانا ہوتا ہے۔ چوں کہ یہ اپنے ترنم کا مرتبہ جانتے ہیں اس لیے اِس خداداد دین کا حال سب پر آشکار کرنا نہیں چاہتے۔'' ۵۸

ندیمؔ کو بچپن سے ہی مطالعہ کا شوق تھا۔ اِن کے چچا جو کہ ان کے سرپرست تھے۔ ان کی لائبریری میں اقبالؔ، شبلی نعمانی، حالی، ظفر علی خان کی تصانیف موجود تھیں۔ ان کو پڑھنے کی وجہ سے ندیمؔ میں مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ ندیمؔ لکھتے ہیں:

''میں شاعری، افسانہ، ناول، ڈراما، فلسفہ، ادبی تنقید، فنون لطیفہ سے متعلق کتب و مضامین اور تاریخِ عالم و تاریخِ اسلام کی کتابیں پڑھنے کا شوق رکھتا ہوں۔'' ۵۹

ندیمؔ نے شعر و ادب کے علاوہ برنارڈ شاہ اور شیکسپیئر کے ڈراموں کے علاوہ ایلیٹ، پاؤنڈ اور نرودا کی متعدد کتابیں پڑھی ہیں۔ برٹرینڈ رسل اور سی ای ایم جوڈ کی تصانیف کا بھی مطالعہ کیا۔ ندیمؔ کو مطالعہ کرنے سے بے حد سکون ملتا تھا۔ ان کو کتابوں سے بڑی محبت تھی، ان کا کہنا ہے کہ کتابیں انسانیت سے متعارف کراتی ہیں۔ اس لیے ان کو خوب پڑھنا چاہیے۔

ندیمؔ کھانے کے بے حد شوقین تھے، پیٹ بھر کر کھانا کھاتے تھے۔ کھانے میں تکلف سے کبھی کام نہ لیا۔ مرزا ادیب بتاتے ہیں:

''مرغ اور تربوز کھانے کے درمیان ایک جگہ جو بیٹھنے کا موقع ملا تو ندیمؔ صاحب نے کھل کر باتیں کیں اور آغاز گفتگو یوں کیا: ''یہ شہری لوگ بڑے عجیب ہیں۔ بھوکے رہتے ہیں اور اسے تہذیب سمجھتے ہیں۔ ہم دیہاتی اس تہذیب کے قائل نہیں ہیں۔ پیٹ بھر کر کھاتے ہیں، خواہ مخواہ تکلف سے کام نہیں لیتے۔'' ۶۰

ندیمؔ سونے سے پہلے اور جاگنے کے بعد دودھ ضرور پیتے تھے اور دودھ عموماً اوولٹین ملا کر پیتے تھے۔ ندیمؔ میٹھا شوق سے کھاتے تھے اور اکثر میٹھا کی فرمائش کرتے تھے۔ میٹھے میں ان کو حلوہ بہت پسند تھا۔ اگر ندیمؔ کا بدن ٹوٹ رہا ہو یا پاؤں میں موچ آ گئی ہو تو حلوے کی فرمائش کرتے ہیں۔ اپنی ہر بیماری کا علاج حلوے کو سمجھتے ہیں۔

ندیمؔ پڑھنے کے ساتھ ساتھ کھیل کے بھی شوقین تھے۔ والی بال اور کبڈی بڑے شوق سے کھیلتے۔ کبڈی

کھیلتے وقت عموماً قمیص اُتار دیتے اور ایک ہاتھ سے عینک پکڑتے اور ایک سے پتلون، جیسے اِن کے گرنے کا خطرہ ہو۔ احتیاط کے باوجود اگر عینک گر جاتی تو ان کے لیے دُشواری پیدا ہو جاتی کیوں کہ اس کے بغیر انہیں بھاگنے کی عادت نہ تھی۔ ندیمؔ نے جس طرح کالج کے زمانے میں مباحثوں اور ڈراموں میں نام پیدا کیا، اُسی طرح اچھے کھلاڑیوں میں بھی ان کا شمار ہونے لگا۔

بقول پیرزادہ:

''بہت کم لوگوں کو علم ہو گا کہ شاہ والی بال کا ایک عمدہ کھلاڑی ہے۔ وہ ''سنٹر'' میں کھیلتا تھا اور میں ''نٹ'' پر۔ اس لیے میری ''والی'' سے اِس کی عینک کے پرخچے کئی بار اُڑے ہیں۔'' ۶۱

ندیمؔ میں درویشی اور انکسار کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ندیمؔ خلوص، سچائی اور انکسار کا پیکر تھے۔ ان کے لہجے میں تلخی، ترشی اور کسی کی دل شکنی نہ ہوتی تھی۔ نعمان قاسمی راقم الحروف کو لکھے گئے خط میں لکھتے ہیں:

''ندیمؔ صاحب ویسے تو ایک بے مثال انسان تھے اور اُن میں ہزاروں خوبیاں تھیں لیکن مجھے اُن کی معاف کر دینے کی عادت سب سے زیادہ پسند ہے۔ ندیمؔ صاحب نے اپنی زندگی میں معلوم نہیں کتنے لوگوں کو معاف کیا اور اِن کی غلطیاں ہمیشہ کے لیے بُھول گئے۔ یہ ایک عظیم انسان کی پہچان ہے۔'' ۶۲

ان کی وضع داری کا یہ عالم تھا کہ اگر انہیں رسالے کے لیے کسی کی تحریر پسند نہ آتی تو وہ یہ کہتے کہ یہ آپ کے معیار کے مطابق نہیں ہے۔ اس لیے شائع نہیں ہوئی۔ ندیمؔ کے ہم علاقہ کرامت بخاری لکھتے ہیں:

''وہ محنت، خلوص، لگن، رواداری، وضع داری، بردباری اور ایمان داری جیسی خصوصیات کے حامل تھے۔'' ۶۳

ندیمؔ نہ تو کسی سے جھگڑا کرتے اور نہ کسی کے جھگڑے میں حصہ لیتے تھے۔ انہیں صرف اپنے کام سے کام ہوتا تھا۔ انکسار ان کی طبیعت کا شیوہ تھا۔ اِس انکسار کی وجہ سے ہر خط کا جواب ضرور دیتے تھے بلکہ اس کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔ محمد اظہار الحق لکھتے ہیں:

''دنیائے ادب کا بے تاج بادشاہ ہونے کے باوجود انکسار اور وضع داری کا یہ عالم تھا کہ حقیر سے حقیر اور گم نام سے گم نام آدمی کے خط کا جواب اپنے قلم سے دیتے۔'' ۶۴

ندیمؔ کی وضع داری کا یہ عالم تھا کہ اُنھوں نے کبھی کسی کا احسان اُٹھانا مناسب نہ سمجھا۔ اِن کی وضع داری میں بھی ان کی خودداری تھی۔ اسی خودداری کی وجہ سے اُنھوں نے کبھی سچ پر سمجھوتہ نہیں کیا۔ ندیمؔ نے اپنے اوپر کوئی خول نہ چڑھایا۔ ان کو اپنی زندگی میں بہت سے دُکھوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ذات کی شکست و ریخت، عزیز واقارب کے ستم، دوستوں کے دُکھ اور تنگ دستی کی پریشانیاں اِن سب کو ندیمؔ نے برداشت کیا۔ لیکن سچ پر کبھی سمجھوتہ نہ کیا اور نہ ہی خودداری کو کبھی ٹھیس لگنے دی۔ محنت، دیانت داری اور لگن سے کام جاری رکھا۔

بقول مسرت لغاری:

''اِن کی خودداری ___ کا بھی اپنا ایک وقار تھا۔ کبھی کوئی غلط بات نہیں کرتے تھے مگر غلط یا اُصول سے ہٹی ہوئی کوئی بات سنتے بھی نہ تھے۔'' ۶۵

ندیمؔ کی شخصیت میں خودداری کا واضح پرتو ملتا ہے۔ ندیمؔ نے اپنی خوددار طبیعت کی وجہ سے زندگی کے آخری سانس تک اپنا رزق خود کمایا۔ اگرچہ پیسہ ہر انسان کی ضرورت رہا ہے لیکن اِس کی چمک دمک نے کبھی ان کے پاؤں کو نہ ڈگمگایا۔ حتیٰ کہ ان کے پھیپھڑوں پر دِق کے اثرات ظاہر ہونے لگے اور ڈاکٹر نے انہیں پہاڑی علاقے میں جانے کو کہا تاکہ بیماری پھیل نہ جائے۔ اُس وقت اِن کے پاس پیسہ نہ تھا لیکن احسان دانش کے بھرپور اصرار پر بھی ندیمؔ نے ان سے پیسے نہ لیے کیوں کہ یہ ان کی خودداری کو گوارا نہ تھا۔

اِن کا لہجہ دھیما اور میٹھا ہوتا تھا۔ بات ہمیشہ سوچ سمجھ کر ٹھہر ٹھہر کر کرتے تھے اور چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی تھی۔ اُٹھنے بیٹھنے میں بھی تحمل اور بردباری تھی، رکھ رکھاؤ بھی ندیمؔ کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ حرص اور لالچ ان کے مزاج سے کوسوں دُور تھا۔ اُنھوں نے ہمیشہ اُصول کی جنگ لڑی۔ کئی مرتبہ لوگوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ان کو لالچ بھی دیے لیکن ان کے پایہ استقلال میں لرزش نہ آئی۔ بقول ندیمؔ:

وقت بدلا پہ نہ بدلا مرا معیارِ وفا
آندھیوں میں سر کہسار چراغاں جیسے ۶۶

ندیمؔ کو مجلسِ ترقیٔ ادب کی عمارت کے سلسلے میں بھی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جب نظریہ پاکستان کے ٹھیکے داروں نے نرسنگھ داس گارڈن کا حلیہ بگاڑنے کی کوشش کی۔ یہ وہ کوٹھی تھی جس میں بزمِ اقبال، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ اور مجلس ترقیٔ ادب کے دفتر ہیں۔ یہ کوٹھی کئی ایکڑ میں پھیلی ہوئی تھی۔ جب کارکنانِ تحریکِ پاکستان کو اپنا کام کرنے

کے لیے جگہ چاہیے تھی تو اُنھوں نے اِس کوٹھی پر قبضہ کرنے کی ٹھان لی اور اُس کے ایک حصہ پر عمارت بنانا شروع کر دی۔ جب ندیمؔ نے اِس کے خلاف آواز بلند کی تو انہیں لالچ دے کر کچھ رقم دینے کی کوشش کی گئی لیکن ندیمؔ اُصول کے لیے لڑتے رہے۔

مسعود اشعر اِس عمارت کے متعلق ندیمؔ کی دشواریوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک بار ہم قاسمی صاحب کے پاس بیٹھے تھے تو ایک صاحب اندر آئے اور سلام کر کے بیٹھ گئے۔ قاسمی صاحب نے پوچھا: کیسے تشریف لائے؟ تو کہنے لگے: اگر آپ ہماری بات مان لیں تو ہم اس جگہ ایک بہت عالی شان پلازہ تعمیر کر دیں گے۔ اس میں آپ کو بھی ایک شان دار دفتر دے دیا جائے گا۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ وہ قاسمی صاحب کو لالچ دے رہے تھے۔ لیکن اِدھر وہ صاحب اپنا پلان بتا رہے تھے اور اُدھر قاسمی صاحب کا چہرہ سُرخ ہوتا جا رہا تھا۔ لگتا تھا کہ قاسمی صاحب ابھی غصے میں کھڑے ہو کر اِس شخص کا منہ نوچ لیں گے۔'' ۶۷

ندیمؔ کے جو اُصول تھے اُن کو اُنھوں نے عمر کے آخری حصے میں بھی تبدیل نہ کیا۔ کئی مرتبہ لوگوں نے ان کو پیغام بھیجے کہ اب زمانہ بدل چکا ہے۔ آپ بھی بدل جائیں اور بدلتے حالات میں مصلحت کے پیشِ نظر اپنے قرینے کو تبدیل کر دیں لیکن ندیمؔ نے ایسا نہ کیا اور ہمیشہ حلال رزق کمایا۔ ندیمؔ نے اپنی ذات کے اعتماد کی وجہ سے اپنی زندگی میں دشواریوں کا سامنا ڈٹ کر کیا۔ اپنے اوپر ٹوٹتے ہوئے مصیبتوں کے پہاڑ کو اپنے اعتماد کے سہارے لرزا دیا اور عمر بھر سامراجیت اور ملکیتی نظام کی اقدار سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ ندیمؔ نے ہمیشہ اپنی زندگی کی جنگ آپ لڑی۔ دوسروں کا انتظار کبھی نہ کیا کہ وہ آئیں اور اُن کی حفاظت کریں۔ جب بھی ندیمؔ پر کسی نے حملہ کیا۔ اُنھوں نے نہایت باوقار انداز میں اُس کی مدافعت کی۔ ندیمؔ نہ صرف جوانی بلکہ بڑھاپے میں بھی نوجوانوں کی طرح کام کرتے تھے اور ہمت نہ ہارتے تھے۔ زندگی کے آخری ایام تک کام کرتے رہے۔ بعض اوقات بھاری لفافے اُٹھانے کی وجہ سے طبیعت خراب ہو جاتی اور سانس پھولنے لگتا لیکن کسی اور سے کام نہ کراتے۔

عطاالحق قاسمی لکھتے ہیں:

''ایک روز میں اپنا ایک سوٹ استری کرانے کے لیے نیچے لانڈری والے کے پاس لے جا رہا تھا کہ ندیمؔ صاحب نے روک لیا اور پوچھا: کدھر کے ارادے ہیں! میں نے

عرض کیا: یہ سوٹ استری کرانے جا رہا ہوں۔ ندیم صاحب نے سوٹ مجھ سے لے لیا اور کہا: میں اپنے کپڑے استری کرنے لگا ہوں۔ ان میں یہ بھی ہو جائے گا۔ میں نے کہا: یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ اپنے کپڑے بھی مجھے دیں، میں انہیں لانڈری سے استری کروا کر لاتا ہوں۔ کہنے لگے: تم لانڈری والے سے آدھے پیسے مجھے دے دینا اور اگر کام پسند نہ آئے تو یہ پیسے بھی واپس۔" ۶۸

ندیم اُن مردوں میں سے نہ تھے جو اپنے کاموں سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ بیوی، بچوں اور ملازم کے ہونے کے باوجود اپنے کپڑے اُتار کر خود ٹانگ دیتے یا تہہ کر کے رکھ دیتے۔

ندیم کے والد مجذوب تھے اور دنیا سے بیگانہ رہتے تھے۔ ندیم اپنے والد کا جو خاکہ بیان کرتے ہیں اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خوددار اور غیر دنیا دار، صحیح معنوں میں فقیر تھے۔ اس فقیری اور درویشی پر وہ خوش رہتے تھے۔ اگر کوئی انہیں مجذوبانہ زندگی چھوڑنے کا مشورہ دیتا تو وہ بُرا مان جاتے۔

محمد خالد اختر لکھتے ہیں:

"ندیم کو اپنے والد ایک بوڑھے برف جیسی سفید داڑھی والے بزرگ کی حیثیت سے یاد ہیں، جو ہمیشہ مصلے پر عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ دنیاداری کے معاملات میں اتنے معصوم جتنا ایک بچہ اور گھر کی ضروریات کے متعلق قطعاً بیگانہ۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ بے حد مفلس تھے اور اکثر فاقوں کی نوبت بھی آ جاتی۔" ۶۹

ندیم کو ان کے والد کی وفات نے آٹھ برس میں ہی یتیم کر دیا لیکن اس کے نتیجے میں اُن کی سوچ اور فکر میں پختگی آئی اور اِس نے ان کی کئی مشکلات کو آسان بنا دیا۔ اس طرح کم سنی میں ہی محنت کرنے کی عادت نے آخری وقت تک اِن کا پیچھا نہ چھوڑا۔

ندیم کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر ان کی ماں کا ہے۔ ان کی والدہ اپنی جان مار کر اپنے بچوں کا پیٹ پالتی۔ ندیم اپنی ماں سے بے حد محبت کرتا۔ اکثر اپنی ماں کے پاؤں دباتے رہتے تھے۔ اس سے انہیں روحانی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ اِس خوشی کو حاصل کرنے کے لیے ندیم اپنا آدھا دن صرف کر دیا کرتے تھے۔ ماں کی باتوں سے ندیم بے حد لطف اندوز ہوتے۔ ان سے لاڈ پیار کے دوران ایسے مچلتے جیسے دو برس کے بچے ہوں۔

محمد خالد اختر لکھتے ہیں:

''ہم ایک دوسرے سے مستقل خط و کتابت کرتے رہے۔ اس کے خط شدید جذبات سے بھاری، لب ریز اور لمبے ہوتے تھے۔۔۔ ہر خط میں وہ اپنی بوڑھی ماں کا ذکر ضرور کرتا جس کی کوکھ نے اِسے جنا تھا اور جو اِس کے نزدیک ساری دنیا کی عظیم ترین عورت تھی۔ ندیم اپنی ماں کو حقیقتاً پوجتا تھا۔ اِس کی دِل جوئی کی خاطر، اِس خاطر کہ وہ اپنے بیٹے کے کارناموں پر غرور کر سکے۔ وہ ادب کے آسمان پر اپنا نام درخشاں سونے کے حروف میں رقم کرنے کے لیے تڑپتا۔'' ۷۰

ندیم اپنی ماں کی خاطر جیتے تھے۔ ان میں جو خودداری تھی، وہ اُن کی ماں کی تربیت کا اثر تھا۔ اُن کی ماں نے اُنھیں ہمیشہ حق بات کہنا ہی سکھایا۔ ندیم کی شخصیت میں جو خودداری، خیر کی قوتوں سے پیار، شرافت اور غیرت مندی تھی، وہ اُن کی ماں کی پرورش کا ہی نتیجہ تھی۔ ندیم ہمیشہ اپنی ماں کا ذکر عقیدت سے کیا کرتے تھے۔ اُن کی ماں نے انھیں حق بات پر ڈٹ جانے کے لیے حوصلہ مندی اور استقامت کا درس دیا۔ اِن کے نہ صرف شخصی کردار میں ماں کی شخصیت کا اثر ہے بلکہ فنی مسلک کی تشکیل میں بھی ان کی ماں اِن کے لیے مینارۂ نور ثابت ہوئی۔ ان کے نزدیک اِن کی ماں دنیا کی عظیم ترین عورت تھیں۔ اِسی وجود نے انھیں عورت کی عزت اور عظمت کا سبق دیا۔

ندیم کو اپنی بہن سعیدہ بانو سے بھی بے حد پیار تھا۔ اِن کا دامن پکڑ کر اُنھوں نے چلنا سیکھا۔ اِن کے ساتھ ندیم دیر دیر تک گڑیاں کھیلتے رہتے۔ اِن کے دل میں بہن کے لیے بے حد محبت اور احترام تھا۔ بہن کے اِس والہانہ محبت کے رشتے کا بیج اِس طرح بویا کہ وہ بڑھ کر چھتناور (تن آور) درخت بن گیا جس کی چھاؤں میں بیٹھی کئی اور منہ بولی بہنیں بھی فخر کرتی ہیں۔

بقول ناہید قاسمی:

''وہ پھوپھی جان کو بھی بہت یاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسی بہنیں ہر کسی کو نصیب نہیں ہوا کرتیں۔ یوں تو وہ ہر انسان کا احترام کرتے ہیں مگر خاص طور پر صنفِ نازک کا جو احترام اِن کے دل میں ہے اُس کی بنیاد دادی جان اور پھوپھی جان کی دلربا شخصیتوں میں پوشیدہ ہے۔'' ۷۱

ندیم کو اپنے بڑے بھائی محمد بخش سے بھی بہت محبت تھی۔ یہ ندیم سے دو ڈھائی برس بڑے تھے۔ اِن کے ساتھ ندیم خوب کھیلتے تھے۔ اِن کے ساتھ ہی گاؤں کی سیر کرتے اور اسکول جایا کرتے۔ محمد بخش نے ندیم کا ہر معاملے میں ساتھ دیا اور عملاً اِن کی زندگی کے رہنما بھی تھے۔ ندیم اپنی والدہ، بڑی بہن اور بڑے بھائی کا بہت احترام کرتے۔ اِن کا کہا کسی صورت میں نہ ٹالتے۔ ندیم نے افسانوی مجموعہ ''بگولے'' کا انتساب اپنے بڑے بھائی کے نام کیا اور لکھتے ہیں کہ:

''برادر بزرگ پیرزادہ محمد بخش صاحب قاسمی کے نام جنھوں نے میرے بچپن کی نیم شگفتہ، نیم پژمردہ گھڑیوں، سنِ بلوغ کے احساس کی آنچ سے تپتے لمحوں اور شباب کی دھڑکتی اور بھڑکتی ساعتوں میں متبسم چہرے اور پُرخلوص ولولے سے میرا ساتھ دیا اور بارہا مجھے نااُمیدی اور تذبذب کے غاروں میں گرنے سے بچایا۔'' ۲ے

ندیم نے اپنی نظم ''آخری فیصلہ'' میں اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ قریبی رشتہ داروں اور احباب کا ذکر یوں کیا ہے:

مری معصوم بیٹی کا اُجلا تبسم
جیسے شبنم کے قطرے میں خورشید کا اولیں لَس گُھل جائے!
میری بہنوں کی آنکھوں میں پاکیزگی کی چمک
جیسے برفوں سے آراستہ پربتوں میں ستارے اُتر آئیں!
میری بیوی کے چہرے پہ تخلیق کے ولولے، پرورش کے عزائم
جیسے دھرتی کے شاداب سینے پہ گندم کے اکھوے
میرے بھائی کے ہاتھوں کی مانوس گرمی
جیسے سرما کی بھیگی ہوئی صبح میں دھوپ مل جائے
میری ماں کا بڑھاپا، خلوص اور محبت کا بارِ امانت اُٹھائے ہوئے
ڈوبتے چاند کی چاندنی، سوکھتے گلشنوں کا تعطّر!
میرے ابا کی تربت پشاور میں ڈوبی ہوئی
جیسے اُمڈے ہوئے بادلوں میں نہاں مہرِ تاباں!
میرے احباب کی دندناتی ہوئی محفلیں

جیسے دریا چٹانوں سے ٹکرا کے بہتے ہوئے، گھوم جاتے ہوئے، گنگناتے ہوئے
آج دنیا میں جتنے بھی انسان ہیں ایک انسان ہیں
اور آدمیت کا یہ آخری فیصلہ ہے
کہ ہم اپنی دنیا کو ویران ہونے نہ دیں گے
ہم نئی جنگِ عالم کا اعلان ہونے نہ دیں گے ۳؎

ندیم یہ چاہتے تھے کہ اِن کی شادی گاؤں کی لڑکی، جس سے وہ محبت کرتے تھے، ہو جائے، لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ ندیم کے بزرگوں نے اِن کی شادی رابعہ سے طے کی۔ رابعہ کا تعلق ندیم کے قبیلے سے تھا۔ لیکن یہ پڑھی لکھی نہ تھیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ادیب اور شاعر سکون سے نہیں بیٹھتے کیوں کہ اِن کا ذوقِ جمال وظیفہ عیال پر غالب آ جاتا ہے لیکن ندیم اِس لحاظ سے خوش نصیب تھے کہ ان کی خانگی زندگی گرداب آشنا نہیں تھی۔ لیکن اس کا بڑا سبب ندیم کا مزاج تھا، جو ہمیشہ دوسروں کے جوہر کی قدر کرتا تھا۔ اگر چہ اِن میں کچھ باتوں پر اختلاف تھا، کیوں کہ ان کے مزاجوں میں فرق تھا لیکن یہ دونوں ایک دوسرے سے مخلص تھے۔ ندیم کے آمدن کے ذرائع محدود ہونے کی وجہ سے اُنھوں نے آپس میں طے کیا کہ انعامات کی رقم اور مشاعروں کی آمدنی ندیم اپنی مرضی سے خرچ کریں گے جب کہ کالم نگاری یا ملازمت کی رقم زیادہ تر گھر پر خرچ ہو گی۔ رابعہ، ندیم کی بہترین رفیقۂ حیات ثابت ہوئیں۔ ندیم بھی محبت کرنے والے، متحمل مزاج شوہر تھے۔ اُنھوں نے ہمیشہ بیوی کا خیال رکھا۔ جب بھی اِن کی رفیقۂ حیات انگہ جاتیں۔ ندیم اُن کو بار بار خط لکھتے۔ اُن کی صحت کے متعلق فکرمند رہتے۔ اِن کو رابعہ کے بغیر گھر ویران لگتا تھا۔ اس کا اظہار اُنھوں نے اپنے متعدد خطوط میں کیا۔ اپنے ایک خط میں ندیم لکھتے ہیں:

''پیاری رابعہ ___ آج تمھیں لاہور سے گئے چھٹا دن ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ تم اب تک انگہ پہنچ گئی ہو گی۔ مجھے سب سے زیادہ فکر تمہاری صحت کی ہے۔ نعمان بتا رہا تھا کہ سورکی میں بھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں سخت فکرمند ہوں۔ ایک تو تمہارے نہ ہونے سے پورا گھر خالی خالی نظر آتا ہے۔ اس پر تمہاری بیماری کا خطرہ۔ اللہ کرے تم تندرست رہو اور جلد واپس آ سکو۔'' ۴؎

ندیم کی اچھی عادات کے متعلق رابعہ ندیم بتاتی ہیں کہ:

''مجھے اُن کی صفائی ستھرائی کی عادت پسند ہے۔ زندگی گزارنے کا وہ ایک خاص سلیقہ رکھتے ہیں اور یہ سلیقہ مجھے بے حد عزیز ہے۔ وہ بے حد خوش مزاج ہیں۔ بے حد صاف گو ہیں۔ کبھی کوئی لگی لپٹی اُٹھا کر نہیں رکھتے۔ اس طرح بعض دفعہ مشکلات میں بھی گھر جاتے ہیں مگر مجھے ان کی صاف گوئی سے پیار ہے۔'' ۵؎

ندیم کو اپنے بچوں سے بھی بے حد محبت تھی۔ اِن کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ اِن کے ساتھ کھیلتے، باتیں کرتے، چھیڑتے اور شرارتیں کرتے رہتے تھے۔ اُن کے ساتھ بچہ بن جاتے۔ ندیم اپنے بچوں کی ضروریات کا اُن کے کہے بنا، خیال رکھتے۔ اپنی مصروفیات کے باوجود ان کے لیے وقت نکالتے۔ حالات کی سختی انہیں شفیق باپ کے عملی اظہار سے روک نہیں پائی تھی۔ بچوں کے ساتھ اِن کے رویے کے متعلق ناہید قاسمی لکھتی ہیں:

''ہمارے لیے ایسا منفرد سامان، ایسے خوب صورت بستے اور بیگ، ایسے الگ سے کلر باکس، پینٹنگ کی چیزیں اور ایسا مختلف سا عمدہ لباس خرید لاتے کہ ہمارے ہم عصر اور ہم جماعت بازاروں میں ڈھونڈتے رہ جاتے۔۔۔ ہمیں سیر و تفریح کے لیے لاہور کے تاریخی و تفریحی مقامات پر لے کر گئے۔ ہمیں سینما گھروں میں دل چسپ اور اعلیٰ معیار کی فلمیں دکھانے کے لیے بھی وقت دیا اور ہمارے ساتھ لڈو، کیرم، تاش، تعلیمی تاش، کسوٹی، بتیسواں سوال اور ''نام چیز جگہ'' جیسے کھیل کھیلنے کے لیے بھی وقت نکالا۔'' ۶؎

ندیم نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے بہت محنت کی اور بہت سی قربانیاں بھی دیں۔ ندیم چوں کہ خود ایمان دار اور دیانت دار تھے۔ اِسی دیانت داری کو اُنھوں نے اپنے بچوں کی تربیت کا حصہ بنایا۔ اُنھوں نے اپنے بچوں کی صلاحیتوں کی حوصلہ افزائی تو کی لیکن بلاوجہ نمایاں نہیں کیا۔ ان کے بچوں نے کبھی ان کے دفتری ملازمین یا آفس گاڑی کو استعمال نہ کیا۔

راقم الحروف کو ان کے بیٹے نعمان قاسمی نے ندیم کے اِن کے ساتھ پیش آنے کے متعلق بتایا کہ:

''باپ بیٹے کا رشتہ جو میرے اور قاسمی صاحب کے درمیان تھا وہ بے مثال تھا لیکن اس کے علاوہ قاسمی صاحب مجھ سے ایک دوست کی طرح بھی پیش آتے تھے۔ ہم دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے مشورے کرتے تھے۔ ایک دوسرے سے باتیں کرتے تھے۔'' ۷؎

ندیمؔ نے اپنی اولاد میں اچھے اقدار پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جب اِن کی بیوی وفات پا گئیں تو اُنھوں نے بچوں کو ماں کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔ اُن کا ہر دُکھ سکھ بانٹا۔

بقول ناہید قاسمی:

''امی جی کی وفات کے فوراً بعد ہی میری چھوٹی بہن نشاط بھی اللہ کو پیاری ہوگئی۔ اس وقت صرف اباجی ہی تھے جو میری ماں بھی تھے، بہن بھی۔ جن کے ساتھ میں اپنا ہر دُکھ سکھ کر سکتی تھی۔ اب ان کے جانے کے بعد احساس ہوا ہے کہ جیسے ماں بھی اِن کے ساتھ ہی فوت ہوگئی ہے۔ جب کہ امی جی کے بعد اباجی نے ہمارا ماں سے بڑھ کر خیال رکھا۔ میرے ساتھ تو اتنی محبت کرتے تھے کہ میں ابھی آدھی بات ہی کہہ پاتی تھی اور وہ ساری کی ساری سمجھ لیتے تھے۔'' ۷۸

ندیمؔ کی اولاد اِن سے تعلق اور رشتے کو فخر سے دیکھتی ہے اور اسے اپنی خوش قسمتی گردانتی ہے۔ ندیمؔ نہ صرف اپنی اولاد کے لیے شفیق باپ تھے بلکہ اپنے داماد اور بہو کے ساتھ بھی اُن کا رویہ باپ جیسا ہی تھا۔

راقم الحروف کو ندیمؔ کے داماد محمد حیات قاسمی (ایڈووکیٹ) بتاتے ہیں:

''وہ میرے والد کے کزن تھے۔ انہی کی خواہش پر میری شادی ہوئی۔ اُنھوں نے ہمیشہ میرے ساتھ محبت اور شفقت کا سلوک کیا۔ یہاں تک کہ عید وغیرہ کے موقع پر وہ اپنے بچوں نواسے نواسیوں کے ساتھ مجھے بھی عیدی دیا کرتے تھے۔'' ۷۹

ندیمؔ کی بہو شاہین نعمان قاسمی شادی کے بعد جب اِن کے گھر آئیں تو انہیں ندیمؔ کے محبت بھرے رویے کی وجہ سے کوئی خاص تبدیلی کا احساس نہیں ہوا۔ ندیمؔ کے متعلق شاہین نعمان بتاتی ہیں:

''میں اپنے آپ کو ایک خوش قسمت عورت کی نظر سے دیکھتی ہوں کیوں کہ میں ندیمؔ صاحب کی بہو کے ساتھ ساتھ اِن کی بیٹی بھی ہوں۔ اِس بات کا اظہار ندیمؔ صاحب نے کئی بار کیا۔ جب بھی کوئی میرا تعارف پوچھتا تو وہ مجھے بیٹی کہہ کر متعارف کرواتے۔'' ۸۰

ندیمؔ کی نواسی نفیسہ قاسمی، ندیمؔ کے خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے خود کو خوش قسمت سمجھتی ہیں۔

راقم الحروف کو نفیسہ بتاتی ہیں:

''مَیں اپنے آپ کو بے حد خوش قسمت سمجھتی ہوں کہ میرا تعلق احمد ندیمؔ قاسمی کے خاندان سے ہے۔ وہ فن کار بھی بہت اچھے تھے اور انسان بھی بہت عمدہ۔ وہ دوسروں بالخصوص آرٹسٹوں کے قدر شناس تھے۔ اُن میں جرأت، برداشت اور اُمید بہت تھی۔'' ۸۱

ندیمؔ کو اپنے اکلوتے بھانجے ظہیر بابر سے بے حد محبت تھی۔ اُنھوں نے منہ بولے رشتوں کو بھی پورے خلوص سے نبھایا۔ پروین شاکر سے ندیمؔ کو خصوصی لگاؤ تھا اور اِس کو اپنی بیٹیوں کی طرح چاہتے تھے۔ ندیمؔ نے پروین شاکر کی ذہنی تربیت، شاعرانہ صلاحیتوں اور ادبی توانائیوں کو شروع میں پرکھ لیا تھا اور ان صلاحیتوں کی ادبی نشوونما میں بھرپور مدد کی۔ پروین شاکر کی طرح ندیمؔ، منصورہ احمد کو بھی اپنی بیٹی مانتے تھے۔ اِن کی محبت کا اندازہ اِن کے مجموعہ کلام ''دوام'' سے ہوتا ہے۔ جس کا انتساب اُنھوں نے اپنی بیوی، بچوں کے علاوہ پروین شاکر اور منصورہ احمد کے نام یوں کیا ہے:

میری دو اور بیٹیاں ہیں جنہیں
منتخب میرے قلب و جاں نے کیا
میری اولاد کی طرح
ایک پروین ایک منصورہ ۸۲

ندیمؔ نے منصورہ کی ادبی اور ذہنی نشوونما میں پوری توجہ سے رہنمائی کی۔ اِن کو منہ بولی بیٹی بنایا تو آخری سانس تک باپ کی شفقت کا سلوک کیا۔

ندیمؔ نے ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کو بہنیں کہا اور پھر زندگی بھر اِن سے سگے بھائیوں کی طرح حسنِ سلوک کرتے رہے۔ ندیمؔ نے جب بھی کسی کو بہن یا بیٹی کہا، اُس تعلق کو ہمیشہ نبھایا۔ ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کے ناموں سے پہلے ''بہن'' کا لفظ ضرور لگاتے تھے اور پھر اِس لفظ کا پورا احترام بھی کرتے تھے۔

منہ بولے رشتوں کے ساتھ ندیمؔ کے غیر معمولی برتاؤ کرنے کے سلسلے میں فریدہ حفیظ بتاتی ہیں کہ:

''نسبت روڈ پر جس گھر میں قاسمی صاحب مدتوں رہے اِس کے پڑوس میں مَیں بھی رہتی تھی۔ ہاجرہ آپا اور خدیجہ آپا کو بہنیں کہا تو خود اُن کا اور اُن کے سارے خاندان والدہ، بہنیں اور بھائیوں کا خیال رکھ کر بھائی ہونے کا عملی مظاہرہ کیا تھا۔ میں نے وہ

کمرہ اور صحن بھی دیکھا جہاں قاسمی صاحب اور اُن کے بیوی بچوں نے زندگی کے کئی
سال گزارے۔ یہ کمرہ دیکھ کر ہی قاسمی صاحب کے صبر و استقلال، ہمت اور درویشانہ
طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔'' ۸۳ ؎

ندیمؔ شخصی اور ذاتی تعلقات کا ہمیشہ احترام کرتے، عورت کو خاص طور پر عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔
بقول ناہید قاسمی:

''میں نے اب تک کی زندگی میں کسی شخص کو عورت کا اس طرح کا نفیس احترام کرتے
ہوئے نہیں دیکھا جیسا قاسمی صاحب کرتے تھے۔۔۔ انہیں عورتوں پر لگائی گئی مردوں کی
خودغرضانہ پابندیاں پسند نہیں تھیں۔'' ۸۴ ؎

ندیمؔ خود کو انسانی برادری کا فرد سمجھتے تھے اور سب انسانوں کو اپنے خاندان کی طرح عزیز رکھتے تھے۔
ندیمؔ جس کا معنی ہی ''دوست'' ہے۔ اپنے دوستوں سے ٹوٹ کر پیار کرتے۔ ندیمؔ ایسا شجرِ سایہ دار تھے جس نے خود تو
زندگی کی کڑی دھوپ کھائی مگر اپنے دوستوں پر آنچ نہ آنے دی۔ شمع کی طرح خود جلے مگر اپنی محبت کی چھاؤں سے
کسی کو محروم نہ کیا۔ اِن کی دوستوں سے یہی محبت ہی تھی جس کی وجہ سے اُنھوں نے منٹو سے شراب ترک کرنے اور
زندگی ڈھنگ سے بسر کرنے کے لیے کہا۔ جس کا اظہار ''منٹو کے خطوط'' جو ندیمؔ کے نام ہیں، اِن سے ہوتا ہے۔
اس پر کئی بار ندیمؔ کو سخت جملے بھی سننے پڑتے۔ منٹو، ندیمؔ سے کہا کرتے تھے:

''میں نے تمہیں اپنے ضمیر کا امام مقرر نہیں کیا۔'' ۸۵ ؎

ایسے زہر میں بجھے ہوئے جملے سن کر بھی ندیمؔ نے منٹو جیسے دوست سے دوستی نبھائی۔ یہ اُن کی دوستی ہی تھی جس نے
منٹو کو اُس کی خامیوں سے دُور کر کے ایک اچھا انسان بنانے کی کوشش کی تھی۔ اگرچہ وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے
لیکن ندیمؔ کی منٹو سے محبت میں ہمیشہ اضافہ ہی ہوا۔ یہ حسد، کینہ اور تکبر جیسی برائیوں سے کوسوں دُور تھے۔

احمد شفیع اِن کی دوستانہ طبیعت کے متعلق ایک واقعہ بیان کرتے ہیں:

''۱۹۴۹ء میں مَیں راول پنڈی میں بطور اے۔ڈی۔ایم تعینات تھا۔ مسٹر ہادی حسن
سی،ایس۔پی کمشنر تھے۔ وہ شاعر تھے اور شاعر پرور بھی۔ ایک مشاعرہ کرایا گیا جس میں
شرکت کے لیے احمد ندیمؔ قاسمی بھی آئے۔ وہ بھی کمشنر صاحب کے مہمان تھے، ان
شاعروں نے بشمول احمد ندیمؔ قاسمی اِن کے ہاں کھانا کھایا اور جب میں نے عرض کیا

کہ میرے یہاں بھی چائے کا پیالہ پی لو، تو ''احمد بھائی'' نے انکار کر دیا۔ آخر مانا مگر بہت اصرار کے بعد مانا۔ میں نے اِس کی منطق کا یہ جواب دیا کہ جب وہ اور دوسرے ترقی پسند شعرا کمشنر صاحب کے ہاں کھا سکتے ہیں تو ایک اے۔ڈی۔ایم کے ہاں بھی چائے نوش کر سکتے ہیں مگر اِس کا استدلال یہ تھا کہ چھوٹوں کا احتساب کیا جاتا ہے۔ بڑوں کو کون پوچھتا ہے۔ بہرحال یہ ہے احمد ندیم قاسمی بحیثیت ایک دوست کہ اپنے سینے پر پتھر رکھ کر ایک افسر کو ''ایک غلط قسم کے شاعر و ادیب'' سے بچانے میں لگا رہا کہ کہیں اس کا قرب اِس کے افسر دوست کے لیے باعث آزار نہ بن جائے۔'' ۸۶

ندیم نے کبھی بھی کسی سے ایسا رویہ نہ برتا کہ اُس کی خوشبو کو اپنے قبضہ میں کر لیں یا کسی بھی روشنی سے کوئی کرن چھین کر اپنے پاس رکھ لیں۔ ان کے دوستانہ رویے نے ہمیشہ اِن آنسوؤں اور خوشبوؤں کو سہارا دیا۔ ندیم کئی مرتبہ اپنے دوستوں کی پریشانیوں پر آنسوؤں سے روتے تھے۔ اِن کے دُکھوں کو اپنا دُکھ سمجھتے تھے۔ ان سے تخلیق فن کے علاوہ الگ ہونا پسند نہ کرتے۔ ندیم حساس دل رکھنے والا شاعر تھا۔ ان کو زندگی میں دُکھوں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس وقت ان کا واحد سہارا اُن کے دوست تھے۔ اپنی تکلیفوں کا مداوا اپنے دوستوں میں تلاش کیا۔

ندیم جو قلب و نظر کی لامحدود وسعت کے قائل تھے، دوسروں پر جلد اعتماد کر لیتے اور اِن کا ذکر اپنائیت سے کرتے۔ اگر کسی سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تو معاف کرنے میں جلدی کرتے، جس کی وجہ سے انہیں دھوکے اور فریب کا سامنا کرنا پڑتا۔ شاہین نعمان قاسمی راقم الحروف کو لکھے گئے خط میں بتاتی ہیں:

''ندیم صاحب بہت بڑے انسان تھے۔ ہر طرح سے ایک مکمل انسان۔ بہت زیادہ صبر کرنے والے۔ انسان سے محبت کرنے والے اور غلطی معاف کر دینے والے۔'' ۸۷

ندیم ایک شفیق، خوش مزاج انسان اور بہترین دوست تھے۔ اِن کے متعلق اِن کے نواسے نیر حیات قاسمی بتاتے ہیں:

''بابا، ایک انتہائی پُر امید، با اصول، خوش مزاج اور شفیق انسان تھے۔ اُن کی تخلیقات کا نمایاں موضوع انسان کا ذکر رہا ہے۔ اسی طرح وہ اپنی نجی زندگی میں بذاتِ خود ایک قابلِ رشک شخصیت تھے۔ لفظ انسان کی اگر حقیقی اور عملی تصویر دیکھنی ہو تو بابا گو ۱۰۰٪ نہیں تو ۹۹.۹۹٪ ضرور تھے۔'' ۸۸

ندیم کے دوست محمد خالد اختر رقم طراز ہے:

''ندیم حد درجہ مخلص ہونے کی وجہ سے ہر ایک کو بت پرستی کی حد تک پوجنے لگتا اور آسانی سے متاثر ہو جاتا۔ اس نے ہمیشہ زندگی میں شدید جذباتی دوستیاں بنانے کی کوشش کی ہے۔'' ۵۹

منصورہ احمد، ندیم کی کچھ کمیوں کا ذکر اِس طرح کرتی ہیں:

سُنو بابا!
تمہارے پاس سب سکے پرانے ہیں
نئے بازار میں اِن کی کوئی قیمت نہیں

....

تمہارا دوش یہ ہے، تم ابھی تک
حُسن کی تخلیق کو کافی سمجھتے ہو

....

سنو! یہ لمحہ تردید ہے
دورِ نفی ہے
اِس کے کچھ آداب تو سیکھو

....

نیا دستور یہ بھی ہے
کہ ایوانوں کی پیچیدہ گزرگاہوں کے چکر کاٹتے
سیارہ بن جاؤ
انا کو دان کر کے، جنتِ ارضی خریدو

....

یہ سب اعزاز ہیں صد چہرگی کے
تمہارا مسئلہ ہے
ایک چہرہ لے کے پھرتے ہو
غریبِ شہر بن کے جی رہے ہو
۔۔۔تمہیں اصرار ہے سکے پرانے ساتھ رکھنے پر؟
تو پھر آنسو تو پونچھو

....

جنھیں تم اس تڑپ سے یاد کرتے ہو
وہ سارے اگلی منزل کے مسافر تھے
تمہارے پاس دم بھر کو رُکے تھے
تم اسی کو زندگی کی انتہا سمجھے
ابھی تک اِن کے قدموں کی
اُڑائی گرد میں بیٹھے ہو!

(نظم ''منو بابا'') ۹۰

ندیم سے کچھ نادانیاں ہوئیں لیکن ان کے نزدیک اگر یہ سرزد نہ ہوتیں تو بحیثیت انسان اِن کی تکمیل نہ ہوسکتی۔

ندیم دوستوں کے معاملے میں صاف گوئی سے کام لیتے تھے جو اِن کے دل میں ہوتا وہی زبان پر لاتے تھے۔ اِس سے اِن کی شخصیت کا یہ پہلو سامنے آتا ہے کہ منافقت سے کوسوں دُور تھے۔ اپنی اِسی عادت کی وجہ سے فیض سے بھی رنجیدہ ہوئے جو کہ اِن کی شاعرانہ حیثیت کے منکر تھے اور ایسا وہ ارادتاً کرتے تھے۔ جمیل یوسف لکھتے ہیں:

''فیض صاحب نے افروایشیائی ایڈیٹرز کانفرنس کے موقع پر ماسکو میں ندیم صاحب کا تعارف بطور ایڈیٹر کرایا تو اِس پر ندیم صاحب کو بجا طور پر دُکھ ہوا۔ فیض صاحب جیسے اور ہم کار سے انہیں اس کی توقع نہ تھی۔ وہ فیض صاحب کی اس بے رُخی کا گلہ کرتے رہے۔'' ۹۱

ندیم اپنی صاف گوئی کے وصف کی وجہ سے غیبت کے مرتکب نہ ہوئے اور جو کچھ محسوس کیا اُسے بلا جھجک زبان پر لے آئے۔ ندیم نے فیض کا سوانحی خاکہ لکھا تو ترقی پسند کے ایک حلقے میں بھونچال آ گیا۔ ترقی پسند جو خود انسان کی آزادیٔ رائے کا حق مانگتے تھے، پھر اُسی پر اعتراض کرنے لگے لیکن مشفق خواجہ صاحب ایک خط میں لکھتے ہیں:

''معاصر میں فیض صاحب پر آپ کا خاکہ پڑھا۔ فیض صاحب کے بارے میں شاید ہی کوئی مضمون ہو جو میری نظر سے نہ گزرا ہو۔ میں نے ایسا متوازن اور خوب صورت شخصی خاکہ کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔ آپ نے پہلی مرتبہ فیض صاحب کو ایک انسان کی حیثیت سے دیکھا اور دکھایا ہے۔'' ۹۲

ندیم جو کہ ہم درد اور اختلاف نہ رکھنے والے انسان تھے لیکن اِن کے مخالفین کا ایک حلقہ موجود رہتا تھا۔ ترقی پسندوں میں جب انتہا پسندی آ گئی تو ندیم کا یہ مزاج ہی نہیں تھا کہ وہ اِن انتہا پسندوں کے ساتھ چل سکیں، کیوں کہ ترقی پسندی میں سیاست بھی شامل ہوگئی تھی۔ اِس طرح اس انجمن کے دو حصے بن گئے تھے۔ ایک چین کی ہم نوا اور دوسری سوویت یونین کی ہم نوا تھی۔ ندیم چین کی حامی انجمن کے ساتھ تھے اور فیض سوویت یونین کے حامی۔

ندیم ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد سوویت یونین کا ساتھ نہیں دینا چاہتے تھے اور ان سے سخت ناراض تھے لیکن ندیم ذاتی طور پر گروپ بندی کے قائل نہ تھے۔ ندیم نے ایسے لوگوں سے بھی دوستیاں کیں جن کے نظریات اِن سے الگ تھے۔ اُنھوں نے اپنے ذاتی رسالے ''فنون'' میں بھی اُن کی تخلیقات کو شامل کیا جو اُن کے معیار کے مطابق تھیں لیکن اِس کے باوجود اِن پر الزام لگائے گئے۔ ندیم نے اِن کی نفی کی۔ لیکن ادبی دنیا میں اِس غلط فہمی کو حقیقت کا رنگ دیا گیا اور اِن کے اور وزیر آغا کے درمیان اختلافات کو ندیم کی گروہ بندی کا نام دیا۔ ندیم نے اِس کی وضاحت ''فنون'' کے اداریہ میں کی اور کہا:

> ''مجھے ہمیشہ اپنے کام سے کام رہا ہے۔ میرے پاس جماعت سازیوں اور حلقہ بندیوں کا وقت بھی نہیں ہے اور اتنا روپیہ نہیں ہے کہ کسی گروہ یا کسی فرد کو خرید سکوں۔ پھر مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ زندگی کی مہلت کو کشیدگیوں اور دشمنیوں میں ضائع کرتا پھروں۔'' ۹۳

ندیم نے یہ بھی کہا ہے:

> ''دراصل احساسِ کمتری کی طرح منافقت نے بھی بعض اچھے خاصے شاداب ذہنوں کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ بہرحال آج کے شعر و ادب کی صورتِ حال انتہائی تشویشناک ہے اور ادب کے ماحول کو مزید آلودہ ہونے سے بچانے کی سعی کرنا ہر ایمان دار اہلِ قلم پر فرض ہے۔'' ۹۴

ندیم سچائی کے قائل تھے اور ہمیشہ سچ کا ساتھ دیا۔ کسی سے ذاتی اختلاف نہ رکھتے تھے لیکن نظریاتی اختلاف انہیں ضرور ہوتا تھا اور وہاں یہ سختی سے ڈٹ جاتے اور کسی صورت بھی سمجھوتہ نہ کرتے۔ لیکن کچھ لوگ اِن کے نظریاتی اختلاف کو ذاتی رنجش اور دشمنی کا نام دیتے اور ذاتیات پر اُتر آتے۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہیں:

"اُنھوں نے دُکھ اور ابتلا کو خود اپنی جان پر جھیل کر جانا تھا۔ اُن کی ذات سے وابستگیاں بڑی گہری اور شدید رہیں۔ ہر بڑے آدمی کی طرح انہیں بھی مخالفت، دشمنی، حسد اور بغض کے رنج سہنا پڑے۔" ۹۵

ندیمؔ کی جرأت اور بے باکی کا یہ عالم تھا کہ اُنھوں نے کبھی کسی جابر حکمران کے سامنے سر نہ جھکایا، چاہے انہیں کتنے ہی مصائب کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑا۔ اِن کے نزدیک جھوٹ کو صدیوں سے تقدیس کا درجہ نہیں ملا۔ تقدیس ہمیشہ سچ کو ہی حاصل رہی۔ ندیمؔ کو جب قید کیا گیا اور وہ قید خانے میں پہلی رات گزار رہے تھے۔ اُس بے سروسامانی کے متعلق حمید اختر رقم طراز ہیں:

"کسی کے پاس بھی تکیہ نہیں تھا مگر مجھے بار بار ندیمؔ کا خیال آتا تھا جو میرے ساتھ کی کوٹھڑی میں بغیر تکیہ کے لیٹا ہوا تھا جس نے اپنی جوانی، اپنی عمر کا بہترین حصہ، اپنا گھر اور سب کچھ فن کی نذر کر دیا تھا۔ اِس حقیقت سے کیسے انکار ہوسکتا ہے کہ اِس نسل کے ادیبوں میں بہت کم ندیمؔ کا مقابلہ کر سکتے تھے۔۔۔ یہی چھوٹے اور بڑے، جھوٹے اور سچے فن کار کا فرق ہے اور اِسی سچائی اور صداقت کے لیے آج وہ زمین پر لیٹا ہوا تھا۔" ۹۶

ندیمؔ مشکلات کے خلاف زندگی بھر لڑتے رہے لیکن کبھی مایوس نہ ہوئے کیوں کہ قنوطیت اُنہیں چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ رجائیت اور مضبوط قوتِ ارادی کے بل بوتے پر ہی اُنھوں نے ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔

بقول الطاف حسن قریشی:

"انہیں ہر طرح کے جبر و استحصال سے شدید نفرت اور اِس سے ٹکرا جانے کی ایک زبردست قوتِ ارادی اِن کے رگ و پے میں سرایت کی ہوئی تھی۔" ۹۷

ندیمؔ جو کہ انسانوں سے بے حد پیار کرتے تھے کیوں کہ وہ انسانوں سے محبت کو سب سے بڑی عبادت گردانتے تھے۔ اُنھوں نے کبھی کسی انسان کو چھوٹا نہ سمجھا۔ کسی بھی انسان کے دُکھ کا ایک لمحہ اُنہیں پریشان کر دینے کے لیے کافی ہوتا تھا۔ دوسروں کے دُکھ درد کو ہمیشہ اپنا دُکھ سمجھتے تھے۔ انسان اور انسانیت سے محبت ان کی زندگی کا مشن تھا۔ ہمیشہ انسانیت کی اعلیٰ اقدار کے فروغ کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ انہیں انسانوں کے بے وقار ہونے کا

بڑا دُکھ تھا۔

بقول امجد اسلام امجد:

''وہ انسان کی عظمت کے بہت بڑے علم بردار تھے اور ''انسان عظیم ہے'' کا نعرہ تمام عمر لفظ بدل بدل کر لگاتے رہے۔'' ۹۸

ندیمؔ کی انسان سے یہی محبت ہی تھی جس کی وجہ سے وہ عام آدمیوں کے ساتھ وقت گزارنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ کبھی کسی کی حق تلفی نہ ہونے دی۔ اِن کی یہ عادت تھی کہ اِس انسان کو محبت و احترام سے مخاطب کرتے تھے۔ ندیمؔ اپنے ملازم کے ساتھ بھی پیار سے بات کرتے۔

ندیمؔ کے دفتر کے ایک کارکن محمد امجد کا کہنا ہے:

''یہ اُن کی عادت تھی کہ وہ ہر چھوٹے بڑے کو ''صاحب'' کے لاحقے کے ساتھ بلاتے تھے۔ دراصل قاسمی صاحب ملازم کو سب سے پہلے انسان سمجھتے تھے اور ''انسان عظیم ہے خدایا'' اُن کا فلسفۂ حیات تھا اور یہی اُن کی زندگی کا اصل نچوڑ تھا۔ وہ ملازم کی غلطی پر کبھی اُسے ڈانٹتے نہ تھے بلکہ بڑے پیار سے سمجھا دیتے تھے۔'' ۹۹

ندیمؔ کی شخصیت کا نمایاں وصف اِن کی شفقت ہے۔ بنیادی طور پر ندیمؔ سراپا محبت تھے۔ اِن کی محبت اور شفقت سے ہر شخص فیض یاب ہوسکتا تھا۔ کیوں کہ یہ محبت کے خمیر سے تشکیل پذیر ہوئے تھے۔ اِن کی اسی شفقت اور محبت کی مثال امجد اسلام امجد روزنامہ جنگ، کراچی کے مڈویک میگزین میں اختر سعیدی کو انٹرویو دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۱۹۶۵ء کی جنگ کے حوالے سے ہمارے کالج میں ایک مشاعرہ ہوا۔ وہاں میں نے بھی ایک نظم پڑھی۔ احمد ندیمؔ قاسمی اُس وقت بھی احمد ندیمؔ قاسمی تھے۔۔۔ مشاعرے کے اختتام پر جب قاسمی صاحب واپس جانے لگے تو میں احتراماً ایک طرف کھڑا ہوگیا تاکہ وہ گزر جائیں۔ قاسمی صاحب مجھے دیکھ کر میرے قریب آئے۔ اُنھوں نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگے: ''میرا نام احمد ندیمؔ قاسمی ہے۔'' میں نے کہا کہ جناب میں آپ کو پہچانتا ہوں اور آپ کا مداح ہوں تو وہ گویا ہوئے: ''میں ایک رسالہ نکالتا ہوں ''فنون''۔ کیا آپ اپنی نظم مجھے اِس کے لیے عنایت کر سکتے ہیں؟'' میں قاسمی صاحب

کا جملہ آج تک بھول نہیں سکا۔۔۔ اُنھوں نے مجھ سے جس محبت اور شفقت کا اظہار کیا، اُس نے میرا رویہ تبدیل کرنے میں اہم کردار عطا کیا۔۔۔ یہ واقعہ میرے لیے یادگار اور مشعلِ راہ ہے۔ جب بھی کوئی جونیئر مجھ سے ملنے کی کوشش کرتا ہے تو میری ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ میں اس سے پیار اور شفقت سے پیش آؤں۔ یہ قاسمی صاحب کی دین ہے۔'' ۱۰۰؎

ندیم، نئے لکھنے والوں سے محبت اپنا فرض سمجھتے تھے اور اُس فرض کو خوشی سے ادا کرتے تھے۔ چھوٹے یا نئے لکھنے والے ادیبوں کو نظر انداز نہ کرتے بلکہ اِن کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ راقم الحروف کو انٹرویو دیتے ہوئے ندیم کے بارے میں منصورہ احمد بتاتی ہیں:

''بابا کو نئی نسل میں کوئی جوہر نظر آیا تو وہ اُس کی بہت قدر کرتے تھے۔ کیوں کہ وہ اُنہیں قوم کا مستقبل سمجھتے تھے۔'' ۱۰۱؎

بعض اوقات مشاعروں میں ایسا ہوتا کہ وقت کی کمی کی وجہ سے مقامی شاعروں کو نہ پڑھانے کا فیصلہ ہوتا تو ندیم خود دست بردار ہو جاتے کیوں کہ ان کے نزدیک مقامی شاعر ہی تو ادب کو زندہ رکھتے ہیں۔

ندیم کے اِسی وصف کے بارے میں غلام نبی خیال رقم طراز ہیں:

''قاسمی صاحب میں، مَیں نے ایک خاص صفت موجود پائی کہ وہ برصغیر کے سب سے بڑے ادیب اور شاعر ہونے کے باوجود کسی دوسرے پر اپنے آپ کو Impose نہیں کرتے بلکہ وہ دوسروں کی گوش بر آواز ہو کر سنتے ہیں اور انہیں یہ احساس دلاتے ہیں کہ آپ خود بھی کسی سے کمتر نہیں۔ آج کل ہمارے بزرگ ادیبوں اور شاعروں میں یہ انسانی وصف ناپید ہے۔'' ۱۰۲؎

ندیم شجر سایہ دار تھے جو دوسروں کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیتے تھے۔ اُنھوں نے لوگوں کی کتابوں کے دیباچے اور فلیپ لکھنے میں تو کبھی انکار نہ کیا۔

ندیم جو کہ اونچا سنتے تھے، اس لیے اکثر نگاہوں کے ذریعے اندازہ کرتے تھے کہ کیا بات ہو رہی ہے اور مسکراتے رہتے تھے۔ صائمہ اسماء لکھتی ہیں:

''اُونچا سننے کے باعث ہر بات میں شریک تو نہ ہو سکتے، مگر تاثرات ایسے ہوتے گویا دیکھ کر سب سمجھ رہے ہیں کہ کیا بات ہو رہی ہے۔'' ۱۰۳؎

ندیمؔ جنھوں نے عوام کی نمائندگی کی۔ اِن کے دُکھ سکھ، جذبات و احساسات کو اپنے افسانے، نظم، غزل، کالم ہر جگہ بیان کیا اور ان کی ترجمانی کی اور اپنے فن کے ذریعے ان سے اپنا رشتہ بنائے رکھا۔ اِسی رشتے کے سبب انہیں ''بابائے اُردو ادب'' کہا گیا۔ ندیمؔ کو ''بابا'' سب سے پہلے اُن کی پہلی نواسی نوشین نے ۱۹۷۵ء میں اور پہلے نواسے نیر نے ۱۹۷۸ء میں کہنا شروع کیا لیکن اِس کے بعد اوروں نے بھی اُن کو اِن کے خلوص اور شفقت کی وجہ سے اِس نام سے پکارا۔ ندیمؔ کہتے ہیں:

؎ یہی میرا ادب ہے اور یہی میری سیاست ہے
مرے جمہور ہی سے میری فن کاری عبارت ہے ۱۰۴؎

ندیمؔ کی شخصیت کا ایک دل نواز پہلو یہ بھی تھا کہ وہ نادار اور غریب ادیبوں کی مدد کرتے تھے۔ اِن کو جو معاوضہ منتظمین کی طرف سے ملتا تھا، اُس کو وہ نادار اور ضرورت مند ادیبوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ شکیب جلالی غزل گو شاعر نے جب خودکشی کر لی تو اِس کی بیوہ اور بچوں کی امداد کے لیے اُنھوں نے لالہ موسیٰ کے ایک سینما ہال میں بڑا مشاعرہ منعقد کیا اور اِس سے جو رقم حاصل ہوئی، اُس کی بیوہ کو بھجوا دی۔ اسی طرح شاعر تنویر نقوی بھی فالج میں مبتلا رہنے کے بعد چل بسا تو اِس کی بیوہ کے لیے بھی رقم کا بندوبست کیا اور رقم بھجوائی۔

ندیمؔ، جس کی شخصیت محبت سے بھرپور تھی۔ کسی کو تکلیف میں دیکھتے تو جہاں تک اُن سے ہوتا، اُس کی مدد کرتے تھے۔ ہمیشہ ضرورت مندوں کے کام آتے۔ ندیمؔ کہتے ہیں:

؎ محبت میں تو غم بھی نفع ہے، دُکھ بھی کمائی ہے
محبت میں کبھی گنتی نہیں ہوتی خساروں کی ۱۰۵؎

ندیمؔ کو جب بھی کسی نے کوئی کام بتایا، اُنھوں نے اِس کے لیے مخلصانہ کوشش کی۔

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی ایک واقعہ بتاتے ہیں:

''کراچی کا ایک شخص جو خاصا اچھا مصور تھا، لاہور میں کوئی چھوٹی موٹی ملازمت کرتا تھا۔ ایک دن وہ اپنی پینٹنگ لے کر قاسمی صاحب کے پاس آیا اور کہا کہ میری والدہ سخت علیل ہیں اور میری جیب خالی ہے۔ اگر اِس تصویر کے پانچ سو روپے مل جائیں تو میری مشکل آسان ہو جائے گی۔ یہ کہتے ہوئے اِس بھلے مانس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ قاسمی صاحب نہایت غیور واقع ہوئے تھے۔ لیکن جب کسی غریب کا کام ہوتا تو سب کچھ

بھول جاتے تھے، چناں چہ اس سے تصویر لے لی اور اگلے روز آنے کو کہا۔ اس کے جانے
کے بعد اپنی تمام مصروفیات چھوڑ کر تصویر اُٹھائی اور سیدھے سعید سہگل کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔
موصوف نے بڑی آؤ بھگت کی لیکن تصویر خریدنے سے معذرت کر دی۔ یہ وہاں سے
نکل کر میاں ممتاز دولتانہ کے ہاں پہنچے۔ اُنھوں نے بھی بڑی خاطر کی۔ یہ حرف مطلب
زبان پر لائے البتہ قیمت کا تذکرہ نہیں کیا کہ یہاں سے بھی مایوسی نہ ہو۔ خیال تھا کہ
جو کچھ بھی ملے گا اس میں اپنے پاس سے رقم ملا کر اِس شخص کی ضرورت پوری کر دوں گا۔
دولتانہ صاحب نے تصویر پسند کی اور اپنے ملازم کو بلا کر ڈرائینگ روم میں آویزاں کرنے
کو کہا۔ پھر اُٹھ کر گئے اور ایک ہزار روپیہ لا کر ندیم صاحب کو پیش کر دیا۔ اگلے روز جب
تصویر کا مالک آیا اور اُنھوں نے اس کی توقع سے دوگنا رقم اِسے دی تو اس کی آنکھوں سے
مسرت کے آنسو جاری ہو گئے۔'' ۱۰۶

ندیم کا حافظہ بہت اچھا تھا۔ اِس لیے جو پڑھ لیتے، ذہن میں رہ جاتا۔ ایک بار کسی سے مل لیتے تو اُن کو ہمیشہ یاد رہ جاتا۔ انہیں ۱۹۳۵ء کے زمانے کے خانیوال کے بے شمار دینی، سماجی، ادبی اور مذہبی شخصیات یاد تھیں۔ اِن کا تذکرہ اِس طرح کرتے جیسے کل پرسوں کی بات ہو۔ ندیم اپنے قابلِ رشک حافظے کی وجہ سے اپنے عہد کی چلتی پھرتی تاریخ تھے۔

ندیم جب بھی کسی تقریب میں شریک ہوتے، چاہے وہ چھوٹی سے چھوٹی تقریب کیوں نہ ہو، وہ ہمیشہ خطاب کرتے تھے اور خطاب بھی لکھ کر جاتے تھے۔ زبانی، دو، چار جملے نہ بولتے تھے۔

ندیم کی شخصیت پر رومان اور حسن کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ اِسی خصوصیت نے اِن کو حسن کی تلاش اور جستجو پر مجبور کیا اور اِن کے تخیل اور خیال نے اِن کو زندگی کو قریب سے دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

''ندیم زندگی اور اس کے مظاہر میں کھوئے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں حسنِ صفات
کا کرشمہ اِن کے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور وہ اس کی طرف کھنچتے بھی ہیں۔
یہاں تک کہ اِن کی شخصیت اِن میں جذب ہو جاتی ہے۔'' ۱۰۷

ندیم کی نہایت اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ محبِ وطن تھے۔ پاکستان اور پاکستان کی عوام سے اُن کو شدید

محبت تھی۔ اُنھوں نے اِسی محبت کی وجہ سے اِس وطن کے ہر ذرہ کو دیوتا نہیں سمجھا۔ ندیم اِس وطن میں شادمانی اور خوشحالی کے سورج کو چمکتا دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ اِس معاملے میں اُنھوں نے کسی سے کبھی بھی سمجھوتا نہیں کیا۔ ان کے نزدیک جو وطن سے محبت نہیں کرسکتا، وہ کسی سے محبت نہیں کرسکتا۔ ندیم کی پاکستان سے محبت کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ خود پاکستان ہوں۔

بقول ڈاکٹر صابر آفاقی:

''اپنی مٹی سے پیار قاسمی کے خمیر میں شامل تھا۔ حب الوطنی اس کے ایمان کا حصہ تھی۔'' ۱۰۸

ندیم کو اپنے پاکستانی ہونے پر فخر رہا۔ ندیم نہ صرف اپنے وطن سے محبت کرتے تھے بلکہ وہ وطن کی حفاظت کرنے پر بھی زور دیتے تھے۔ اِن کی شخصیت میں وطن کی محبت پوری طرح موجزن نظر آتی تھی۔ ان کی کتاب ''تہذیب وفن'' میں وطن کی محبت کو جس انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اِس حوالے سے عطاالحق قاسمی لکھتے ہیں:

''احمد ندیم قاسمی نے ''تہذیب وفن'' مضامین میں وطن کی محبت کو مجرد انداز میں پیش نہیں کیا بلکہ جہاں جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ اِن کی حفاظت پر زور دیا ہے، وہاں وہ کسی مقام پر بھی یہ نکتہ بھولنے نہیں پاتے کہ وطن کی محبت، عوام کے ساتھ محبت کا دوسرا نام ہے۔'' ۱۰۹

ندیم پر پاکستان دشمنی اور اسلام بیزاری کے الزامات بھی لگے، ان کو کمیونسٹ کہا گیا۔ ندیم جو کہ وطن کے وفادار تھے، اپنی اسلام دوستی اور پاکستان سے محبت کے تعلق اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کی تردید کرتے رہے اور کہتے رہے کہ یہ دھرتی میری ماں ہے، میں اِس ماں کو کیسے بھولوں، جس نے مجھے جنم دیا اور جس کے قدموں میں میری جنت ہے۔

ناہید قاسمی نے اپنی ایک نظم میں کہا ہے:

میرے شاعر، میرے ندیم!
جشنِ آزادی کی شب کو
تیری کتاب کا دِیا اُٹھائے
میں ماضی کی دھندلی وادی میں جا اُتری

اور پھر چونک اُٹھی

(آج سے پہلے یہ سب میں نے اتنا نمایاں کیوں نہیں دیکھا!)

ہر ایک مصرع میرے وطن پر بیتے لمحوں کا سچا اظہار لیے تھا

(دشتِ وفا کی پکار) ۱۱۰

ندیم تنہائی پسند نہ تھے۔ عمر کے آخری برس میں لوگ خلوت پسند ہو جاتے ہیں لیکن ندیم نے اپنی مجلسی زندگی کو برقرار رکھا۔ ندیم بعض اوقات خطوط لکھ کر یا ٹیلی فون کے ذریعے دوستوں کی محفل سجا لیتے لیکن عمر کے آخری سالوں میں اُن کا دوستوں سے ٹیلی فونک رابطہ کم ہونے لگا، جس کی وجہ اُن کی کم سماعت تھی جس سے ندیم اُلجھن کا شکار ہوتے اور اُداس ہو جاتے تھے۔ دراصل ندیم اپنے آپ میں خود ایک انجمن تھے۔

ندیم آخری عمر میں ایک خواہش رکھتے تھے کہ وہ اپنے گاؤں ''انگہ'' جائیں اور وہاں کے پُرسکون ماحول میں اپنی سوانح، ایک ناول اور ایک طویل نظم لکھیں لیکن ملک الموت نے اِن کو یہ مہلت نہ دی۔

حواشی

۱۔ منو بھائی، دیباچہ ''وادی سون سکیسر''، مصنف احمد غزالی، لاہور، فیروز سنز لمیٹڈ، ۱۹۹۳ء، ص ۲۰

۲۔ احمد ندیم قاسمی، ''تمہید جلال و جمال''، اساطیر، لاہور، چوتھیواں ایڈیشن، ۲۰۰۰ء، ص ۱۱،۱۰

۳۔ پیرزادہ محمد بخش، ''شاہ''، ''ندیم نامہ''، مرتب محمد طفیل اور بشیر موجد، ملتان، مجلس ارباب فن، ۱۹۷۶ء، ص ۷

۴۔ ایضاً، ص ۸

۵۔ گلزار جاوید، ''انٹرویو''، عالمی اُردو ادب، دہلی، ۱۹۹۶ء، ص ۴۷

۶۔ ناہید قاسمی، ''پاکستانی ادب کے معمار، احمد ندیم قاسمی، شخصیت اور فن''، اسلام آباد، اکادمی ادبیات، H-۸/۱، ۲۰۰۹ء، ص ۲۵،۲۴

۷۔ پیرزادہ محمد بخش، ''شاہ''، ''ندیم نامہ''، ص ۹

۸۔ ندیم اُپل، انٹرویو، ''مٹی کا سمندر''، ضیاء ساجد (مرتبہ)، لاہور، مکتبہ القریش، ۱۹۹۱ء، ص ۵۲۶

۹۔ احمد شفیع، ''میرا بھائی، میرا دوست''، ''ندیم نامہ''، ص ۸۱

۱۰۔ محمد طفیل، ''ندیم صاحب''، مشمولہ ''صاحب''، لاہور، ادارہ فروغ اردو، بار دوم ۱۹۶۴ء، ص ۵۴

۱۱۔ پیرزادہ محمد بخش، ''شاہ'' مشمولہ ''عبارت'' سہ ماہی، ندیم ایڈیشن، اکتوبر ۱۹۹۶ء تا مارچ ۱۹۹۷ء، حیدر آباد، ص ۴۷

۱۲۔ پیرزادہ محمد بخش، ''ندیم نامہ''، ص ۸

۱۳۔ احمد ندیم قاسمی، تمہید ''جلال و جمال''، ص ۱۲

۱۴۔ پیرزادہ محمد بخش، ''ندیم نامہ''، ص ۱۶

۱۵۔ احمد ندیم قاسمی، ''انٹرویو''، گلزار جاوید، عالمی اُردو ادب، دہلی، ص ۴۹،۴۸

۱۶۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۵۲۶

۱۷۔ ناہید قاسمی، ''پاکستانی ادب کے معمار، احمد ندیم قاسمی، شخصیت اور فن''، ص ۳۳

۱۸۔ ایضاً، ص ۳۴

۱۹۔ ایضاً، ص ۳۳

۲۰۔ احمد ندیم قاسمی، ''انٹرویو''، گلزار جاوید، عالمی اردو ادب، ص ۵۱،۵۰

۲۱۔ احمد ندیم قاسمی، تمہید "جلال و جمال"، ص ۱۵

۲۲۔ سعادت حسن منٹو، "ندیم کے نام خط"، منٹو کے خطوط ندیم کے نام"، راول پنڈی، کتاب نما، ۱۹۶۲ء، ص ۱۱، ۱۲

۲۳۔ احمد ندیم قاسمی، تمہید "جلال و جمال"، ص ۱۵، ۱۶

۲۴۔ پیرزادہ محمد بخش، "شاہ"، "ندیم نامہ"، ص ۲۲، ۲۳

۲۵۔ ہاجرہ مسرور، "ندیم اور غمِ روزگار"، "ندیم نامہ"، ص ۶۰

۲۶۔ احمد ندیم قاسمی، انٹرویو، خالد سہیل، "بیاض"، ندیم نمبر، نومبر ۲۰۰۶ء، ص ۲۶۱

۲۷۔ احمد ندیم قاسمی، "ندیم کی غزلیں"، ص ۳۳۷

۲۸۔ امیر حسین چمن، انٹرویو، نومبر ۱۹۹۹ء، "ملاقات و حکایات"، اسلام آباد، پرنٹ میڈیا پبلشرز، ۲۰۰۱ء، ص ۱۲۸

۲۹۔ ندیم اُپل، انٹرویو، "مٹی کا سمندر"، ضیاء ساجد (مرتبہ)، ص ۵۳۰

۳۰۔ وسیم شیخ، "سالگرہ جشن"، رسالہ "عبارت"، ندیم ایڈیشن، ۱۹۹۷ء، ص ۳۱

۳۱۔ احمد ندیم قاسمی، "چند یادیں"، عالمی اردو ادب، دہلی، ص ۲۵، ۲۶

۳۲۔ رؤف نیازی، تبصرہ "انوارِ جمال"، ماہنامہ "قومی زبان"، کراچی، مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۸۰

۳۳۔ احمد ندیم قاسمی، انٹرویو، امجد رؤف خان، ماہنامہ "سیارہ ڈائجسٹ"، لاہور، ص ۱۵

۳۴۔ احمد ندیم قاسمی، "انٹرویو"، گلزار جاوید، عالمی اردو ادب، ندیم نمبر، ص ۵۳، ۵۴

۳۵۔ ماخوذ، احمد عقیل روبی، "ندیم صاحب"، "عبارت"، ندیم نمبر، ص ۱۹۳

۳۶۔ قدرت اللہ شہاب، "شہاب نامہ"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۸۴۷

۳۷۔ ڈاکٹر عبدالغفار کوکب، "افکار ندیم نمبر سے ماخوذ، زندگی، شخصیت اور فن کا جائزہ"، ماہنامہ "ماہِ نو"، لاہور، جولائی ۲۰۰۷ء، ص ۱۶

۳۸۔ سہیل احمد، "شوبز"، روزنامہ "ایکسپریس"، ۱۲؍جولائی ۲۰۰۶ء۔

۳۹۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی، "احمد ندیم قاسمی کا سکرین پلے برائے آغا گل"، سہ ماہی "سورج"، لاہور، جون ۲۰۰۸ء، ص ۱۱۷

۴۰۔ افتخار عارف، "زندہ لفظ"، نیا "ندیم نامہ"، ڈاکٹر اسلم فرخی، وفاقی اردو یونی ورسٹی، کراچی، ۲۰۰۶ء، ص ۱۱۴، ۱۱۵

۴۱۔ نیوز پوسٹ انڈیا، بدھ، ۲؍اپریل ۲۰۰۸ء

۴۲۔ محمد حیات قاسمی ایڈووکیٹ کا بیان، "پاکستانی ادب کے معمار، احمد ندیم قاسمی، شخصیت اور فن"، ص ۱۷۲

۴۳۔ ڈاکٹر محمود ناصر ملک، ''ابھی ابھی انہی کنجوں میں''، ''پاکستانی ادب کے معمار، احمد ندیم قاسمی، شخصیت اور فن''، ص۱۸۸

۴۴۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی، ''پاکستانی ادب کے معمار، احمد ندیم قاسمی، شخصیت اور فن''، ص ۱۸۰، ۱۸۱

۴۵۔ ایضاً، ص۱۸۲، ۱۸۳

۴۶۔ امجد اسلام امجد، ''قاسمی صاحب''، ''نذرِ ندیم''، ''مونتاج''، سہ ماہی، لاہور، شمارہ۱، جنوری تا اپریل ۲۰۰۷ء، شمارہ۲، مئی تا اگست ۲۰۰۷ء، ص۳۹۶

۴۷۔ احمد ندیم قاسمی، ''حرفِ اوّل، ذاتی وضاحت''، ''فنون''، اگست ۲۰۰۴ء، ص۱۲

۴۸۔ پیرزادہ محمد بخش، ''شاہ'' مشمولہ ''عبارت''، سہ ماہی، ندیم ایڈیشن، اکتوبر ۱۹۹۶ء تا مارچ ۱۹۹۷ء، حیدر آباد، ص۷۰

۴۹۔ محمد خالد اختر، ''ایک دوست کا مرقع'' مشمولہ ''اُردو کے بہترین شخصی خاکے''، مبین مرزا (انتخاب و ترتیب)، جلد دوم، بار اوّل اکتوبر ۲۰۰۲ء، اسلام آباد، الحمرا پبلشنگ، ص۵۷۲

۵۰۔ مجتبیٰ حسین، ہفتہ وار ''سنڈے ٹائمز''، ۲/ اگست ۲۰۰۶ء

۵۱۔ اسلم کھوکھر، ''اوصاف''، ۱۲/ جولائی ۲۰۰۶ء

۵۲۔ مسعود اشعر، ''آخری ملاقات'' مشمولہ ''مونتاج''، شمارہ ۱، ۲، جنوری تا اگست ۲۰۰۷ء، ص۴۳

۵۳۔ افتخار مجاز، روزنامہ ''خبریں''، ۴/ اگست ۲۰۰۶ء

۵۴۔ احمد عقیل روبی، ''ندیم صاحب'' مشمولہ ''عبارت'' سہ ماہی، ندیم ایڈیشن، اکتوبر ۱۹۹۶ء تا مارچ ۱۹۹۷ء، حیدر آباد، ص۱۹۳

۵۵۔ محمد طفیل، ''ندیم صاحب'' مشمولہ ''صاحب''، ص۸۷

۵۶۔ احمد ندیم قاسمی، ''انٹرویو''، مشمولہ ''پس تحریر''، منور علی ملک، لاہور، پاک چیمبرز، ۵۔ ٹیمپل روڈ، بار اوّل ۱۹۹۳ء، ص۹۵

۵۷۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی، ''میرے اباجی'' مشمولہ ''عبارت''، حیدر آباد، ص۹۳

۵۸۔ محمد طفیل، ''صاحب''، ص۵۷

۵۹۔ احمد ندیم قاسمی، انٹرویو، ''پس تحریر''، ص۹۱

۶۰۔ مرزا ادیب، ''حکایت بود بے پایاں'' مشمولہ ''عبارت''، ص۸۶

۶۱۔ پیرزادہ محمد بخش، ''شاہ''، ''ندیم نامہ''، ص۳۵

۶۲۔ نعمان قاسمی، مکتوب بنام راقم الحروف، از سمن آباد، لاہور، محررہ ۱۵/ اگست ۲۰۱۰ء

۶۳۔ کرامت بخاری، ''ایک ذاتی تاثر''، ''بیاض''، ندیم نمبر، نومبر ۲۰۰۶ء، ص ۲۲۰

۶۴۔ محمد اظہار الحق، روزنامہ ''جنگ''، لاہور، ۱۴ر جولائی ۲۰۰۶ء

۶۵۔ مسرت لغاری، ''نوائے وقت''، ۲۷ر جولائی ۲۰۰۶ء

۶۶۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص ۵۹۳

۶۷۔ مسعود اشعر، ''آخری ملاقات'' مشمولہ ''مونتاج''، شمارہ ۱، ۲، جنوری تا اپریل ۲۰۰۷ء، مئی تا اگست ۲۰۰۷ء، ص ۵۰

۶۸۔ عطاالحق قاسمی، ''احمد ندیم قاسمی'' مشمولہ ''مزید گنجے فرشتے''، لاہور، چوک گڑھی شاہو، جولائی ۱۹۹۷ء، ص ۳۶

۶۹۔ محمد خالد اختر، ''ایک دوست کا مرقع'' مشمولہ ''اُردو کے بہترین شخصی خاکے''، اکتوبر ۲۰۰۲ء، ص ۵۷۳

۷۰۔ محمد خالد اختر، ''ایک آدمی، احمد شاہ نامی'' مشمولہ ''معاصر''، سہ ماہی، جلد ۷، ۸، شمارہ ۲، ۳، ۴، اپریل ۲۰۰۷ء تا مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۳۱، ۳۰

۷۱۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی، ''میرے ابا جی'' مشمولہ ''ندیم نامہ''، ص ۳۴

۷۲۔ احمد ندیم قاسمی، انتساب ۱۹۴۱ء، ''بگولے''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۵

۷۳۔ احمد ندیم قاسمی، نظم ''آخری فیصلہ''، ''ندیم کی نظمیں''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۶۸۳

۷۴۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم صاحب کے خطوط، بیگم اور بیٹی کے نام'' مشمولہ ''معاصر''، ص ۳۳۹

۷۵۔ رابعہ ندیم، انٹرویو، شہناز پروین سحر، مشمولہ ''نیا، ندیم نامہ''، ص ۱۷

۷۶۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی، ''میرے دوست، میرے ابا جی'' مشمولہ ''ادب سرائے''، خصوصی شمارہ احمد ندیم قاسمی، سہ ماہی، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷ء (انٹرنیشنل)، ص ۳۲

۷۷۔ راقم الحروف، استفسار از نعمان قاسمی، ۲۱۔ غالب کالونی، ندیم شہید روڈ، سمن آباد، لاہور، مورخہ ۳ر جون ۲۰۱۰ء

۷۸۔ راقم الحروف، استفسار از ڈاکٹر ناہید قاسمی، مورخہ ۱۵ر جولائی ۲۰۱۰ء

۷۹۔ راقم الحروف، استفسار از محمد حیات قاسمی، مورخہ ۱۵ر جولائی ۲۰۱۰ء

۸۰۔ راقم الحروف، استفسار از شاہین نعمان، مورخہ ۳ر جون ۲۰۱۰ء

۸۱۔ راقم الحروف، استفسار از نفیسہ قاسمی، ۲۱، غالب کالونی، ندیم شہید روڈ، سمن آباد، لاہور، مورخہ ۵/ اگست ۲۰۱۰ء

۸۲۔ احمد ندیم قاسمی، انتساب ''دوام''، لاہور، مکتبہ اساطیر، ۴۵۔ اے مزنگ روڈ، اکتوبر ۱۹۹۵ء، ص ۱۲

۸۳۔ فریدہ حفیظ، ''قاسمی صاحب'' مشمولہ ''مٹی کا سمندر''، مرتب ضیاء ساجد، ص۲۹۶

۸۴۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی، انٹرویو(احمد ندیم قاسمی کی صاحب زادی سے گفتگو)، مشمولہ ''معاصر''، اپریل ۲۰۰۷ء تا مارچ ۲۰۰۸ء، ص۳۰۲

۸۵۔ اکبر حمیدی، ''احمد ندیم قاسمی۔۔۔شخصیت'' مشمولہ ''ادبیات''، سہ ماہی، خصوصی شمارہ، جلد۱۷، شمارہ۷۳، اکتوبر دسمبر ۲۰۰۶ء، اسلام آباد، ص۱۰۶

۸۶۔ احمد شفیع، ''میرا بھائی، میرا دوست'' مشمولہ ''ندیم نامہ''، ص۸۵

۸۷۔ شاہین نعمان قاسمی، مکتوب بنام راقم الحروف، از سمن آباد، لاہور، محررہ ۱۵/اگست ۲۰۱۰ء

۸۸۔ راقم الحروف، استفسار از نیر حیات قاسمی، ۲۱، غالب کالونی، ندیم شہید روڈ، سمن آباد، لاہور، مورخہ ۱۵/اگست ۲۰۱۰ء

۸۹۔ محمد خالد اختر، ''ایک دوست کا مرقع'' مشمولہ ''ندیم نامہ''، ص۱۳۳

۹۰۔ منصورہ احمد، نظم ''سنو بابا'' مشمولہ ''پاکستانی ادب کے معمار، احمد ندیم قاسمی، شخصیت اور فن''، ص۱۵۶، ۱۵۷

۹۱۔ جمیل یوسف، ''ندیم صاحب'' مشمولہ ''مونتاج''، سہ ماہی، ص۱۷۰

۹۲۔ مشفق خواجہ، ''ندیم صاحب کے نام خط'' (۲۲/مارچ ۲۰۰۱ء)، سہ ماہی، ''فنون''، شمارہ نمبر۱۲۴، اپریل ۲۰۰۵ء، ص۲۵

۹۳۔ احمد ندیم قاسمی، اداریہ ''فنون''، لاہور، شمارہ نمبر۱۲۴

۹۴۔ ایضاً، شمارہ نمبر۱۱۴

۹۵۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف، ''احمد ندیم قاسمی، ایک ہمہ جہت شخصیت''، ماہنامہ ''اخبار اردو''، اگست ۲۰۰۸ء، ص۳۸

۹۶۔ حمید اختر، ''کال کوٹھڑی''، طبع سوم، لاہور، اکتوبر ۱۹۸۸ء، ص۳۶

۹۷۔ الطاف حسن قریشی، روزنامہ ''جناح''، ۱۴/جولائی ۲۰۰۶ء

۹۸۔ امجد اسلام امجد، روزنامہ ''ایکسپریس''، ۱۶/جولائی ۲۰۰۶ء

۹۹۔ محمد امجد، ''قاسمی صاحب، بحیثیت منتظم ادارہ''، ''مونتاج''، ص۳۵۲

۱۰۰۔ امجد اسلام امجد، روزنامہ ''جنگ''، کراچی، ۲۸/اپریل ۲۰۰۴ء

۱۰۱۔ راقم الحروف، استفسار از منصورہ احمد، جوہر ٹاؤن، لاہور، ۱۰/اگست ۲۰۱۰ء

۱۰۲۔ غلام نبی خیال، ''بیاض''، مارچ ۲۰۰۷ء، ص۳۶

۱۰۳۔ صائمہ اسماء، ''کھلے دروازے کی کہانی'' مشمولہ ''مونتاج''، سہ ماہی، لاہور، شمارہ ۳، ستمبر تا دسمبر ۲۰۰۷ء، ص ۶۳

۱۰۴۔ احمد ندیم قاسمی از ''پاکستانی ادب کے معمار، احمد ندیم قاسمی، شخصیت اور فن''، ص ۱۴۱

۱۰۵۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص ۸۸

۱۰۶۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، ''سانجھ بھئی چودیس'' مشمولہ ''مخزن''، ۱۵، شش ماہی، لاہور، ص ۸

۱۰۷۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ''احمد ندیم قاسمی، شخصیت اور فن (چند تنقیدی تاثرات)'' مشمولہ ''نقوش'' شمارہ ۳۹، ۴۰، مارچ ۱۹۵۴ء، لاہور، ص ۱۹۵

۱۰۸۔ ڈاکٹر صابر آفاقی، روزنامہ ''جموں و کشمیر''، مظفر آباد، ۱۵ر جولائی ۲۰۰۶ء

۱۰۹۔ عطاالحق قاسمی، ''فنون''، ۱۹۷۵ء، ص ۲۸۰، ۲۷۹

۱۱۰۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی، نظم ''دشت وفا کی پکار''، ''گل پاشی''، ترتیب منصورہ احمد، منصور آفاق، اساطیر، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۸۱

✿✿✿✿✿

باب دوم

نگارشات کا جائزہ

احمد ندیم قاسمی نے اُردو شاعری کی کئی اصناف میں خامہ فرسائی کی۔ قطعات و رباعیات لکھیں، نظمیں اور غزلیں تخلیق کیں، حمد، نعت، دُعا، سلام لکھی۔ اِس باب میں ندیم کی اِن نگارشات کا جائزہ لیا جاتا ہے:

ا۔ دھڑکنیں (۱۹۴۲ء):

''دھڑکنیں'' جو کہ ندیم کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ ۱۹۴۲ء میں ایک ہزار کی تعداد میں ملک محمد عارف پرنٹر محمدی پریس لاہور سے طبع کرا کر محمد حنیف نے اُردو اکیڈمی لاہور سے شائع کیا۔

''دھڑکنیں'' کا انتساب ''پیشکش'' کے عنوان سے ندیم نے یکم جون ۱۹۴۱ء میں ملتان شہر میں تحریر کیا جو کہ چار (۴) صفحات پر مشتمل ہے۔ ندیم لکھتے ہیں:

> ''ایک مدت تک میرا یقین رہا کہ پولیس کا محکمہ، صرف تعزیراتِ ہند کے حافظوں اور جرائم کی تفتیش کی اُونچ نیچ سمجھنے والوں کا ایک نقار خانہ ہے لیکن گرمیوں کی ایک اُداس شام کو جب ملتان شہر جہنمی حبس میں گھرا ہوا تھا۔ پولیس کے ایک ایسے سب انسپکٹر سے میری ملاقات ہوئی جس نے میرا وہ یقین پاش پاش کر کے یکسر ناپید کر دیا! ایک مدت تک میرا یقین رہا کہ میانوالی کے رہنے والے پٹھان صرف چمکتے ہوئے برچھوں کی انی اور سیٹیاں بجاتی ہوئی گولیوں کے موضوع پر باتیں کر سکتے ہیں۔ لیکن میانوالی کے ایک نیازی پٹھان نے خشک پتوں پر گرتی ہوئی بوندوں کے ترنم کا موضوع چھیڑ کر میرے اس یقین کو بھی میرے دل سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا! ایک مدت تک میرا یقین رہا کہ دوستی کی عمارت کتنی ہی مضبوط بنیادوں پر قائم کیوں نہ ہو، زندگی کی پے در پے کروٹوں اور مرورِ زمانہ کی نیرنگیوں سے دب کر بیٹھ جاتی ہے، لیکن ایک دوست نے اس عمارت کو اپنی روح کا سہارا دے کر میرے اس یقین کا بھی گلا گھونٹ دیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میانوالی کا ایک پٹھان اور پولیس کا ایک سب انسپکٹر ٹنڈ منڈ شیشموں اور بَو کے بوڑھے درختوں پر بیٹھی ہوئی ڈراونی گِدھوں کی مُڑی ہوئی چونچوں پر نگاہیں گاڑ کر موجودہ سرمایہ دارانہ، جاگیردارانہ اور بورژوا نظام کے خلاف اتنی گہری گہری باتیں بھی سوچ سکتا ہے! میں نہیں جانتا تھا کہ دیہاتی دوشیزاؤں کے میلے لہنگوں، آڑی ترچھی مانگوں اور گھسے پھٹے چولوں میں میرے سوا کوئی اور شخص بھی ایسے حسن کا نظارہ کر سکتا ہے جو شہری جگمگاہٹوں سے

چندھیائی ہوئی آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اِس گئے گزرے زمانے میں بھی ایک دوست دوسرے دوست کی خوشیوں کے علاوہ دُکھوں میں بھی شریک ہونے سے نہیں ہچکچاتا اور اپنے دوست کے ایک آنسو پر بیس آنسو بہانے سے دل میں تسلی کی ہلکی ہلکی خنکی محسوس کرتا ہے لیکن اس ملتان شہر کی بھدی سڑکوں پر ٹہلتے ہوئے مجھے ایک شخص نے اِن سب حقائق سے آگاہ کیا اور چوں کہ میں نے کم وبیش اُنہیں حقائق کو اشعار کا جامہ پہنایا ہے۔ اِس لیے میں یہ ''دھڑکنیں'' اُسی زندہ دِل، بذلہ سنج اور مخلص دوست کے قدموں میں نچھاور کرتا ہوں اور وہ شخص ہے:

خان حمید اللہ خان نیازی، بی۔اے (علیگ) '' [۱]

''دھڑکنیں'' کا دیباچہ ڈاکٹر تاثیر نے ''پیش نامہ'' کے عنوان سے تحریر کیا جو کہ چار (۴) صفحات پر مشتمل ہے۔ اِن کے قطعات کے متعلق ڈاکٹر تاثیر رقم طراز ہیں:

''اِن میں پنجاب اور اِس کے بھی ایک خاص علاقہ کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ اِس طرح کہ باہر کا کوئی شخص اِس کی ترجمانی نہ کر سکتا۔'' [۲]

''دھڑکنیں'' میں ۲۵۲ قطعات شامل ہیں۔ اِن قطعات میں دو قطعات ایسے ہیں جن کا عنوان ایک ہی ہے۔ ''ماضی کی چٹکی'' عنوان ایک ہے اور قطعات الگ الگ ہیں جو کہ درج ذیل ہیں:

مجھ سے کل کھیتوں میں اِک مردِ معمر نے کہا
''چلچلاتی دُھوپ میں آوارہ کیوں پھرتا ہے تُو؟
آہ لیکن مجھ کو کیا کہنا تھا اور کیا کہہ گیا!
میں بھی اِس سن میں پھرا کرتا تھا اکثر کُو بکُو!''

(ماضی کی چٹکی) [۳]

بالوں میں بُوندیوں نے ستارے سے چُن دیے
وہ اوڑھنی ہوا کے تھپیڑوں میں پھڑپھڑائی
سینے پہ میرے کس کی تجلی کے ہیں خطوط
یہ کس نے دل میں چٹکی سی لی، کس کی یاد آئی

(ماضی کی چٹکی) [۴]

اِس طرح اس شعری مجموعہ میں "عکسِ جمیل" اور "عکسِ لرزاں" دو قطعات ہیں، جن کے عنوان الگ الگ ہیں، لیکن قطعہ ایک ہے:

یُوں میرے ذہن میں لرزاں ہے ترا عکسِ جمیل
دل مایوس میں یُوں گاہے اُبھرتی ہے آس
ٹمٹماتا ہے وہ نوخیز ستارا جیسے
دُور مسجد کے اُس اُبھرے ہوئے مینار کے پاس
(عکسِ جمیل) ۵

یُوں میرے ذہن میں لرزاں ہے ترا عکسِ جمیل
دل مایوس میں یُوں گاہے اُبھرتی ہے آس
ٹمٹماتا ہے وہ نوخیز ستارا جیسے
دُور مسجد کے اُس اُبھرے ہوئے مینار کے پاس
(عکسِ لرزاں) ۶

"دھڑکنیں" میں کوئی فلیپ نہیں لکھا گیا۔ "دھڑکنیں" کی پیشانی پر جوشؔ کا یہ شعر درج ہے:

عرش کی مہریں لگاتا ہوں جبینِ خاک پر ڈالتا ہوں پرتوِ گلشن خس و خاشاک پر

اِس چھوٹے سائز والے شعری مجموعہ کی قیمت ۱۲۰/- روپے مقرر کی گئی۔

۲۔رم جھم (قطعات و رباعیات) (۱۹۴۴ء):

"رم جھم" جو کہ ندیمؔ کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ ۱۹۴۴ء میں اساطیر، میاں چیمبرز، ۳۔ٹیمپل روڈ، لاہور سے ایک ہزار کی تعداد میں شائع ہوا۔ اِس شعری مجموعہ کا انتساب ندیمؔ نے حمید اللہ خاں نیازی کے نام کیا۔ اِنتساب اِن کے نام کرتے ہوئے ندیمؔ لکھتے ہیں:

نذر

حمید اللہ خاں نیازی

تُو نے باتوں میں بکھیرے تھے جو نورس غنچے
میں اُنھیں شعر کی صورت میں سجا لایا ہوں
شاعری، زیست مری، زیست، عبارت تجھ سے
تیری دولت تھی، ترے پاس اُٹھا لایا ہوں ۷

''رم جھم'' کے ابتدائی دو ایڈیشن ''دھڑکنیں'' کے نام سے چھپے تھے۔ تیسرے ایڈیشن سے اِس شعری مجموعے کا نام ''رم جھم'' رکھا گیا۔ اِس کے چوتھے ایڈیشن کے سرِ آغاز میں ندیم لکھتے ہیں کہ اِس میں وہ تمام قطعات شامل کر لیے گئے ہیں جو اُنھوں نے آج تک لکھے ہیں اور پرانی ترتیب کو بھی بدل دیا گیا۔ ندیم لکھتے ہیں کہ ''رم جھم'' کی اشاعت کے بعد اُنھوں نے بہت کم قطعات لکھے ہیں جسے وہ اپنی فنی زندگی کا بہت بڑا المیہ سمجھتے ہیں لیکن وہ جلد اِس صنف کی طرف پلٹنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اِن قطعات میں ایک تبدیلی کی طرف ندیم اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''شروع شروع میں مجھے ہر قطعہ لکھنے کے بعد یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں نے ایک افسانہ نظم کر لیا ہے۔ آج میرے قطعات میں کہانی کا عنصر کم ہو گیا ہے اور جذبے یا تاثر کی وحدت نمایاں ہے۔ یہ قطعی طور پر غیر شعوری تبدیلی ہے۔ اِس میں میرے ارادے کا کوئی دخل نہیں۔'' ۸

''رم جھم'' کے آٹھویں ایڈیشن میں ندیم ''پیش کلام'' کے عنوان سے قطعات کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''میں قطعات اب بھی لکھ رہا ہوں مگر اِن کی تعداد اتنی کم ہے کہ اِن کا ایک نیا مجموعہ مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ چناں چہ یہ قطعات ''دشتِ وفا''، ''محیط'' اور ''دوام'' میں بکھرے پڑے ہیں۔ قطعہ اب بھی میرا محبوب ذریعہ اظہار ہے اور یہ جذبہ اب بھی زندہ ہے کہ میں اِس صنفِ شعر کی طرف ایک بار پھر بھرپور انداز میں پلٹوں ___ اور پلٹوں گا ___ بشرطِ زندگی۔'' ۹

ندیم نے اس ''پیش کلام'' کو ۲۰ رجون ۱۹۸۲ء میں لکھا۔

''رم جھم'' کا دیباچہ ''پیش نامہ'' کے عنوان سے ڈاکٹر تاثیر نے ۱۹۴۲ء میں تحریر کیا۔ ڈاکٹر تاثیر لکھتے ہیں کہ اگر چہ اِن کے قطعات میں پنجاب کے دیہات کی فضا کو بیان کیا گیا ہے لیکن یہ اپنے اندر ایسی عالم گیر کشش اور جاذبیت رکھتے ہیں کہ کسی قسم کی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ اِن کے قطعات کی انفرادیت کے متعلق ڈاکٹر تاثیر رقم طراز ہیں:

> ''اِن قطعات میں ندیم نے ایک نیا تجربہ ادبی کیا ہے۔ انھوں نے شاعری اور افسانہ کو یک جا کر دیا ہے۔ ہر قطعہ ایک نظم بھی ہے اور ایک مستقل افسانہ بھی۔ گویا یہ پرانی اور

نئی نظم کا امتزاج ہے، جس طرح غزل کا ہر شعر ایک مکمل اور مستقل حیثیت رکھتا ہے،
اسی طرح ہر قطعہ اپنی جگہ قائم و ثابت ہے۔ مگر تمام قطعات مل کر ایک نظم کی صورت
اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک معین و مخصوص فضا پیدا کرتے ہیں۔" ۱۰

"رم جھم" کے اندر دائیں طرف تین قطعات درج ہیں اور اِس شعری مجموعہ کے بائیں طرف بھی اندر کی جانب تین قطعات درج ہیں۔

"رم جھم" میں ۴۲۷ قطعات، ۶۰ رباعیات اور ۴ ترائیلے شامل ہیں۔ ترائیلے جو کہ فرانسیسی شاعری کی دل آویز مگر دشوار صنف ہے۔

ندیمؔ کا یہ شعری مجموعہ ۱۸۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

اِس میں کوئی فلیپ درج نہیں ہے۔ اِس کی کتابت محمد حسین شاہ نے کی اور سرورق شاہ نواز زیدی نے کیا ہے۔

"رم جھم" کی قیمت ۔/۱۶۰ روپے مقرر کی گئی۔

۳۔جلال و جمال (۱۹۴۶ء):

"جلال و جمال" جو کہ ندیمؔ کا تیسرا شعری مجموعہ ہے۔ ۱۹۴۶ء میں اساطیر، لاہور سے ایک ہزار کی تعداد میں شائع ہوا۔ اِس شعری مجموعہ کا انتساب ندیمؔ نے مولانا عبدالمجید سالک کے نام کیا جو کہ روزنامہ "انقلاب" لاہور کے مدیرِ اعلیٰ تھے۔ انتساب اِن کے نام کرتے ہوئے ندیم لکھتے ہیں:

بارگاہِ سالک میں

تخیل کے مرمریں دریچے — افکار کے زرفشاں شبستاں
اک ولولۂ حیاتِ تازہ — اک عزم قوی کی تیغ عریاں
اک گھاؤ سا، مرہموں سے عاری — اک درد سا بے نیاز درماں
بے منتِ بادہ سرخوشی سی — بے خوفِ جمود، قلبِ سوزاں
اسرار کا قلزمِ کف آلود — احساس کی مشعلِ درخشاں

سنجیدہ و پرفشاں تفکر — طرار و جمیل و زمزمہ خواں
ملبوسِ فسانہ میں حقائق — الفاظ کے پیرہن میں طوفاں

شعروں میں لطیف سی پھریری
تالاب میں جیسے موجِ لرزاں

دراصل ندیم کے ترانے — پرتو سے ترے ہیں شعلہ افشاں
یہ ساز یہ سوز یہ تاثر — سب ترے کرم کے ہیں ثنا خواں
بھٹکی ہوئی عقل کے سہارے! — بہکی ہوئی روح کے نگہباں!
سمٹی ہوئی فکر کے مسیحا! — سہمی ہوئی زندگی کے ساماں!
اے سالکِ شاہراہِ انجم! — اے چرخِ سخن کے ماہِ تاباں!
فن کارِ ازل کے شاہ پارے! — افسانۂ دوستی کے عنواں!
یہ شعر ــــــ یہ زندگی کے خاکے — (تاریخِ امم، بیانِ خوباں)

گو زیست سے بھی ہیں یہ گراں تر
پر نذر ہیں ترے آستاں پر [۱۱]

''جلال و جمال'' کا دیباچہ ندیم نے ''تمہید'' کے عنوان سے لکھا۔ جس کو ۹ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور یہ ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اِس میں ندیم نے بتایا ہے کہ کسی شاعر کے فن کو سمجھنے سے پہلے اُس فن کار کے بارے میں جاننا از حد ضروری ہے۔ اِس کے بغیر شاعر کے کلام کی حقیقت تک رسائی ممکن نہیں۔ ندیم بھی اِس دیباچہ میں اپنے متعلق چند ایسے واقعات پیش کرتے ہیں جس سے ان کی نظموں اور غزلوں کی صحیح تفہیم میں مدد ملتی ہے۔ ندیم خود اِن کو اپنی نظموں کے لیے ''عقبی زمین'' قرار دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''نشیب و فراز کس انسان کی زندگی میں نہیں ہوتے، لیکن میرے ہاں جو نشیب ہیں، وہ عام نشیبوں سے زیادہ گہرے اور اندھیرے ہیں۔ میرے ہاں جو فراز ہیں وہ صاف ستھری ڈھلانوں اور لہراتی ہوئی کھلی پگڈنڈیوں سے محروم ہیں۔ یہ عمودی چوٹیاں اور بھیانک گریں ہیں، جہاں ہوائیں گانے کی بجائے بلکتی رہی ہیں اور جہاں سے گرد و پیش کے صرف وہی قطعے نظر آتے رہے ہیں، جہاں تک پہنچنے کے لیے میرے ماحول نے ایک مدت تک مجھے کوئی راہ نہیں سجھائی۔'' [۱۲]

اِس دیباچے کو ندیم کے مختصر حالاتِ زندگی کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اِس میں اُنھوں نے اپنی پیدائش، گاؤں، بچپن، والدین، چچا کی تربیت، شاعری سے رغبت، تعلیم، لاہور قیام، اختر شیرانی کی صحبت، عبدالمجید سالک کے ادبی اثرات، ملازمت، ''تہذیب نسواں'' اور ''پھول'' کے ایڈیٹر، اِن تمام حالات کو بیان کیا ہے۔ ندیم نے کس طرح طبقاتی استحصال کو محسوس کیا اِس کو بھی بیان کیا۔ غزل پر کیے گئے اعتراضات کا ذکر، نظم آزاد اور نظمِ معریٰ، پابند نظم اِن پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ''جلال و جمال'' میں کہی گئی نظمیں اور غزلیں دس برس کے عرصے پر محیط ہیں۔ ندیم بتاتے ہیں کہ اُنھوں نے ابتدائی کلام کو قطعی طور پر خارج نہیں کیا، کیوں کہ یہ کلام اُنہیں کئی حوالوں سے عزیز ہے۔ ایک تو اِن میں سادگی ہے اور دوسرا اِس سے اِن کی زندگی کی کئی خوب صورت یادیں وابستہ ہیں۔ اِس کو ندیم نے ۱۳؍ستمبر ۱۹۴۶ء میں تحریر کیا۔

''جلال و جمال'' کے دائیں طرف ندیم کی اپنی ہاتھ سے لکھی ہوئی نظم ''فن'' درج ہے جو کہ چھ اشعار پر مشتمل ہے اور اس شعری مجموعہ میں بھی شامل ہے۔ اِس نظم کے آخر میں ندیم کے دستخط بھی درج ہیں۔ اِس شعری مجموعہ کے بائیں طرف اِن کی اپنی ہاتھ سے لکھی نظم ''حریتِ فکر'' کا چوتھا اور آخری بند درج ہے۔

ندیم نے ''جلال و جمال'' کو چھے حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اِس کے ہر حصے کی نظمیں تاریخی لحاظ سے ترتیب دی گئی ہیں اور ہر حصہ ایک الگ موضوع سے متعلق ہے۔ اِن تمام نظموں اور غزلوں کا انتخاب ندیم کا اپنا ہے لیکن اِن پر نظرِثانی کرنے اور زبان کی چند لغزشوں کی طرف مشفقانہ اشارہ کرنے میں مولانا عبدالمجید سالک کا ہاتھ بھی ہے۔

''جلال و جمال'' کے حصہ اوّل سے پہلے ''شعر کا دیوتا'' کے عنوان سے نظم درج ہے۔ حصہ اوّل کے آغاز میں غالبؔ کا درج ذیل شعر لکھا گیا ہے:

ہجومِ فکر سے دل مثلِ موج لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز [۱۳]

''جلال و جمال'' کے حصہ اوّل میں ۵۴ نظمیں شامل ہیں اور اِس کے آخر میں ''ذرے'' کے عنوان سے ۱۱۶ اشعار بھی درج ہیں۔ اور یہ حصہ ص ۴۳ تا ۱۴۲ پر مشتمل ہے۔

''جلال و جمال'' کے حصہ دوم کی پیشانی پر حافظ کا یہ شعر درج ہے:

خوش می دہد نشانِ جلال و جمالِ یار
خوش می کند حکایتِ عز و وقارِ دوست [۱۴]

اِس حصے میں ندیم کی ۴۳ نظمیں شامل ہیں اور اِس کے آخر میں ''تارے'' کے عنوان سے ۱۵ اشعار بھی درج ہیں۔ یہ حصہ ۱۴۳ تا ۲۲۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

''جلال و جمال'' کے حصہ سوم کی پیشانی پر غالب کا یہ مصرع درج ہے:

ع ہر غنچے کا گُل ہونا آغوش کشائی ہے! [۱۵]

اِس حصے میں ندیم کی ۹ نظمیں شامل ہیں اور آخر میں ''مناظر'' کے عنوان سے ۶ اشعار بھی شامل ہیں اور یہ حصہ ۲۲۳ تا ۲۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

''جلال و جمال'' کے حصہ چہارم کی پیشانی پر مسافر کا یہ شعر درج ہے:

زندگی از گرمئ ذکر است و بس
حریّت از عفتِ فکر است و بس [۱۶]

حصہ چہارم میں ندیم کی ۵۳ نظمیں شامل ہیں اور آخر میں ''اشعار'' کے عنوان سے ۱۶ اشعار درج کیے گئے ہیں۔ ''جلال و جمال'' کا یہ حصہ ۲۳۷ تا ۳۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

''جلال و جمال'' کے حصہ پنجم میں ندیم کی غزلیں شامل ہیں اور اس حصہ کی پیشانی پر ''پیامِ مشرق'' کا درج ذیل شعر شامل ہے:

دل یاراں ز نواہائے پریشانم سوخت
من ازاں نغمہ تپیدم کے سرو دن نتواں [۱۷]

حصہ پنجم میں ندیم کی ۶۶ غزلیں شامل ہیں اور یہ حصہ ص ۳۳۷ تا ۳۷۲ پر مشتمل ہے۔

''جلال و جمال'' کا حصہ ششم متفرق اشعار پر مشتمل ہے اور اِس کی پیشانی پر ''پیامِ مشرق'' کا یہ شعر درج ہے:

صد نالۂ شب گیرے، صد صبح بلا خیز ے
صد آہِ شرر ریزے، یک شعر دل آویز ے [۱۸]

اِس حصہ میں اشعار کو سنۂ تحریر کے طور پر درج کیا گیا ہے۔

۱۹۳۶ء کے ۷ اشعار، ۱۹۳۷ء کے ۱۹ اشعار، ۱۹۳۸ء کے ۲۰ اشعار، ۱۹۳۹ء کے ۱۶ اشعار، ۱۹۴۰ء کے ۱۰ اشعار، ۱۹۴۱ء کے ۹ اشعار، ۱۹۴۲ء کے ۱۰ اشعار، ۱۹۴۳ء کے ۰۲ اشعار، ۱۹۴۴ء کے ۰۲ اشعار اور ۱۹۴۵ء کے ۰۴ اشعار شامل ہیں اور یہ حصہ ص ۳۷۳ تا ۳۸۴ پر مشتمل ہے۔ اِس میں ندیمؔ کی ۱۶۰ نظمیں، ۶۶ غزلیں اور ۹۹ متفرق اشعار شامل ہیں۔

یہ شعری مجموعہ ۳۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

اِس میں کوئی فلیپ درج نہیں ہے۔ اِس شعری مجموعہ کا گرد پوش مخدومی حضرت عبدالرحمٰن صاحب چغتائی نے تیار کیا ہے۔

اِس شعری مجموعہ کی قیمت ۔/۳۰۰ روپے مقرر کی گئی۔

۴۔شعلۂ گل (۱۹۵۳ء):

''شعلۂ گل'' جو کہ ندیمؔ کا چوتھا شعری مجموعہ ہے۔ ۱۹۵۳ء میں اساطیر، میاں چیمبرز، ۳۔ٹیمپل روڈ، لاہور سے ایک ہزار کی تعداد میں شائع ہوا۔ اِس شعری مجموعہ کا انتساب ندیمؔ نے سبطِ حسن کے نام کیا۔ انتساب اِن کے نام کرتے ہوئے ندیمؔ لکھتے ہیں:

سبطِ حسن کے نام!

ع

ماہ چراغ چشم و رہِ انتظارِ دوست ۱۹

اِس شعری مجموعہ کا دیباچہ ''تعارف'' کے عنوان سے عبدالمجید سالک نے لکھا۔ جو کہ ۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں عبدالمجید سالک بتاتے ہیں کہ کسی شاعر کے رجعت پسند اور ترقی پسند ہونے میں اس کے ماحول اور زندگی کے تقاضوں کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ ندیمؔ کی شاعری کے متعلق عبدالمجید سالکؔ لکھتے ہیں:

''میں ندیمؔ کی شاعری کے ارتقا کی تمام منزلوں سے آشنا ہوں۔ میں نے اس کو گھٹنوں

چلتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور آج اس کے ثبات قدم اور سرعتِ رفتار کو بھی دیکھ رہا ہوں۔
اس کی شاعری اپنی اوّلیں منزلوں پر اگرچہ پرانوں کی سلامت روی اور روایت نوازی کا
آئینہ تھی، لیکن اہلِ نظر اس میں مستقبل کے روشن امکانات دیکھ رہے تھے۔" [۲۰]

عبدالمجید لکھتے ہیں کہ ندیمؔ کی نظموں میں انسانیت اور انسان دوستی نمایاں ہے۔ وہ زندگی اور اس میں پیش آنے والے تلخ حقائق اور مصائب کا ذکر کرتے ہیں اور انسان کے ساتھ ہونے والے ظلم وستم، جبر، استحصال اور عدم مساوات کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ ندیمؔ معاشرے میں انقلاب دیکھنا چاہتے ہیں۔ اِن کے نزدیک کائنات کو انسان کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے۔ اس لیے وہ اِن تمام چیزوں کو پاش پاش کر دینا چاہتے ہیں جو انسان کو غلامی، مظلومی اور ذلت میں مبتلا کر دے۔

عبدالمجید سالک کے نزدیک اِن کی غزل بھی پرانے غزل گوؤں سے مختلف ہے۔ اِس میں سوز تو ہے لیکن گداز نہیں۔ سالکؔ صاحب "شعلۂ گل" کو ندیمؔ کی شاعری کے تیسرے دور کا سنگِ میل قرار دیتے ہیں۔ اس "تعارف" کو ۶ر ستمبر ۱۹۵۲ء میں کراچی میں لکھا گیا۔ عبدالمجید سالکؔ کے اِس "تعارف" کے بعد ممتاز حسین "ایک نیا منصور" کے نام سے ندیمؔ کے متعلق لکھتے ہیں جو کہ ۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ ممتاز حسین اِس شعری مجموعے کے متعلق رقم طراز ہیں:

"شعلۂ گل" کتاب الطورِ اسین ہی ٹھہری تو اِس بات کے اظہار میں حرج ہی کیا ہے
جو میرے اور اِن کے طریق فکر میں تنوع پیدا کرتی ہے، جو مختلف راہوں کو ایک ہی
منزل سے ملاتی ہے۔" [۲۱]

"شعلۂ گل" کے آغاز میں دائیں طرف ندیمؔ کی اپنی ہاتھ سے لکھی ہوئی نظم "عنفوانِ شباب" درج ہے اور اس نظم کے آخر میں ندیمؔ کے دستخط بھی درج ہیں اور اِس شعری مجموعہ کے بائیں طرف اِن کی نظم "گونج" درج ہے جو کہ ۷ اشعار پر مشتمل ہے۔ اِس شعری مجموعہ کو ندیمؔ نے چھے حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ حصہ اوّل میں ۳۱ نظمیں شامل ہیں، حصہ دوم میں ۸ نظمیں، حصہ سوم میں ۹ نظمیں، حصہ چہارم میں ۱۰ نظمیں درج ہیں۔ حصہ پنجم میں ۳۶ غزلیں شامل ہیں۔ حصہ ششم میں "مطلع" کے عنوان سے ۲۷ اشعار درج ہیں اور "اشعار" میں ۳۱ اشعار درج ہیں۔

ندیم کا یہ شعری مجموعہ ۲۳۵ صفحات پر مشتمل ہے۔

اِس میں کوئی فلیپ درج نہیں ہے۔ اِس کی کتابت محمد حسین شاہ نے کی اور سرورق آغا نثار نے۔

اِس شعری مجموعے کی قیمت ۱۸/۔ روپے مقرر کی گئی۔

۵۔دشتِ وفا(۱۹۶۳ء):

''دشتِ وفا'' جو کہ ندیم کا پانچواں شعری مجموعہ ہے۔ ۱۹۶۳ء میں اساطیر، لاہور سے ایک ہزار کی تعداد میں شائع ہوا۔ اِس کا انتساب ندیم نے یوں لکھا ہے:

اک کشتۂ غم پہ مہرباں ہو — تم کتنے عجیب حکمراں ہو
تم حسن کا نقشِ جاوداں ہو — تم میری وفا کا امتحاں ہو
تم میرے یقین ہو یا گماں ہو — میرے ہو، مگر مرے کہاں ہو
ہو لالۂ دشتِ نارسائی — لیکن مرے خون میں رواں ہو
برسوں کی جدائی کی قسم ہے — تم وقت کی طرح بے کراں ہو
بکھری ہوئی کائناتِ دل پر — چھائے ہوئے مثلِ آسماں ہو

سوگند مجھے خلوصِ فن کی
تم میری نفاستِ بیاں ہو ۲۲

''دشتِ وفا'' میں فہرست کے بعد غالبؔ کا یہ شعر درج ہے:

حرفِ اوّل

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

(غالبؔ) ۲۳

''دشتِ وفا'' کا دیباچہ ''اجمالاً'' کے عنوان سے فراق گورکھ پوری نے الہ آباد(ہند) سے ۲۰رنومبر ۱۹۶۱ء میں لکھا جو کہ ۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ فراق گورکھ پوری، ندیم کے متعلق رقم طراز ہیں:

''ندیم کے اشعار میں زندگی اور مسائلِ زندگی کی بھرپور چوٹیں ہیں۔ اِن کی آواز میں زندگی کے خواب، زندگی کے درد، زندگی کی فتوحات اور اِن فتوحات سے بڑھ کر اہم چیز

زندگی کی شکستیں، گہرے اور پُرخلوص سوچ کے عناصر، سب مل کر حل ہو گئے ہیں اور
اِن کے نغمے فضائے زندگی میں وہ گونج پیدا کر رہے ہیں۔ وہ جھنکاریں اُبھار رہے ہیں۔
اس کھنک کو جنم دے رہے ہیں جو شاعر اور شاعری کو لازوال بنا دیتی ہے اور جو ہمیں زندگی
کی گہرائیوں اور بلندیوں کی سیر کراتی ہیں اور بہت دُور تک سیر کراتی ہیں اور ہماری زندگی
کو ناقابلِ فراموش تجربات سے اور اَن مول احساسات سے مالامال کر دیتی ہیں۔'' ۲۴

''دشتِ وفا'' کے سرورق کی دوسری طرف ندیم کی اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی نظم ''پابندی'' درج ہے اور اِس شعری مجموعے کے آخر میں بائیں طرف اِن کی نظم ''دیوانہ'' درج ہے۔

''دشتِ وفا'' کے آخر میں مولانا غلام رسول مہر نے ندیم کی شاعری پر ''تکملہ'' کے عنوان سے اپنے خیالات کو بیان کیا ہے جو کہ اُنھوں نے یکم فروری ۱۹۶۳ء کو لکھا۔ جو کہ ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ ندیم جو کہ انسانیت سے محبت کرتے ہیں اور اِس معاملے میں کسی رنگ و نسل کی تمیز نہیں کرتے۔ اِن کے اِس نظریہ انسانیت کے متعلق مولانا غلام رسول مہر رقم طراز ہیں:

''ندیم کی شاعری کا بنیادی موضوع وہ انسانیت ہے جو رنگ، نسل، خون، جغرافیائی حدود،
منصب، ثروت، غرض ہر مصنوعی امتیاز سے بالاتر ہے۔'' ۲۵

اِس شعری مجموعے میں ۳۲ قطعات، ۵۷ غزلیں اور ۶۳ نظمیں شامل ہیں اور ''فردیات'' کے عنوان سے ۴۴ اشعار درج ہیں۔

ندیم نے اِس شعری مجموعے میں ۲۴ نظمیں، غزلیں اور قطعات ''حبسیات'' کے عنوان سے لکھے ہیں اور اِن کے آغاز میں یہ تحریر درج ہے:

۲۵۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء

↓

۲۔ فروری ۱۹۵۹ء

There is delight in singing

Tho None Hear

Beside the singer.

W. S. Landor. ۲۶

''دشتِ وفا'' ۳۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

اِس میں کوئی فلیپ درج نہیں ہے۔

اس شعری مجموعے کی قیمت -/۱۲ روپے مقرر کی گئی۔

''دشتِ وفا'' کی کتابت محمد حسین شاہ نے کی۔

۱۹۶۴ء میں ''دشتِ وفا'' پر ندیم کو آدم جی ادبی ایوارڈ دیا گیا۔

۶۔محیط (۱۹۷۶ء):

''محیط'' جو کہ ندیم کی شاعری کا چھٹا شعری مجموعہ ہے۔ ۱۹۷۶ء میں التحریر لاہور سے شائع ہوا۔ اس شعری مجموعہ کا انتساب ندیم اپنی ماں کے نام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ماں کے نام
یہ حُسنِ ذوق، یہ حُسنِ نظر، یہ حُسنِ کلام
ترے ہی حسنِ تمنا کا معجزہ ہے تمام ۲۷

''محیط'' کی پیشانی پر درج ذیل شعر لکھا گیا ہے:

لب ما کشتی بے بادبانی
محیط شیوہ، ہایت بے کرانی ۲۸

''محیط'' کے آغاز میں غالب کا یہ شعر درج ہے:

محیط افگندہ بیروں گو ہرم را
چو گرد افشاندہ آہن جو ہرم را

ندیم کے اِس شعری مجموعے میں کوئی دیباچہ، مقدمہ یا پیش لفظ نہیں ہے۔

''محیط'' کا فلیپ فراق گورکھ پوری نے لکھا ہے۔ فراق، ندیم کے متعلق رقم طراز ہیں:

''پنجاب کی سرزمین سے ہی ایسا شاعر اُٹھ سکتا تھا جس کی شخصیت میں نرمی اور کس بل کا حسین ترین سنگم نظر آئے اور توانائی اور نزاکت جس کی شاعری کی جان ہو۔ ندیم کے

اشعار کے پیچھے لمبے اور گہرے سوچ کا بہت بڑا پس منظر ہوتا ہے۔ یہی سوچ ان کے کلام میں وہ چوٹیلا پن اور وہ کاٹ پیدا کر دیتا ہے جو صحت مند شاعری کی خصوصیت ہے۔'' ۲۹

''محیط'' میں ۱۲۵ غزلیں، ۱۰۷ نظمیں، ۱۵ قطعات، ۵ رباعیات اور ۳۵ متفرق اشعار درج کیے گئے ہیں۔

''محیط'' کی کتابت محمد حسین شاہ نے کی اور اس شعری مجموعے کی قیمت -/۱۵۰ روپے مقرر کی گئی۔

ندیم کا یہ شعری مجموعہ ۴۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

۱۹۷۶ء میں ندیم کو ''محیط'' پر آدم جی ادبی ایوارڈ دیا گیا۔

۷۔ دوام (۱۹۷۹ء):

''دوام'' ندیم کی شاعری کا ساتواں مجموعہ ہے جو کہ مکتبہ اساطیر، ۴۵۔اے مزنگ روڈ، لاہور سے شائع ہوا۔ ندیم نے اِس مجموعہ کا انتساب اپنے خاندان اور پروین اور منصورہ کے نام کیا ہے۔ ندیم اِن کا شمار اپنی محبت اور خلوص کے رازدانوں میں کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اِن کے حیاتِ فن کو اِن کی وجہ سے دوام ہے۔ اِس کا انتساب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اپنے اُن اہلِ خاندان کے نام
جن سے میری حیاتِ فن کو دوام

رابعہ ___ وہ مری شریکِ حیات — میرے دُکھ سکھ میں میرے ساتھ رہی
دو جہاں میری دسترس میں رہے — میرے قبضے میں کائنات رہی
میرا نعمان ___ میرا نورِ نظر — روح کا چین، آنکھ کا تارا
میرا بیٹا بھی، میرا ساتھی بھی — میرا پیارا، مرا جگر پارا

فن انھی سے ہے معتبر میرا
جن سے جنت بنا ہے گھر میرا

میری ناہید اور میری نشاط — مجھ کو یہ بیٹیاں خدا نے دیں
خیر کی مشعلیں بلند کیے — وہ مرے ساتھ ساتھ چلتی رہیں
ریگ زارِ حیات میں مجھ کو — ذوق و شوقِ سفر انھی سے ملا
رات کی بے اُفق طوالت میں — اعتمادِ سحر انھی سے ملا

اِن کے کردار میں گداز بہت
اِن کی سیرت پہ مجھ کو ناز بہت

میری دو اور بیٹیاں ہیں جنھیں
منتخب میرے قلب و جاں نے کیا
میری اولاد کی طرح میری
ایک پروین، ایک منصورہ
غم کی حدت میں اِن کا طرزِ تپاک
سرد جھونکوں، گھنی گھٹاؤں سا ہے
زندگی کی تمازتوں میں ندیم
پیار اِن بیٹیوں کا، چھاؤں سا ہے

روحِ انسانیت کی تجسیمیں
رحمتِ ایزدی کی تصویریں [۳۰]

''دوام'' میں کوئی دیباچہ، مقدمہ یا پیش لفظ شامل نہیں ہے۔

''دوام'' کا فلیپ احسان دانش نے تحریر کیا ہے۔ احسان دانش کے نزدیک ندیم کو کانٹا بھی پھول کی طرح خوب صورت اور خوش نما لگتا ہے اور وہ دونوں کی آبیاری کرتے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِن کو کسی آنے والے دور کا انتظار ہے۔ فلیپ پر احسان دانش، ندیم کے متعلق رقم طراز ہیں:

''سچے اور حقیقی ادیب یا شاعر کو کبھی اِس کے دور نے سہولتیں نہیں دیں، ندیم بھی اِسی صف کے انسان ہیں۔۔۔ ندیم زندگی اور اِس کے حقائق کو سطحی نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ آثار و قرائن کے رُخ پر آگے کی طرف دیکھتے ہیں اور جو کچھ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اسے اپنے اندازِ بیان سے سجا کر اِس میں ایسی افسونی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں جس سے دکھی دل، بیدار دماغ اور بے تاب روحیں ایک کیف میں گم ہوتی معلوم ہونے لگتی ہیں۔'' [۳۱]

''دوام'' کے بائیں طرف ندیم کی اپنی ہاتھوں سے لکھی ہوئی دعا درج ہے جو کہ آٹھ اشعار پر مشتمل ہے جس کا پہلا شعر درج ذیل ہے:

مجھے نہ مژدۂ کیفیتِ دوامی دے
مرے خدا! مجھے اعزازِ ناتمامی دے

''دوام'' میں ایک نعت، ۵۵ غزلیں، ۶۷ نظمیں اور ۶ متفرق اشعار شامل ہیں۔

ندیم کی شاعری کا یہ مجموعہ ایک ہزار کی تعداد میں شائع ہوا۔

اِس کا سرورق شاہ نواز زیدی نے اور کتابت محمد حسین شاہ نے کی۔

اِس کتاب کی قیمت ۔/۱۴۰ روپے مقرر کی گئی۔

ندؔیم کا یہ شعری مجموعہ ۲۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

۱۹۷۹ء میں ''دوام'' پر ندؔیم کو آدم جی ادبی ایوارڈ دیا گیا۔

۸۔لوحِ خاک (فروری ۱۹۸۸ء):

''لوحِ خاک'' ندیم کی شاعری کا آٹھواں مجموعہ ہے جو کہ فروری ۱۹۸۸ء میں مکتبہ اساطیر، لاہور سے ایک ہزار کی تعداد میں شائع ہوا اور اشاعتِ ثانی اکتوبر ۱۹۹۱ء میں ہوا۔ ندؔیم نے اِس شعری مجموعے کا انتساب مظفر بخاری کے نام کرتے ہوئے لکھا ہے:

'' مظفر بخاری

کے نام

ع تُو ساتھ ہو اور دُور کا در پیش سفر ہو۔'' ۳۲

''لوحِ خاک'' کی پیشانی پر ندؔیم نے یہ شعر درج کیا ہے:

گہر جوی را مژدہ کز تیرہ خاک

درخشد ہمی گوہر تابناک ۳۳

اِس شعری مجموعہ میں نہ تو کوئی مقدمہ، پیش لفظ یا دیباچہ ہے اور نہ ہی کوئی فلیپ لکھا گیا ہے۔

ندؔیم کا یہ شعری مجموعہ ۶۰ نظموں، ۶۵ غزلوں، ۷ قطعات اور ۱۳ متفرق اشعار پر مشتمل ہے۔

''لوحِ خاک'' کا سرورق بشیر موجد نے اور کتابت محمد حسین شاہ نے کی اور اِس کا اہتمام منصورہ احمد نے کیا۔ اِس شعری مجموعے کی قیمت ۔/۱۲۰ روپے مقرر کی گئی۔

''لوحِ خاک'' ۲۲۳ صفحات پر مشتمل ہے۔

۹۔ جمال (نعتیہ) (۱۹۹۲ء):

''جمال'' جو کہ ندیمؔ کا نواں شعری مجموعہ ہے۔ ۱۹۹۲ء میں ''بیاض'' لاہور سے ایک ہزار کی تعداد میں شائع ہوا۔ اِس شعری مجموعے کا انتساب ندیمؔ نے اپنے والد کے نام کیا ہے۔ انتساب اِس طرح درج کرتے ہیں:

والد گرامی پیر غلام نبی المعروف نبی چن مرحوم کے نام ۳۴

اِس شعری مجموعے کے آغاز میں ''صلُّوا علیہ وَسَلّمُوا تسلیماً'' لکھا ہوا ہے اور ''جمال'' کی پیشانی پر یہ شعر درج ہے:

لفظِ محمدؐ اصل میں ہے نطق کا جمال
لحنِ خدا نے خود ہی سنوارا ہے اُن کا نام

اِس شعری مجموعے کے آغاز میں ''دعا'' درج ہے:

اے خدا!
میری دعا ہے
کہ میں جب تجھ کو پکاروں
تو مری رات کے ماتھے پہ
ترے نام کا سورج
دہکے!
اے خدا!
میری دعا ہے
کہ کسی صبح
جب آنکھیں کھولوں
میری سانسوں میں
ترے قرب کا گلشن
مہکے!
اے خدا!
میری دعا ہے
کہ مجردم کی پراسرار فضاؤں میں
ترا نطق
کسی شاخِ برہنہ پہ اترتی ہوئی چڑیا کی طرح

میرے دل میں
کسی بے نام سے احساسِ مسرت سے
مسلسل......................
چھلکے!
اے خدا!
میری دعا ہے
کہ تو افلاک سے اک بار
بس اک بار اتر کر
مرے صحراؤں پر
اوس میں بھیگے ہوئے سبزۂ نورستہ کی مانند
مری حدِ نظر تک
لہکے! ۳۵

اِس شعری مجموعے میں ۲۲ نعتیں شامل ہیں۔

''جمال'' میں نہ تو کوئی فلیپ ہے اور نہ ہی دیباچہ۔

یہ مجموعہ کل ۷۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اِس کا سرِ ورق آغا نثار نے کیا ہے۔

اِس شعری مجموعے کی قیمت ۶۰/- روپے مقرر کی گئی۔

۱۰۔ بسیط (۱۹۹۵ء):

''بسیط'' جو کہ ندیمؔ کا دسواں شعری مجموعہ ہے۔ ۱۹۹۵ء میں اساطیر، لاہور سے ایک ہزار کی تعداد میں شائع ہوا۔ اِس شعری مجموعہ کا انتساب ندیمؔ نے منصورہ احمد کے نام کیا۔ انتساب اِن کے نام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

سرمایۂ حیات بیٹی
منصورہ احمد
کے نام
ع سرِ شہراہِ حیات اک عجب انسان ملا
ندیمؔ ۳۶

''بسیط'' کا فلیپ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے لکھا جو کہ کتاب کے اندر دائیں طرف درج ہے۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار، ندیمؔ کی غزل کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''زندگی کی رنگا رنگی اور پھر توانائیوں کے ساتھ سارے تجربوں اور احساسات کے ساتھ، فکر اور جذبے کے ہر پہلو کی عکاسی کرتے ہوئے، غزل کے شعر جس سرچشمہ سے فیضان حاصل کر سکتے تھے اور کر رہے تھے، وہ نہ اقبال تھا، نہ فیض تھا، نہ فراق! وہ تو یگانہ اور شاد عارفی کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے احمد ندیم قاسمی اور اِن کا قبیلہ تھا۔'' ۳۷

کتاب کے آخر میں بائیں طرف ندیمؔ کی نظم ''بولنے دو'' درج ہے۔

''بسیط'' میں ۴۵ غزلیں اور ۳۶ نظمیں شامل ہیں۔

''بسیط'' ۱۵۹ صفحات پر مشتمل ہے۔

ندیمؔ کے اِس شعری مجموعے کی قیمت ۔/۱۲۰ روپے مقرر کی گئی۔

۱۱۔ارض و سما (۲۰۰۶ء):

''ارض و سما'' جو کہ ندیمؔ کا گیارھواں اور آخری شعری مجموعہ ہے۔ یہ ۲۰۰۶ء میں سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور سے شائع ہوا۔ اِس کتاب کا انتساب ندیمؔ نے نسلِ نو کے نام کیا۔ انتساب اُن کے نام کرتے ہوئے ندیمؔ لکھتے ہیں:

> ندیمؔ میرے جلو میں تھی نسلِ مستقبل
> میں صرف ایک تھا اور بے شمار ہو کے چلا ۳۸

''ارض و سما'' کا دیباچہ ''پیش لفظ'' کے عنوان سے ڈاکٹر ناہید قاسمی نے ۱۰ر ستمبر ۲۰۰۶ء میں لکھا جو کہ تین صفحات پر مشتمل ہے۔

ناہید قاسمی لکھتی ہیں کہ ندیمؔ کی یہ عادت تھی کہ وہ جب بھی اپنی نظم یا غزل مکمل کر لیتے تو اُس کے آخر میں اپنا نام اور تاریخ ضرور درج کرتے لیکن اُن کے کاغذات میں کچھ ایسی نظمیں اور غزلیں بھی تھیں جو کہ

نامکمل تھیں۔

''ارض و سما'' ندیمؔ کا ایسا شعری مجموعہ ہے جو کہ اِن کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ اِس کا عنوان بھی ندیمؔ نے پہلے ''برملا'' سوچا تھا لیکن بعد میں اِس کا عنوان ''ارض و سما'' منتخب کیا۔ ناہید قاسمی لکھتی ہیں:

''ابا جی نے اپنے اِس مجموعے کا عنوان پہلے ''برملا'' سوچا تھا، لیکن بوجوہ، وہ اِس سے مطمئن نہ تھے۔ میں جب بھی اُن سے پوچھتی کہ کون سا عنوان فائنل کیا؟ تو وہ سوچ میں پڑ جاتے تھے۔ یہ تو اُنھوں نے اپنے جانے سے صرف ایک روز پہلے ۹ رجولائی ۲۰۰۶ء کی صبح کو ہسپتال میں اپنی نواسی نفیسہ حیات قاسمی کا ہاتھ پیار سے تھام کر ہمیں بتایا تھا کہ نفیسہ نے اپنے ایم ایف اے (فائن آرٹس) کے لیے جو ندیمؔ کے اشعار کے افکار سے متاثر ہو کر اپنا پینٹنگ تھیسز حال ہی میں مکمل کیا تھا، تو اُس میں شامل اُن ہی کے ایک شعر نے انہیں نیا عنوان سُجھا دیا تھا۔ ''ارض و سما'' ___ سو اِس مجموعے کا یہ نام خود احمد ندیم قاسمی کا دیا ہوا ہے۔'' ۳۹؎

اِس شعری مجموعے کے شروع میں ندیمؔ کی ہی خواہش پر اُن کا یہ شعر درج ہے:

مجھ کو امکان کے روزن سے نظر آتے ہیں
نت نئے ارض و سما، ارض و سما سے آگے ۴۰؎

''ارض و سما'' میں ۴۳ غزلیں، ۳۲ نظمیں، ۵ قطعات اور فردیات کے عنوان سے ۳۰ اشعار شامل ہیں۔
''ارض و سما'' کے آخر میں ندیمؔ کے جامع سوانحی کوائف شامل ہیں اور اِس شعری مجموعے کے جملہ حقوقِ اشاعت و اخذ و ترجمہ نعمان ندیم قاسمی کے پاس محفوظ ہیں۔

''ارض و سما'' میں کوئی فلیپ نہیں ہے۔

یہ شعری مجموعہ ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

اِس کا سرورق نفیسہ حیات قاسمی نے اور فوٹوگرافی نیر حیات قاسمی نے کی۔

اِس شعری مجموعہ کی قیمت ۔/۱۷۵ روپے مقرر کی گئی۔

۱۲۔انوارِ جمال (۲۰۰۷ء):

''انوارِ جمال'' ۲۰۰۷ء میں سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور سے شائع ہوئی۔ اِس کو مرتب ڈاکٹر ناہید قاسمی اور نفیسہ حیات قاسمی نے کیا۔

اس شعری مجموعے کے آغاز میں بسم اللہ اور کلمہ شریف درج ہے۔

اس کا انتساب ندیمؔ کے والد کے نام اِس طرح کیا گیا ہے:

''احمد ندیمؔ قاسمی کے والدِ گرامی
پیر غلام نبی المعروف پیر نبی چنؒ کے نام۔'' ۴۱

اِس کے آغاز میں ندیمؔ کے یہ اشعار درج ہیں:

بخش دے گا مجھے خدائے جمیل
میں کہ ہوں ایک مدح خوانِ جمال
شعر کہنا شعاعیں چننا ہے
شاعری نورِ جاودانِ جمال ۴۲

اِس کا دیباچہ ڈاکٹر ناہید قاسمی اور نفیسہ حیات قاسمی نے اپریل ۲۰۰۷ء میں ''عرضِ مرتبین'' کے نام سے لکھا جو کہ ۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ ندیمؔ جو کہ دین کے بنیادی اصولوں کو ہمیشہ عزیز رکھتے تھے۔ اِس حوالے سے ناہید قاسمی رقم طراز ہیں:

> ''اپنے مذہب سے ندیمؔ کا تعلق تعصب زدگی، تنگ نظری یا محض جذباتیت کا حامل نہیں ہے۔ وہ غور وفکر اور تدبر سے کام لیتے ہوئے اپنی سمت کو ہمیشہ سیدھا رکھنے کے لیے کوشاں رہے۔ انہیں اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے جو بہت عزیز ہیں، اُن میں عدل و انصاف، توازن و اعتدال، مثبت ارتقا، جرأتِ اظہار، حریت اور مساوات شامل ہیں۔'' ۴۳

''انوارِ جمال'' کے دیباچہ کے بعد یہ حمدیہ شعر درج ہے:

تُو جمال بھی، تُو جمیل بھی، تُو خبیر ہے، تُو علیم ہے
یہ حروف تیری امانتیں، یہ ندیمؔ تیرا ندیم ہے ۴۴

''جمال'' جو کہ ندیم کی نعتوں کا مجموعہ ہے لیکن اِن کی وفات کے بعد ناہید قاسمی نے ''جمال'' میں شامل نعتوں کے ساتھ نئی نعتوں کے اضافے کے ساتھ موضوعِ خاص سے متعلقہ دیگر کلام کو بھی ''انوارِ جمال'' میں یک جا کر لیا ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ کچھ نظمیں اور غزلیہ اشعار بھی شامل ہیں۔ اب ''انوارِ جمال'' میں نئی نعتیں، حمدیہ نظمیں، دعائیہ نظمیں، سلام اور اِس موضوع سے متعلق کچھ نظمیں، رباعیات اور قطعات بھی شامل ہیں۔

''انوارِ جمال'' میں ۲ حمدیہ، ۴ دعائیہ، ۳۱ نعتیں، ۶ سلام، ۷ قطعات و رباعیات، ۱۸ نظمیں اور اِس کے علاوہ ۱۰۴ غزلیہ اشعار شامل ہیں۔

''انوارِ جمال'' کے دعائیہ حصہ کے آغاز میں یہ شعر درج ہے:

بڑا سُرور ملا ہے مجھے دُعا کر کے
کہ مسکرایا خدا بھی ستاوا کر کے ۴۵

نعتیہ حصہ کے آغاز میں یہ شعر درج ہے:

لفظِ محمدؐ اصل میں ہے نطق کا جمال
لحنِ خدا نے خود ہی سنوارا ہے اُنؐ کا نام ۴۶

''انوارِ جمال'' کے حصہ سلام کے آغاز میں جو شعر لکھا گیا ہے، وہ درج ذیل ہے:

بگولے رقص میں ہوتے ہیں جب، تو سوچتا ہوں
کہ دشت پر بھی خدا کا جمال جاری ہے ۴۷

اِس شعری مجموعے کے ''رباعیات و قطعات'' کے آغاز میں یہ شعر درج ہے:

حمدِ ربّ جمال ہے یہ بھی
ذکرِ حسنِ درونِ سنگ کروں ۴۸

''رباعیات و قطعات'' کے بعد مندرجہ ذیل شعر درج ہے:

دل کو ___ جسے خاکسترِ دل کہتی ہے دنیا
انوار کی لَو ڈال کے ___ تابندہ شرر کر ۴۹

حصہ نظم جو کہ ''خیالات و افکار'' کے نام سے شامل ہے، اُس کے آغاز میں یہ شعر درج ہے:

میرے نقادوں کو بتاؤ، میرا بھٹکنا کھیل نہیں
دائیں بائیں گھوم آتا ہوں، سمت کو سیدھا رکھتا ہوں ۵۰

منتخب غزلیہ اشعار کے آغاز میں یہ شعر درج ہے:

مرا معیارِ غزل خوانی ہے
حرفِ سادہ میں بلاغت اُنؐ کی ۵۱

''انوارِ جمال'' میں کوئی فلیپ نہیں ہے۔

ندیم کا یہ شعری مجموعہ ۱۷۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

اِس شعری مجموعہ کی قیمت ۔/۲۵۰ روپے مقرر کی گئی ہے۔

۱۳۔ندیم کی غزلیں (۱۹۹۱ء):

''ندیم کی غزلیں'' احمد ندیم قاسمی کی غزلوں کا کلیات ہے جو کہ سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور سے ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا۔ اِس کا انتساب ندیم نے فتح محمد ملک کے نام کیا۔ ندیم لکھتے ہیں:

اپنے محبوب بھائی
فتح محمد ملک
کے نام ۵۲

''ندیم کی غزلیں'' میں ۳۷۸ غزلیں شامل ہیں۔ جن میں ''لوحِ خاک'' کی ۶۵، ''دوام'' کی ۵۵، ''محیط'' کی ۱۲۵، ''دشتِ وفا'' کی ۵۶، ''شعلۂ گل'' کی ۳۶ اور ''جلال و جمال'' کی ۴۰ غزلیں شامل ہیں۔

''ندیم کی غزلیں'' میں متفرق اشعار کے عنوان سے ۲۴۸ اشعار درج ہیں۔

متفرق اشعار کے آغاز میں ''پیامِ مشرق'' کا یہ شعر درج ہے:

صد نالۂ شب گیرے، صد صبح بلا خیزے
صد آہ شرر ریزے، یک شعر دل آویزے ۵۳

غزلوں کا یہ کلیات ۸۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

اِس میں نہ کوئی دیباچہ ہے اور نہ ہی فلیپ درج ہے۔

اِس شعری مجموعے کی قیمت ۔/۵۰ ۷ روپے مقرر کی گئی ہے۔

ندیم کی نظمیں (۱۹۹۱ء):

''ندیم کی نظمیں'' ندیؔم کی نظموں کا کلیات ہے جو کہ سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور سے ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا۔ اِس کا انتساب ندیؔم نے منصورہ احمد کے نام کیا۔ انتساب کرتے ہوئے ندیؔم لکھتے ہیں:

اپنی پیاری بیٹی

منصورہ احمد

کے نام

جو میرا فخر بھی ہے

اور

اُردو نظم کی روشنی بھی۔ ۵۴

''ندیم کی نظمیں'' میں ۴۹۹ نظمیں شامل ہیں۔ جن میں ''لوحِ خاک'' کی ۶۰ نظمیں، ''دوام'' کی ۶۶، ''محیط'' کی ۱۰۷، ''دشتِ وفا'' کی ۶۳، ''شعلۂ گل'' کی ۵۸ اور ''جلال و جمال'' کی ۱۴۵ نظمیں شامل ہیں۔

''ندیم کی نظمیں'' میں ''رم جھم'' کے قطعات و رباعیات بھی شامل ہیں۔

نظموں کا یہ کلیات ۱۴۱۵ صفحات پر مشتمل ہے۔

اِس کلیات میں کوئی دیباچہ، مقدمہ اور فلیپ درج نہیں ہے۔

''ندیم کی نظمیں'' کی قیمت ۔/۱۲۰۰ روپے مقرر کی گئی ہے۔

حواشی

۱۔ احمد ندیم قاسمی، ''دھڑکنیں'' (انتساب)، لاہور، اُردو اکیڈیمی، باراوّل ۱۹۴۲ء، ص ۵،۶

۲۔ تاثیر، ڈاکٹر، ''پیش نامہ (دیباچہ)، دھڑکنیں''، ص۹

۳۔ احمد ندیم قاسمی، ''دھڑکنیں''، ص۶۹

۴۔ ایضاً، ص۱۰۷

۵۔ ایضاً، ص۲۱

۶۔ ایضاً، ص۷۶

۷۔ احمد ندیم قاسمی، ''رم جھم'' (انتساب)، لاہور، اساطیر، میاں چیمبرز، ۳۔ٹمپل روڈ، ۲۰۰۰ء، ص۳

۸۔ احمد ندیم قاسمی، ''رم جھم''، ''سرِ آغاز'' (طبع چہارم)، ص۸

۹۔ احمد ندیم قاسمی، ''رم جھم''، پیش کلام (طبع ہشتم)، ص۹

۱۰۔ تاثیر، ڈاکٹر، ''رم جھم''، پیش نامہ (دیباچہ)، ص۱۱

۱۱۔ احمد ندیم قاسمی، ''جلال و جمال'' (انتساب)، لاہور، اساطیر، میاں چیمبرز، ۳۔ٹمپل روڈ، چونتیسواں ایڈیشن، جون ۲۰۰۰ء، ص۴

۱۲۔ احمد ندیم قاسمی، ''جلال و جمال''، تمہید (دیباچہ)، ص۹

۱۳۔ احمد ندیم قاسمی، ''جلال و جمال''، ص۴۳

۱۴۔ ایضاً، ص۱۴۳

۱۵۔ ایضاً، ص۲۲۳

۱۶۔ ایضاً، ص۲۳۷

۱۷۔ ایضاً، ص۳۳۷

۱۸۔ ایضاً، ص۳۷۳

۱۹۔ احمد ندیم قاسمی، ''شعلۂ گل'' (انتساب)، لاہور، اساطیر، میاں چیمبرز، ۳۔ٹمپل روڈ، بتیسواں ایڈیشن، مارچ ۲۰۰۰ء، ص۶

۲۰۔ عبدالمجید سالک، ''شعلۂ گل'' (تعارف)، ص۱۲

۲۱۔ ممتاز حسین، ''شعلۂ گل'' (ایک نیا منصور)، ص ۱۶

۲۲۔ احمد ندیم قاسمی، ''دشتِ وفا'' (انتساب)، لاہور، اساطیر، میاں چیمبرز، ۳۔ ٹمپل روڈ، اکتیسواں ایڈیشن، مارچ ۲۰۰۰ء، ص ۶

۲۳۔ اسد اللہ خان، غالبؔ، ''دشتِ وفا''، ص ۱۵

۲۴۔ گورکھ پوری، فراقؔ، ''دشتِ وفا'' (دیباچہ)، ص ۱۸، ۱۷

۲۵۔ غلام رسول مہر، مولانا، ''دشتِ وفا'' (تکملہ)، ص ۲۸۴

۲۶۔ احمد ندیم قاسمی، ''دشتِ وفا''، ص ۱۱۳

۲۷۔ احمد ندیم قاسمی، ''محیط'' (انتساب)، لاہور، نقوش پریس، اکتوبر ۱۹۹۱ء، ص ۷

۲۸۔ احمد ندیم قاسمی، ''محیط''، ص ۱۶

۲۹۔ گورکھ پوری، فراقؔ، ''محیط'' (فلیپ)

۳۰۔ احمد ندیم قاسمی، ''دوام''، لاہور، مکتبہ اساطیر، ۴۵۔ اے، مزنگ روڈ، ایڈیشن پنجم، اکتوبر ۱۹۹۵ء، ص ۱۲، ۱۱

۳۱۔ احسان دانش، ''دوام'' (فلیپ)

۳۲۔ احمد ندیم قاسمی، ''لوحِ خاک'' (انتساب)، لاہور، اساطیر، بار اوّل فروری ۱۹۸۸ء، ص ۶

۳۳۔ احمد ندیم قاسمی، ''لوحِ خاک''، ص ۱۴

۳۴۔ احمد ندیم قاسمی، ''جمال'' (انتساب)، لاہور، بیاض، ۲۰ نومبر ۱۹۹۲ء، ص ۹

۳۵۔ احمد ندیم قاسمی، ''جمال''، ص ۱۸، ۱۷

۳۶۔ احمد ندیم قاسمی، ''بسیط'' (انتساب)، لاہور، اساطیر، ۴۵۔ اے، مزنگ روڈ، ۱۹۹۵ء، ص ۶

۳۷۔ عابد رضا بیدار، ڈاکٹر، ''بسیط'' (فلیپ)

۳۸۔ احمد ندیم قاسمی، ''ارض و سما'' (انتساب)، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۴

۳۹۔ ناہید قاسمی، ڈاکٹر، ''ارض و سما'' (پیش لفظ)، ص ۱۰

۴۰۔ احمد ندیم قاسمی، ''ارض و سما''، ص ۱۲

۴۱۔ احمد ندیم قاسمی، ''انوارِ جمال'' (انتساب)، مرتبین ناہید قاسمی، نفیسہ حیات قاسمی، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۵

۴۲۔ احمد ندیم قاسمی، ''انوارِ جمال''، ص ۶

۴۳۔ ناہید قاسمی، ''انوار جمال''، (دیباچہ) ''عرض مرتبین، ص۱۳

۴۴۔ احمد ندیم قاسمی، ''انوار جمال''، ص۱۹

۴۵۔ ایضاً، ص۲۵

۴۶۔ ایضاً، ص۳۵

۴۷۔ ایضاً، ص۱۰۵

۴۸۔ ایضاً، ص۱۱۹

۴۹۔ ایضاً، ص۱۲۴

۵۰۔ ایضاً، ص۱۲۵

۵۱۔ ایضاً، ص۱۵۷

۵۲۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں'' (انتساب)، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۶

۵۳۔ ایضاً، ص۷۷۷

۵۴۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی نظمیں'' (انتساب)، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۴

✿✿✿✿✿

باب سوم

غزل گوئی

غزل اُردو کی مقبول ترین صنفِ شعر ہے۔ غزل کے لغوی معنی عورتوں سے باتیں یا عورتوں کی باتیں کرنا ہے۔ ہرن کے منہ سے خوف کی وجہ سے جو دردناک آواز نکلتی ہے، اسے بھی غزل کہتے ہیں۔ جب غزل کا آغاز ہوا تو وہ حسن وعشق کی باتوں تک محدود تھا۔ یہ عشق خدا سے بھی ہوسکتا ہے اور گوشت پوست سے بنے انسان سے بھی۔ لہٰذا غزل کے معنی ہیں: معشوق سے راز و نیاز کی بات کرنا، اِس کے حسن، سراپا اور کرشمہ کا اظہار کرنا۔

بقول پروفیسر آل احمد سرور:

''غزل بہرحال زخمی غزال کی آہ یا تیر نیم کش یا محبوب سے باتیں کرنے کا نام ہے یعنی یہ عشقیہ اور غنائی شاعری ہے لیکن یہ عشق حقیقی بھی ہوسکتا ہے اور مجازی بھی۔ خدا سے بھی، محبوب سے بھی۔'' [۱]

اِس حوالے سے غزل وہ صنفِ شعر ہے، جس میں حسن وعشق کی مختلف کیفیات کا بیان ہو اور اِس میں درد وسوز بہت نمایاں ہو۔ غزل کے لیے ذاتی واردات کا ہونا ضروری ہے۔ کیوں کہ غزل اپنے طور پر زندگی کی واردات اور کیفیات پیش کرتی ہے۔ اصطلاحاً غزل کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں، جن کا مفہوم یہ ہے کہ غزل کے ہر شعر میں ایک مکمل مفہوم ادا ہوتا ہے۔ ہر شعر اپنا اپنا الگ مفہوم دیتا ہے۔

غزل کا فن دراصل اشاروں کا فن ہے اور یہ اشارے اپنے اندر داستانوں کو سمیٹے ہوتے ہیں۔ غزل میں زندگی کے حقائق کی عکاسی کی جاتی ہے۔ پوری غزل میں ایک بحر ہوتی ہے، غزل کا مطلع ہونا ضروری ہے۔ مطلع کے دونوں مصرے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں۔ یعنی پوری غزل ہم قافیہ و ہم ردیف یا صرف ہم قافیہ ہوتی ہے۔ باقی اشعار کے صرف دوسرے مصرعوں میں قافیہ و ردیف ہوتا ہے۔ بعض غزلیں غیر مردف بھی ہوتی ہیں۔ غزل کے آخری شعر مقطع میں شاعر عموماً اپنا تخلص استعمال کرتا ہے۔ بعض غزلوں کے درمیانی اشعار میں بھی تخلص لایا جاتا ہے۔ غزل گو کو ایسے امور میں کسی قدر آزادی ہوتی ہے۔

پرانے زمانے میں غزل کے اشعار کی تعداد عموماً پانچ سے سترہ تک ہوتی تھی۔ لیکن طویل غزلوں کی مثالیں بھی ملتی ہیں اور بعض اوقات شاعر ایک غزل کے بعد اِسی بحر اور ردیف قافیہ میں دوسری غزل کہہ لیتا تھا۔ جسے دوغزلہ کہتے تھے۔ بعض شعرا نے سہ غزلہ اور چہار غزلہ بھی لکھا ہے۔ لیکن جدید شعراء غزل میں اشعار کی تعداد اور

اُس کی پابندی کو بے معنی چیز سمجھتے ہیں۔

غزل کی زبان، دیگر اصنافِ شعر کے مقابلے میں سادہ، رواں، سلیس، شستہ اور بے ساختہ ہوتی ہے۔ تشبیہ و استعارہ اور صنائع بدائع کا مناسب استعمال غزل میں حسن و دل کشی پیدا کرتا ہے اور اِن کا بلاضرورت استعمال غزل کو بوجھل بنا کر اِس کے حسن کو مجروح کرتا ہے۔

عشق و عاشقی، غزل کا سب سے بڑا موضوع ہے اور اِس میں حسن و عشق کی مختلف کیفیات جن میں درد و الم، ہجر و وصال، سوز و گداز، محبوب کا ظلم و ستم اور اِس کی بے وفائی شامل ہیں، کا بیان ہوتا ہے۔ لیکن غزل میں کائنات اور زندگی کی طرح وسعت اور تنوع ہے۔ لہٰذا غزل میں سیاسی، مذہبی، معاشرتی، اخلاقی، تہذیبی، فلسفیانہ اور عاشقانہ موضوعات و مسائل پر اظہارِ خیال کیا جاتا ہے۔

شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''غزل کی ترقی کی منزل تصوف سے شروع ہوتی ہے۔ تصوف کا تعلق تمام تر واردات اور جذبات سے ہے اور اِس کی تعلیم کی پہلی ابجد عشق و محبت ہے۔'' ۲

معنی کے اعتبار سے غزل میں بڑا تنوع اور لچک ہے۔ غزل کا ہر شعر معنوی اعتبار سے ایک مکمل اکائی ہوتا ہے۔ جب کہ دیگر اصنافِ شعر میں عموماً خیال کا تسلسل پایا جاتا ہے۔ بعض اوقات غزل کے چند اشعار یا پوری غزل میں موضوع کا تسلسل موجود ہوتا ہے اور اسے قطعہ بند غزل کہتے ہیں لیکن غزل کی انفرادیت یہی ہے کہ اس کا ہر شعر اپنا الگ مفہوم رکھتا ہے۔ غزل کے آغاز میں ایرانی تہذیب کا بڑا دخل رہا۔ حیدر آباد (گولکنڈہ) اور بیجاپور میں کئی بادشاہ رقص و موسیقی کے دلدادہ تھے اور ایسی محفلیں سجاتے تھے۔ ایسے ماحول میں غزل پروان چڑھی۔ نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

''گولکنڈہ اور بیجاپور کی فضا عشق و عاشقی، شاہد اور شراب سے بھرپور تھی۔ رخساروں کی گل گونی، کرشمہ و غمزہ کی فراوانی، ناز اور عشوہ کی بوقلمونی، حسن اور ادا کی رنگین فضا تھی۔ یہی وہ ماحول تھا جس میں اصنافِ سخن سے غزل ہی پرورش پاسکتی تھی اور عروج حاصل کرسکتی تھی۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔'' ۳

غزل کے لیے ایرانی تہذیب لازم قرار پائی اور یہ وہ صنفِ سخن ہے جس کا وجود ایران (شعرائے فارسی)

کے اور کہیں نہیں ملتا۔ غزل کی بنیاد سب سے پہلے ایران میں رودکی کے ہاتھوں پڑی۔ شمالی ہند کی طرح دکن میں یہ اثر شمال سے کم نہیں تھا۔ بہت سے ایرانی شعراء دکن آ کر آباد ہو گئے لیکن دکن میں جن شعراء نے غزلیں کہی ہیں، اُن کی تعداد کم ہے اور اِن میں غزل کا انداز بھی کم پایا جاتا ہے۔

بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

> ''دکن میں ایک زمانہ تک غزل کے لیے ماحول پیدا نہیں ہوا۔۔۔ بعض شاعروں نے اِس زمانہ میں غزلیں لکھی ہیں لیکن اوّل تو اِن کی مقدار کم بہت ہے اور دوسرے اِن میں غزل کا انداز کم ہے۔'' ۴

لہٰذا غزل فارسی کے ذریعہ اُردو میں آئی۔ غزل اپنے آغاز میں کم کہی جاتی تھی اور اِس کی دنیا بہت تنگ تھی۔ اُردو کے قدیم غزل گو شعراء میں ولؔی نے غزل کہی۔ ولؔی کے بعد شمالی ہند میں بھی غزل پروان چڑھی اور حسن و عشق کے مضامین کو اِس میں بیان کیا گیا۔ عشق کے ساتھ تصوف اور زندگی کے متعلق اہم تجربات کو بھی غزل کا موضوع بنایا گیا۔ لکھنؤ میں جو غزل کہی گئی اُس میں خوشی اور سرمستی کی کیفیت چھائی ہوئی ملتی ہے۔

لکھنوی شاعری کے اِس دور کے بعد غالبؔ اور مومنؔ کا دور آتا ہے۔ غالبؔ نے زندگی سے متعلق بے شمار مسائل کو اُردو غزل میں شامل کیا۔ پھر اقبالؔ نے بھی یہ ثابت کیا کہ غزل میں فکری عناصر کے ساتھ ساتھ فلسفہ کو بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ فیضؔ نے غزل میں سیاسی شاعری کو پیش کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ غزل کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

> ''واقعیت ہو یا حقیقت، ظاہری زندگی ہو یا معنوی مجہولیت ہو یا عملیت، اُردو غزل میں اِن میں سے ہر ایک کا نیا جنم ہو رہا ہے اور نئے رنگ روپ سے نشو و نما ہو رہا ہے۔۔۔ سچی کاوش و تلاش اور زندگی کے نئے احساس اور وجدان اور جمالیات کی ایک نئی غرض و غایت کا پتہ موجودہ اُردو غزل سے مل رہا ہے۔'' ۵

احمد ندیم قاسمی کی غزل گوئی کا آغاز اُس وقت ہوا جب بہت سے شاعر غزل کہہ رہے تھے اور غزل کو عروج حاصل تھا۔ اُس وقت ایک طرف تو اقبالؔ کی غزل تھی جس کا میدان بہت وسیع تھا تو دوسری طرف داغؔ اور

میرؔ تھے، جن کا ہر طرف چرچا تھا۔ ندیمؔ نے اِن حالات کا مقابلہ کیا اور نہ صرف اپنی آواز پیدا کی بلکہ غزل میں اپنی انفرادیت کو قائم بھی رکھا۔ اِن کی غزلوں میں وسعت اور تنوع ہے اور وہ زندگی کے نشیب و فراز کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں۔ ندیمؔ نے شاعری کے آغاز میں غزل کی طرف توجہ نہ دی۔ کیوں کہ اِن کے چچا نے انہیں غزل سے مجتنب رہنے کا مشورہ دیا۔ ندیمؔ نے میٹرک سے فارغ ہونے کے بعد غزل کہی۔ اِن کی پہلی غزل کا شعر یہ ہے:

حل کرتا ہے افلاس کے عقدے وہ سخنور
جو ہاتھ میں تھامے ہوئے سونے کا قلم ہے ۶

ندیمؔ نے کل ۵۰۴ غزلیں لکھیں۔ جن میں ''جلال و جمال'' میں ۶۶ غزلیں، ''شعلۂ گل'' میں ۳۶، ''دشتِ وفا'' میں ۵۷ غزلیں، ''محیط'' میں ۱۲۵، ''دوام'' میں ۶۷، ''لوحِ خاک'' میں ۶۵، ''بسیط'' میں ۴۵، ''ارض و سما'' میں ۴۳ غزلیں شامل ہیں۔ ندیمؔ نے اپنی آخری غزل جون ۲۰۰۶ء میں لکھی جو کہ اِن کے آخری شعری مجموعے ''ارض و سما'' میں شامل ہے جو کہ تین اشعار پر مشتمل ہے:

یہ سوچ سوچ کے سب زندگی گزاری ہے
کہ آج اُس کی ہے اور کل ہماری باری ہے
زمیں پہ آدم و حوا کے ساتھ اُترا تھا
سو آنسوؤں کا یہ چشمہ ازل سے جاری ہے
بگولے رقص میں ہوتے ہیں جب تو سوچتا ہوں
کہ دشت پر بھی خُدا کا جمال جاری ہے ۷

ندیمؔ نے آغاز میں جو غزلیں کہی ہیں اُن میں حالات اور تصادم کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اِن حالات میں اِن کی غزل پر کبھی تو اقبالؔ کا اثر واضح دکھائی دیتا ہے اور کبھی داغؔ کا پرتو جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ ندیمؔ کی ابتدائی غزل پر کلاسیکیت کا رنگ خاصا گہرا ہے۔ اِس کی ایک وجہ کلاسیکی ادب کا مطالعہ ہے۔ اپنے مہربان چچا کی بدولت ندیمؔ نے نوعمری میں ہی کلاسیکی ادب کا اچھا خاصا مطالعہ کر لیا تھا۔ پانچویں جماعت سے ہی انہیں اِس کا درس ملنے لگا۔ حسان بن ثابت، سعدی، حافظ، غالبؔ، حالیؔ اور اقبالؔ کے اشعار سے شناسائی ہوئی۔ کلاسیکی شعرا کے صحیح طور پر مطالعے کا طریقہ سمجھا۔ اِسی لیے ان کے ہاں ابتدائی دور میں کلاسیکی آواز واضح سنائی دیتی ہے اور اکثر مقامات پر

مضامین بھی کلاسیکی شاعری کے ہیں۔ آغاز میں یہ کلاسیکیت داغؔ کے روایتی لب و لہجہ کو سامنے لاتی ہے جس سے احساس ہوتا ہے کہ ندیمؔ اِس شوخ وشنگ شاعری سے کسی حد تک متاثر ہیں۔

ے پھر عرش و فرش میں ہے قیامت مچی ہوئی
پھر جنبشیں ہیں یار کی نیچی نگاہوں میں ۸

ے وہ آڑ میں پردے کے تری نیم نگاہی
ٹوٹے ہوئے اِک تیر کا ٹکڑا ہے جگر میں ۹

ے یہ دھرا ہے گناہوں کا انبار
رحمتیں آپ ہی شمار کریں ۱۰

یہ کلاسیکی انداز ''جلال و جمال'' کی غزل پر بھی نمایاں نظر آتا ہے اور بعض جگہوں پر تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ندیمؔ نے قدیم اساتذہ کے مضامین و اسلوب کو اپنی غزل میں ڈھال لیا ہے۔ پرویز بزمی لکھتے ہیں:

> ''جلال و جمال کی شروع کی غزلوں میں نہ صرف موضوعات بلکہ اسلوب بھی کلاسیکی اردو غزل والا ہے۔ وہی نیم صوفیانہ خیالات، دیا اور پروانہ، بجلی اور آشیانہ، تیر اور نشانہ کے فرسودہ تلازموں میں بیان کر دیے گئے ہیں یا احساس کی ندرت دکھائی نہیں دیتی، ڈھلے ڈھلائے خیالات، ڈھلی ڈھلائی زبان میں ڈھال دیے گئے ہیں۔'' ۱۱

ندیمؔ کی غزل میں اساتذہ کے ہاتھوں پامال ہوتے ہوئے روایتی مضامین اِن کی فراری کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں جو کہ اِن کے گھریلو ماحول اور معاشی حالات کا ردِعمل تھے۔ آلام و مصائب کے یہ مضامین شاعر کو پناہ مہیا کرتے ہیں، جہاں وہ اپنے آپ سے ہم کلام ہوتا ہے:

ے اب تو ہیں اِس شوق گستاخانہ سے بیگانہ ہم
بس نظر سے چوم لیتے ہیں لب پیمانہ ہم ۱۲

ے مجھے بھی رُخصت تعمیر آشیاں دیجیے
چلے ہیں آپ اگر بجلیاں گرانے کو ۱۳

اس طرح خود کلامی سے شاعر اپنے دِل کا بوجھ ہلکا کر لیتا ہے۔ ندیمؔ کے ابتدائی کلام میں خود کلامی کے ذریعے اِن کی ذات کے دروازے آہستہ سے وا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اِس طرح اِن کے ہاں کلاسیکیت سیال مادے کی طرح مختلف شکلیں اختیار کرتی رہتی ہے۔ جمیل ملک نے ندیمؔ کی اِس کلاسیکیت کے تین انداز بتائے ہیں:

> ''پہلی صورت میں ندیمؔ اپنی غزل میں قدیم غزل کی اِن تمام خصوصیات سے استفادہ کرتا ہے جو ایک جان دار روایت کے طور پر آج بھی اُردو غزل میں موجود ہے۔ یہاں ریزہ خیالی کے جلو میں فکر و فن کا باہمی عمل بھی جاری و ساری رہتا ہے۔ دوسری صورت میں غزل کے ہیتی سانچے میں فکر جدید اپنے تمام تر تنوع کے ساتھ ڈھلتی اور غزل کے قدیم سانچے کو جدید فکری تقاضوں کے مطابق وسعت عطا کرتی چلی جاتی ہے اور تیسری صورت میں فکر و فن ارتفاع پا کر اور شاعر کی مکمل شخصیت کا اظہار بن کر یوں غزل میں راہ پاتے ہیں کہ ندیمؔ کی غزل کا منفرد رنگ اُجاگر ہو جاتا ہے۔'' ۱۴

''جلال و جمال'' کی غزلوں میں نہ صرف کلاسیکی انداز ہے بلکہ یہاں ندیمؔ کی طبیعت جدیدیت کی طرف بھی مائل نظر آتی ہے اور رفتہ رفتہ کلاسیکیت، جدیدیت سے ہم آہنگ ہو کر ندیمؔ کا اپنا منفرد اندازِ تشکیل دینے لگتی ہے۔ یوں ندیمؔ نے روایتی شاعری کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیا بلکہ روایت اور جدیدیت کے درمیان ایک ایسی کڑی بن گئے جس نے ۱۹۳۰ء کے بعد اُبھرنے والے شاعروں کی نسل اور کلاسیکی روایت کے درمیان موجود خلا کو پُر کرنے کا کام کیا۔ اِسی لیے اِن کے ہاں جدید ترین خیالات کے ساتھ روایت کا وہ احساس بھی ہوتا ہے جو اِن کے اکثر معاصرین کے ہاں معدوم ہے۔ حسن و عشق کی روایت اِن کے ہاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جس میں طرزِ بیان آخر تک روایت کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور یوں اِن کی غزل میں آخر تک کلاسیکی اسلوب کی جھلک ملتی ہے۔ ۱۹۴۰ء کی غزل میں ندیمؔ کہتے ہیں:

ناگاہ برق میرے نشیمن پہ آ گری
میں سوچتا رہا کہ مرا کیا قصور تھا ۱۵

۱۹۶۷ء میں یہ مضمون اِن الفاظ میں ہے:

تری رحمت تو مسلم ہے مگر یہ تو بتا
کون بجلی کو خبر دیتا ہے کاشانوں کی ۱۶

اور پھر ۱۹۹۹ء کا ایک شعر یوں ہے:

بجلیوں کو تو برسنا تھا سو برسیں شب بھر
ورنہ خرمن تھے بہت دُور مرے مسکن سے ۱۷

اِن اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اِن کی غزل میں کلاسیکی رنگ شروع سے آخر تک موجود رہا، البتہ رومانی رجحان اور ترقی پسند تحریک سے اِن کی وابستگی کی بنا پر یہ رنگ تغزل بعد میں نسبتاً مدھم پڑتا جاتا ہے لیکن موجود ضرور ہے۔ البتہ کلاسیکیت اِن کے ہاں اہم رجحان کی حیثیت اختیار نہیں کرتی بلکہ کلاسیکیت اِن کے اسلوب کی قابلِ ذکر صفت شمار کی جا سکتی ہے۔ کیوں کہ ندیم کا رجحان کلاسیکی نہیں ہے لیکن ان کے ادبی ذوق کی تشکیل میں کلاسیکی ادب کا رچا ہوا مطالعہ شامل ہے۔ کلاسیکیت کے علاوہ ندیمؔ کے ہاں کلاسیکی اساتذہ کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

''اپنی بعض خصوصیات کے لیے میرؔ، دردؔ، سوداؔ، مصحفیؔ، آتشؔ، مومنؔ، یگانہؔ، فانیؔ، فراقؔ، جوشؔ اور حفیظؔ بھی پسند ہیں۔'' ۱۸

ندیمؔ کے مطالعہ کی وسعت سے کلاسیکی شعرا کے ساتھ اِن کا لگاؤ بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کہیں کہیں سوداؔ کا انداز جھلکتا ہے:

مہمل ہے بہاروں کے لیے اسلحہ بندی
کیا کام ہے کلیوں کے چٹکنے میں سناں کا ۱۹

اِس طرح مندرجہ ذیل شعر سے دردؔ کے مطلع کی بازگشت سنائی دیتی ہے:

یوں تو اِس جلوہ گہ حسن میں کیا کیا دیکھا
جب تجھے دیکھ چکے، کوئی نہ تجھ سا دیکھا ۲۰

کلاسیکی اساتذہ میں ندیمؔ، غالبؔ کو بہت پسند کرتے ہیں۔ ندیمؔ ''پسِ الفاظ'' میں شامل غالبؔ کے مضمون میں اِن سے خصوصی لگاؤ کا ذکر کرتے ہیں:

''غالبؔ ایک عظیم تہذیبی ورثے کا آخری امین تھا۔ کسی نے کتنی حق بات کہی ہے کہ مغل تہذیب کا سارا حسن اور قرینہ غالبؔ کے اندازِ گفتار میں سمٹ آیا ہے۔ وہ یقیناً

اس تہذیب کا نوحہ خواں بھی ہے مگر اِن عظیم الشان ایوانوں کے کھنڈروں پر وہ سائے بھی
پڑتے دیکھ رہا ہے جو نئے عہد کے نقیب ہیں۔" ۲۱

اِس سے ندیمؔ کی غالبؔ سے عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ ندیمؔ نے اپنی پانچ غزلیں بھی غالبؔ کی نذر کی ہیں اور کئی ایسے اشعار کہے ہیں جنھیں پڑھ کر ذہن غالبؔ کے اشعار کی یاد دلا دیتے ہیں:

آبلوں پر جو حنا باندھے مجھے یہ بھی بتائے
کیوں بایں ہمہ درماندگی وارفتۂ منزل بھی ہوں ۲۲

جو مجھ سے پیار نہیں، میرا انتظار ہے کیوں
نہیں ہوں دِل میں، تو کیوں تیری چشمِ تر میں ہوں ۲۳

اپنے ایک انٹرویو میں بھی ندیمؔ نے غالبؔ سے اپنی عقیدت کا اظہار یوں کیا ہے:

"اُردو میں مجھے غالبؔ سے زیادہ کوئی شاعر پسند نہیں ہے۔ میں نے گزشتہ سال کہا تھا:

ہو کیوں نہ مجھ کو اپنے مذاقِ سخن پہ ناز
غالبؔ کو کائناتِ سخن کا خدا کہوں

برسوں پہلے ایک غزل کے مقطع میں بھی میں نے کچھ ایسی بات کہی تھی:

کون غالب سا سخن ور ہے ندیمؔ
سینکڑوں یوں تو ہنرور دیکھے

میں ہنروری کی بجائے سخن وری کا شیدا ہوں، ورنہ ہنروری سے تو ساری تاریخ ادب بھری پڑی ہے۔ غالبؔ مجھے ہمہ جہت پسند ہے۔" ۲۴

ندیمؔ کی غزل پر کلاسیکی اساتذہ اور کلاسیکی اُردو شاعری کی روایت کے اثرات کے متعلق مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

"کلاسیکی شعر و ادب سے یہ باخبری ندیمؔ کے کلام کو تاریخی تسلسل بنا دیتی ہے۔ ان کی شاعری کا ایک بڑا اہم رول یہ ہے کہ اس نے اِس درمیانی مدت کو جو ایک جانب اقبال اور جوش اور دوسری جانب جدید نسل کے شعرا میں واقع ہوئی ہے۔ بڑی یقین دہانی اور شعری بصیرت کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔" ۲۵

ندیم اِن شعرا کے قریب رہتے ہوئے بھی نفسیاتی طور پر جستجو اور تلاش میں مگن ہے جس نے انہیں ایک ایسی خودکلامی سے نواز دیا جس نے آگے چل کر اسے خودآگہی میں تبدیل کر دیا۔ غزل کے ذریعہ زندگی کی حقیقتوں کو پرکھنے اور اِس سے اپنی ذات کو ڈھونڈنے کی یہی لگن ہی تھی جس نے ندیم کی غزل کو اپنے عہد کی مضبوط ترین روایت سے قریب تر کر دیا اور اُس کی آواز اقبال کی غزل سے مَس ہونے لگی۔ ندیم فکری اعتبار سے بھی اقبال سے بہت متاثر رہے ہیں اور مثبت انداز میں اقبال کا اثر قبول کیا اور اِن کی روایت کو پروان چڑھایا۔ اِن کے ہاں اقبال کا واضح اثر عظمتِ انسان کے تصور میں نظر آتا ہے۔ اقبال کی طرح اِن کا نظریہ بھی خیر کی قوتوں کو فروغ دینا تھا۔ دونوں کے نزدیک احترام کا مرکزی نقطہ انسان ہے۔ بقول یوسف حسن:

> ''ندیم کا تصورِانسان اقبال کے مردِ مومن کا ترمیم وتبدیل کے ساتھ تسلسل ہے۔ وہ اسے اقبال کے تصورِانسان کی توسیع قرار دیتے ہیں۔'' ۲۶

اقبال اور ندیم دونوں عالم گیر سوچ کے حامل تھے اور انقلاب کے مبلغ تھے جو حق دار کو اُس کا حق دلا دے۔ ''شعلہ گل'' تک پہنچتے پہنچتے اقبال کے اثرات کم ہونے لگتے ہیں لیکن غزل میں کہیں کہیں اِن کا اسلوب جھلکتا ہے اور رمِ حیات، ضمیرِ دہر، درسِ خودی، پیکرِ آدم، ذوقِ عبودیت جیسی تراکیب سے اقبال کے لہجے کی غماضی ہوتی ہے۔ اگرچہ ندیم کی غزل اقبال کی غزل سے متاثر ضرور ہوئی لیکن کبھی ان سے مغلوب نہ ہو سکی کیوں کہ اُنھوں نے اپنی ذات کو تلاش کرنے کا عمل جاری رکھا۔ یہی کوشش اُنہیں جدیدیت سے ہم کنار کرتی ہے۔ ایسی جدیدیت جس میں کلاسیکیت کا رنگ تو تھا لیکن دھیرے دھیرے اُس نے روحِ عصر کو ندیم کی غزل کے آہنگ میں ڈھال دیا۔ ندیم کے ہاں انقلاب کی خواہش کی وجہ سے ان کے ہاں زمینی مسائل اُبھرنے لگتے ہیں اور ایک انقلابی لہجہ اور اسلوب میں طنطنہ پیدا ہونے لگتا ہے۔ الفاظ میں ایک گھن گرج سی محسوس ہوتی ہے۔ جو ندیم کے ہم عصر شاعر جوش کے ساتھ مخصوص ہے۔ ۱۹۵۰ء کے بعد کی غزلوں میں جوش کا جوشِ بیان اپنے اثرات کی جھلک دکھاتا ہے۔

> تیرے ہی غموں نے مجھ کو بخشی
> کوندے کی لپک، غزال کا رم ۲۷

؎ رہے اسیر قفس در قفس بہار میں ہم
مگر حقیر نہ تھے چشم روزگار میں ہم ۲۸

اِن اشعار میں ندیمؔ کے ہاں جوشؔ کے اثرات واضح نظر آتے ہیں۔۱۹۵۲ء کے بعد اِن کے ہاں اقبالؔ اور جوشؔ کے اثرات ختم ہونے لگتے ہیں اور فیض احمد فیضؔ کے لہجے کی گونج سنائی دیتی ہے۔''دشتِ وفا'' تک پہنچتے پہنچتے فیضؔ کے اثرات زیادہ ہونے لگتے ہیں۔ مثلاً:

؎ ہم اگر دار پہ کھنچتے بھی تو اے صاحب دار
اپنی ناکردہ گناہی کی قسم ہو جائے ۲۹

؎ جو پھول کھلا اِس میں گھلا خون ہمارا
جو جام بجا اس میں کھنک آئی ہماری ۳۰

جس طرح فیضؔ مایوسی کے عالم میں بھی نااُمیدی کا شکار نہیں ہوتے، اُسی طرح ندیمؔ بھی اُمید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔

؎ ہم گونج ہیں ساز ارتقاء کی
گونجیں گے ابھی زماں زماں ہم ۳۱

ندیمؔ نے فیضؔ ہی کے استعاراتی انداز میں کنج قفس، صحن زنداں، دار و رسن، قتل گاہ وغیرہ جیسی تراکیب استعمال کی ہیں۔ اِن کو بھی فیضؔ کی طرح جیل جانے کا تجربہ ہوا۔ اِس لیے دونوں نے ایک جیسے مضمون باندھے۔

؎ موسم گل کو اگر اس حال میں آیا بھی تو کیا
خون گل، چہرۂ گلزار پہ مل جائے گا ۳۲

لیکن ندیمؔ حبسیہ شاعری میں فیضؔ سے سبقت نہ لے سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دونوں کی جیلوں میں بھی بڑا فرق تھا۔ فیضؔ ایک بہت بڑی سازش کے سلسلے میں قید ہوئے تھے۔ جب کہ ندیمؔ محض حفاظتی اقدام کے تحت کچھ عرصہ کے لیے نظر بند رہے تھے۔

فیض کا شعر ہے:

؎ جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا ۳۳

ندؔیم یہی بات یوں کہتے ہیں:

رُکے جو لوگ تو اِک آب جو بھی دریا تھی
اُتر گئے تو سمندر بھی تا کمر نکلے ۳۴

غزل میں فیضؔ کی نسبت ندؔیم کا اسلوب سادہ اور رواں ہے۔ ان کی غزلوں میں داخل اور خارج کی آویزش ہے۔''شعلۂ گل'' کی غزلوں میں ''جلال و جمال'' کی نسبت زیادہ توانائی اور نکھار ہے۔''جلال و جمال'' میں ایک طرف ظلمت ہے تو دوسری طرف نور۔''شعلۂ گل'' میں ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۲ء کی غزلیں شامل ہیں۔ وقت اور حالات کی تبدیلی کی وجہ سے دونوں کے موضوعات میں فرق ہے۔''جلال و جمال'' میں عشقیہ شاعری کا اثر نمایاں ہے اور''شعلۂ گل'' کی غزلیں اِن کے وسعت ذہن کی غمازی کرتی ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد کی غزل کا ناتا محبت اور غمِ جاناں سے گزرتا ہوا عصری حالات کے ساتھ بھی جڑنے لگتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ ایسی منزل آتی ہے کہ جہاں ندؔیم محبت کے عطا کردہ ذوقِ نظر سے خدا، کائنات اور انسان کے باہمی رشتوں کا مطالعہ کرنے لگتا ہے۔ یوں محبت کا جذبہ ذات کے حصار سے پھیل کر تمام سماجی رشتوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

ندؔیم کی غزل میں موضوعات کی رنگا رنگی ہے۔ اِن کے ہاں محبت اور محبوب سے متعلق منفرد خیالات نظر آتے ہیں۔ عشق تو اُردو غزل کا ایک بنیادی موضوع رہا ہے۔ ندؔیم نے بھی اِس موضوع کو خوب برتا ہے۔ اُردو شاعری میں بالعموم اور اُردو غزل میں بالخصوص محبت کے اِس لطیف اور نفیس احساس کے خوب صورت پہلوؤں کی حسین اور دل فریب عکاسی ہر دور میں ہوتی آئی ہے اور ہر شاعر نے اپنے مزاج کے مطابق اِسے فنِ شعر کے سانچے میں ڈھالا۔ تصورِ محبت کا یہ موضوع صنف غزل کی جان ہے۔ ندؔیم نے بھی اپنی غزل میں اسے خوب صورتی سے برتا ہے۔ ندؔیم کو اپنی ذاتی زندگی میں بھی اِس الوہی جذبے جسے 'محبت' کہتے ہیں، آشنائی ہوئی۔ اِن کے آغاز کی تحریریں اِس بات کی غماز ہیں کہ ندؔیم نے کسی ایک شخص سے بے پناہ محبت ضرور کی ہے اور جسے وہ نہ پا سکے۔ اِس تجربے کی مدت ایک سال تک ہی محیط ہے مگر اِس کے گوناگوں اثرات سے ندؔیم کی ادبی شخصیت کا ایک واضح مزاج متعین ہوتا ہے اور محبت کا یہ تجربہ اِس قدر شدت اور گہرائی رکھتا ہے کہ ندؔیم کے ہاں جذبہ اور فکر دونوں اس کی انگلی پکڑتے چلتے نظر

آتے ہیں۔ ندیم کا امتیاز یہ ہے کہ جس طرح صبوحی اِن کے ہاں ایک ارضی اور حیاتی سطح پر محبت کی علامت بن کر سامنے آئی ہے، اسی طرح اِن کی غزل بھی محبت کا ایک ارضی تصور پیش کرتی ہے۔ جہاں محبت جسمانی پہلو کو بھی مدنظر رکھتی ہے۔ یہاں حسن سے احتراز نظر نہیں آتا بلکہ اِس جذبے کو اِس کے پورے اسرار سمیت قبول کرلیا جاتا ہے اور کہیں بے باکانہ پردہ دری نظر نہیں آتی۔

سمٹ گیا میری بانہوں میں جب وہ پیکر رنگ
تو اِس کا رنگ مجھے دُور تک نظر آیا ۳۵

ندیم کو محبت نے اُس وقت سہارا دیا جب وہ اپنی زندگی کے مایوس کن دور سے گزر رہے تھے۔ ''جلال و جمال'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''۱۹۳۷ء۔۱۹۳۶ء کے درمیانی عرصہ میں میری الم ناک زندگی کے تاریک اُفق پر اچانک ایک کوندا سا لپکا اور عام کوندوں کی طرح بجائے چمک کر تاریکیوں کے گھل جانے کے، اندھیرے کا ایک سنہری عنوان بن کر وہیں جم کر رہ گیا۔ کف در دہاں احساسات میں بالیدگی پیدا ہونے لگی، دکھ سکھ کے معیار بدلنے لگے، زندگی پر سے گردوغبار کی تہیں اُکھڑنے لگیں اور میری ذہنی کلبیت ایک خوش گوار، نرم اور معصوم تبسم میں گھل کر کھو جانے لگی۔۔۔ ۱۹۳۷ء کے اواخر میں یہ کوندا تاباں رہنے کی ایک دردناک اور مایوسانہ کوشش کے بعد بجھ کر رہ گیا اور میرے خیالوں کے گلابی کہرے میں ایسی سرمئی لہریں دوڑا گیا، جن کا آغاز کوندے کا غروب تھا اور انجام ہنوز ناپید ہے۔'' ۳۶

ندیم کو خوب صورت، یتیم، غریب دیہاتی لڑکی سے محبت تھی۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب ندیم لکھنے کے میدان میں تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ ندیم نے اُس لڑکی کی خاطر گاؤں سے نکل کر شہر کا رُخ کیا۔ جہاں چھوٹی چھوٹی نوکریاں کر کے اُس کے لیے روپے جمع کیے مگر جب گاؤں پہنچے تو اُس لڑکی کی شادی ہو چکی تھی۔ اِس کا اثر نہ صرف اِن کی شخصیت پر شدید ہوا بلکہ اِن کی تخلیقات میں اِس جذبے کا واضح اثر دکھائی دیتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ندیم اِس تجربے کو ہر ہر پہلو سے محسوس کر رہے ہیں۔ ندیم نے اپنے جذبات واحساسات کو شاعری کا پیرایہ عطا کیا۔ ۱۹۳۶ء کے اشعار اِن کے تجربات کا ہی نتیجہ نظر آتے ہیں۔

محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ اِس کے سینکڑوں روپ ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ اگرچہ اِس کے انداز اور معیار بدل جاتے ہیں لیکن یہ انسانی احساس کبھی ختم نہیں ہوا۔ اِس جذبے کی وجہ سے کئی عاشقوں نے جستجو اور کوشش کے ذریعے حیرت انگیز کارنامے سرانجام دیے ہیں۔

بقول ڈاکٹر سنبل نگار:

''غزل کی مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اِس کا خاص موضوع عشق رہا ہے اور عشق وہ جذبہ ہے جس سے کوئی دل خالی نہیں، یوں کہ عشق کے ہزار روپ ہیں۔۔۔ جذبۂ عشق کی تاثیر مسلم ہے۔'' ۳۷

ندیم کی ابتدائی دور کی غزل میں محبت کے احساس کی وجہ سے کہیں کہیں بے خودی کی سی کیفیات نظر آتی ہیں۔ ندیم محبت کی اِس کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

محبت ایک ایسا جذبہ ہے جس نے دلوں کو گرمایا اور قلب و ذہن پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اِسی احساس نے جرأت و بے باکی کو اُبھارا اور قربانی دینا بھی سکھایا۔ لیکن اُمید و جستجو کا درس بھی دیا۔ ندیم نے بھی عشق میں پیش آنے والی کیفیات کو بیان کیا۔ اِن کی غزل میں عاشق کے ساتھ ساتھ محبوبہ کا کردار بھی بڑا واضح ہے۔ اِن کی شخصیت اِن کے اشعار میں واضح طور پر سامنے آتی ہے۔

ے اِک روز اِس طرح بھی مرے بازوؤں میں آ
میرے ادب کو، تیری حیا کو خبر نہ ہو ۳۸

ے وہ ترے جسم کی قوسیں ہوں کہ محرابِ حرم
ہر حقیقت میں ملا خم تری انگڑائی کا ۳۹

ے تو پکارے تو چمک اُٹھتی ہیں میری آنکھیں
تیری صورت بھی ہے شامل تری آواز کے ساتھ ۴۰

ندیم کی محبوبہ اِن کی عشقیہ شاعری میں اِن کا جسم و جاں بنتے ہوئے داخل ہوتی ہے جو کہ اِن کے شعور

کا نمونہ ہے۔ کیوں کہ اِن کا عشق رومانی، رسمی اور سطحی نہیں بلکہ اِس کی بنیاد بھی حقیقت اور واقعیت پر استوار ہے۔ ندیمؔ بھی عشق میں پیش آنے والی کیفیات کو بیان کرتے ہیں۔ فتح محمد ملک اِن کی غزل کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''حسرتؔ اور فراقؔ کے ہاں جسم کی خوشبو اور روپ طلعت کے جلوے دیدنی ہیں۔ ندیمؔ نے سلگتے دل کی معصومیت اور دہکتے ذہن کی کرشمہ سازی سے اِن جلوؤں میں جو انوکھے تیور پیدا کیے ہیں، وہ اور بھی زیادہ دیدنی ہیں۔'' ۴۱

ندیمؔ کے نزدیک محبت انسان کا سب سے بڑا حسن ہے۔ یہ اندازِ فکر اِن کی عشقیہ شاعری میں ندرت پیدا کرتا ہے۔ ندیمؔ جب غزل میں اپنے عشق کے جذبات اور محبوب کے حسن کی ترجمانی کرتے ہیں تو اِس کا رشتہ آفاق کی وسعتوں کے ساتھ استوار کر لیتے ہیں۔

ے شام کو صبح چمن یاد آئی
کس کی خوشبوئے بدن یاد آئی
جب خیالوں میں کوئی موڑ آیا
تیرے گیسو کی شکن یاد آئی
چاند جب دور اُفق پر ڈوبا
تیرے لہجے کی تھکن یاد آئی ۴۲

ندیمؔ نے اپنے محبوب کے حسن کی جن کیفیات کو بیان کیا ہے، اُن میں اِس کے حیا کو بھی اپنی غزل کا موضوع بنایا ہے۔ کیوں کہ ندیمؔ کو محبوب کا حیا اُس کی صفات میں خاص طور پر پسند ہے اور وہ اِس سے متاثر ہیں جو کہ اُن کے سچے عاشق ہونے کو ثابت کرتی ہے۔ بلکہ اُن کے دل اور روح کا یہ گداز اُن کی دونوں طرف کی محبت کی وجہ سے ممکن ہوا۔ ندیمؔ کہتے ہیں:

ے مجھ سے کترا کے نکل جا مگر اے جانِ حیا!
دِل کی لو دیکھ رہا ہوں ترے رخساروں میں ۴۳

ے جھکتی نظریں بتا رہی ہیں
میرے لیے تُو بھی سوچتا ہے ۴۴

ندیم اپنے محبوب کے حسن کا ذکر بڑے فخر سے کرتے ہیں کیوں کہ اِس کے حسن کی کشش انوکھی تھی۔ جس نے اُن کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ محبوب کے حیا کو اگر چہ ندیم پسند کرتے ہیں لیکن اُنھوں نے محبوب کو یہ بھی سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ حد سے زیادہ حیا بھی درست نہیں ہے۔ دِل کی بات اپنے لبوں تک لے ہی آنی چاہیے۔

ے اظہار ، نماز ہے وفا کی
توفیق اگر تجھے خدا دے ؎۴۵

ے مجھے تسلیم ہے ، تو نے محبت مجھ سے کی ہو گی
مگر حالات نے اظہار کی مہلت نہ دی ہو گی ؎۴۶

جب اُن کا محبوب اِس کا اظہار کرتا ہے تو:

ے ہم تو خوش ہیں ترے اظہارِ محبت سے مگر
آئینے اب تری صورت نہیں پہچانیں گے ؎۴۷

ندیم رومانی ذہن رکھنے کی وجہ سے بڑے حسن پسند ہیں اور حسن کی پاکیزگی کو قیمتی گردانتے ہیں۔ اسی رومانیت نے اِن کے احساسِ جمال کو خوب نکھارا ہے۔ عشق کے لیے ضروری ہے کہ محبوب گوشت پوست کی تصویر ہو۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

''اپنی ابتدائی صورت میں عشق جذبے کے والہانہ اظہار کی ایک صورت اور گوشت پوست کی ایک خاص ہستی کا طالب ہے۔'' ؎۴۸

ندیم کا محبوب بھی گوشت پوست کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ندیم اور اُن کا محبوب دونوں ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے ہیں۔ ندیم اپنی محبت کے اظہار کے لیے الفاظ کو ضروری نہیں سمجھتے بلکہ اُن کے خیال میں خاموشی کی بھی اپنی زبان ہے۔

ے ہر دیس کی اپنی اپنی بولی
صحرا کا سکوت بھی صدا ہے ؎۴۹

ے میں تیرے کہے سے چپ ہوں لیکن
چپ بھی تو بیانِ مدعا ہے ؎۵۰

ندیم اپنی محبت کے لیے ہر غم کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہے۔ کیوں کہ اُنھوں نے محبت کی کیفیات کو دل سے محسوس کیا۔ اِسی احساس کی وجہ سے اِن کے اشعار پُر تاثیر ہیں۔ اپنے محبوب سے دُوری بھی محبت کی شدت کی وجہ سے دُوری محسوس نہیں ہوتی بلکہ اپنے اندر کے اضطراب کو سمجھنے کی وجہ سے اپنے جذبات پر اُن کو قدرت حاصل ہوگئی۔

ے تجھ سے کس طرح میں اظہارِ تمنا کرتا
لفظ سُوجھا تو معانی نے بغاوت کر دی ۵۱

ندیم کو اپنے محبوب سے شدید محبت تھی۔ اِسی محبت کی وجہ سے وہ عشق کے میدان میں ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔

ے رُخ بدل دوں گا صبا کا ترے کوچے کی طرف
اور طوفان کو اپنا ہی پتہ دے دوں گا ۵۲

انسانی دل پر گزرنے والی کیفیات اور دُکھوں کو برداشت کرنے اور اُسے جھیلنے کی وجہ سے غزل میں آفاقیت پیدا ہوتی ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی رقم طراز ہیں:

''غزل میں قلبِ انسانی اور اِس پر گزرنے والی مختلف کیفیات کی نشان دہی ہی غزل کو جذباتی اور باطنی جہت عطا کر کے اِس میں آفاقیت پیدا کرتی ہے۔'' ۵۳

ندیم کہتے ہیں:

ے عشق جنون سہی ، مگر عشق فقط جنوں نہیں
ہوتے ہیں کچھ مطالبے عشق سے آگہی کے بھی ۵۴

ے لب ریز جمال ایک کا دِل ، ایک کا پہلو
اتنا سا فقط فاصلہ ہے خیر سے شر تک ۵۵

عشق ایک ایسی طاقت ہے جو تکلیفوں اور مصیبتوں میں جرأت و حوصلہ عطا کرتی ہے اور محبوب کی محبت کی تمنا اِسے متجسس رکھتی ہے اور اِسے محبت کی لازوال دولت سے مالا مال کر دیتی ہے۔

ے کوہ کاٹیں گے کبھی ، دشت کبھی چھانیں گے
ہم تو اے عشق ، سدا تیرا کہا مانیں گے ۵۶

ندیم کی غزل میں عشق کی جلوہ آفرینی بھی ملتی ہے۔ اُنھوں نے محبوب کے حسن وعشق اور عاشق ومحبوب کے کردار اور تشخص کو اُبھارا ہے۔ ندیم کو کیوں کہ حسن اور رنگینی کی خواہش ہے اور وہ حسن پر سر دھنتے ہیں۔ ان کی غزلیں اِس بات کی غماز ہیں کہ حسن کا کرشمہ اِن کے دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور وہ اِس کی طرف کھنچتے بھی ہیں۔

ے   لب ہی لب ہے تو کبھی اور کبھی چشم ہی چشم
نقش تیرے تری صورت نہیں بننے دیتے   ۵۷

انسان کی فطرت ہے کہ وہ حسن سے محبت کرتا ہے اور اُسے پانے کی خواہش کرتا ہے۔ حسن کے حوالے سے ڈاکٹر نصیر احمد ناصر لکھتے ہیں:

> ''روح چوں کہ اپنے معروضِ حسن وعشق کی شاہد ہے۔ اس لیے اسی کی آرزو وجستجو میں رہتی ہے اور ہر حسین چیز سے پیار کرتی ہے۔۔۔ حسن ہر حال میں سچ، قرۃ العین اور محبوب ومطلوب ہے۔ چاہے وہ کسی شکل وصورت، قد وقامت، رنگ وبُو، آواز وآہنگ اور ناز وادا میں جلوہ پیدا کرے۔'' ۵۸

ندیم کا محبوب بھی جو کہ حسین ہے اور وہ ان کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور اس کے حسن میں ایسی کشش ہے کہ وہ فریفتہ ہو جاتے ہیں۔

ے   جس بھی فن کار کے شاہکار ہو تم
اس نے صدیوں تمھیں سوچا ہو گا   ۵۹

اُردو غزل میں شاعر کو رقیب سے بہت سی شکایات ہوتی ہیں اور وہ اُسے محبوب کے قرب میں رکاوٹ سمجھتے ہیں لیکن ندیم کے ساتھ ایسا نہ تھا۔ اُن کو اِس سے نفرت نہ تھی بلکہ وہ تو اِسے محبت میں شدت اور گہرائی پیدا کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں کیوں کہ اِن کو محبت کے احساسات کی دولت نے مالا مال کر دیا ہے۔ اِس لیے اِن کا رقیب سے انوکھا رشتہ ہے۔

ے   دیارِ عشق کا یہ حادثہ عجیب سا تھا
رُخِ رقیب پہ بھی پرتو حبیب سا تھا   ۶۰

ندیم محبت کی خاطر قربانی دینے کا بھی حوصلہ رکھتے ہیں کیوں کہ اُن کو اپنی محبت پر اعتماد ہے۔ اِس لیے

وہ محبوب کا ظلم و جور برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

ے اب تم آئے ہو تو مری جاں، زحمتِ لطف و کرم نہ کرو
گل کیا، آنسو تک نہیں رُکتے پھٹے ہوئے دامانوں میں ۶۱

کیوں کہ ندیم کو اپنا محبوب نہ مل سکا اور جدائی اِن کا مقدر بن گئی۔ اِس محبت کے زخم کی شدت تو اُنھوں نے جھیل لی مگر اِس محبت کو عمر بھر کے لیے اپنے ساتھ رکھ لیا اور کبھی اِس کا تجربہ اور کبھی اِس کا تجزیہ کر کے ایک ایسا تصورِ محبت تشکیل دینے کی کوشش کی جس کے ہالے میں پوری انسانی برادری آنے لگتی ہے۔ ندیم کو اپنے محبوب کی توجہ حاصل رہی لیکن اِس کے باوجود محبوب تک مکمل رسائی نہ ہوئی جس کا دُکھ اُن کو برداشت کرنا پڑا۔

ے میرے نیاز کی تکمیل کس طرح ہو گی
اگر میں پا نہ سکا تیری بے رُخی کا جواز ۶۲

ندیم کو محبت کے حصول میں ناکامی کے بعد محبت اور زندگی دونوں بارگراں ہیں۔ جنھیں مجبوراً اُٹھانا پڑتا ہے۔ محبت کے معاملے میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر قریۂ محبت میں جس جذباتی وسعت کا خواست گار تھا وہ اُسے میسر نہ آ سکی اور تشنگی کا یہ احساس اسے حسن کا سامنا کرنے کی خواہش پر مجبور کرتا ہے۔

ے آپ کیوں سامنے نہیں آتے
آپ کیوں روح میں سمائے ہیں ۶۳

ندیم محبوب سے کیے گئے وعدوں کو یاد کرتے ہیں اور اُس کے ساتھ گزارے پلوں کا بھی ذکر کرتے ہیں۔

ے تیرے وعدے ہوں جن کے شاملِ حال
وہ اُمنگیں کہاں سماتی ہیں ۶۴

ے تیری یادیں کبھی ہنستی تھیں کبھی روتی تھیں
میرے گھر کے یہی ہیرے تھے، یہی نیلم تھے ۶۵

عشق کے میدان میں ناکامی پر عاشق کو غم اور آنسو تحفے میں ملتے ہیں لیکن ندیم ان آنسوؤں کی حفاظت کرتا ہے اور

انہیں قیمتی گردانتا ہے۔

؎ آپ رستہ نہ بھول جائیں کہیں
آنسوؤں نے دیے جلائے ہیں ۶۶؎

محبت کے دُکھ تو ندیم سہتے ہیں لیکن اِس دُکھ اور کرب نے انہیں مایوس نہیں ہونے دیا بلکہ اِس نے اِن کی ذات کو اعتماد بخشا اور انہیں خودداری اور جرأت عطا کی۔

؎ میں محبت کے سفر میں نہیں بھٹکوں گا کبھی
اپنے قدموں سے چمکتا ہوا رستہ دیکھو ۶۷؎

حالات کی تلخی اور محبت میں ناکامی کے باعث یہ تصورات زیادہ دیر تک ساتھ نہیں دیتے بلکہ اِن کے ہاں ذہنی الجھنوں اور حالات کی شدت کے خلاف اُبھرتا ہوا احساس نظر آتا تو ہے مگر وہ مایوس کبھی دکھائی نہیں دیتے بلکہ اِن حالات پر مسکراتے ہیں۔ یہ مسکراہٹ کہیں تو حالات کے سامنے بے بسی کے اظہار کے طور پر تو کہیں حالات کے مقابلے کی خواہش کا اظہار۔

؎ مجھے اور زندگی دے کہ ہے داستاں ادھوری
مری موت سے نہ ہو گی مرے غم کی ترجمانی ۶۸؎

ندیم کو اپنے محبوب کا انتظار بھی رہتا ہے۔ اِس انتظار کی تکلیف اِن کے لیے اکتاہٹ کا باعث نہیں بنتی۔ اِس لیے تو ندیم کہتے ہیں:

؎ کل جب تیرے آنے میں کچھ دیر ہوئی تھی
میں نے زمیں کی گردش کی آواز سنی تھی ۶۹؎

ندیم کے ہاں افلاطونی محبت بھی ملتی ہے اور محبت کے وہ تصورات بھی نظر آتے ہیں جو اُردو شاعری کے تصورِ عشق سے معنون ہیں۔ جو کہ اپنی اصل میں کلاسیکی اُردو شاعری کا رسمی عاشقی کا انداز ہے۔ مگر یہ انداز کچھ ہی عرصہ برقرار رہا اور جب یہ جذباتی واردات اِن کے قلب کی گہرائیوں تک پہنچ کر اِن کی شخصیت کا حصہ بن جاتی ہیں تو ندیم کے لیے ایک لحاظ سے جذباتی سہارا بننے لگتی ہیں اور وہ فراق و وصال ہر دو مراحل کو یکساں سمجھنے کی منزل پر پہنچنے لگتے ہیں۔ ندیم کی محبت اِن کی شعری رفعتوں میں اِن کی معاون رہتی ہے۔ وہ خود بھی سمجھتے ہیں کہ مجازی عشق

کا تجربہ کسی شخص کو بھرپور شعری تجربے کے قابل بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ندیم جب جوانی میں شہر آئے تو محبت کا زخم ابھی ہرا تھا۔ اُس وقت اختر شیرانی جیسے مہربان دوست نے انہیں سہارا دیا۔ ندیم ان کے پاس اپنے غموں کا تریاق تلاش کرنے کے لیے جاتے رہے۔ عذرا اصغر اِن کے متعلق لکھتی ہیں:

> ''رفتہ رفتہ اِن کے طلسم خیال میں پختگی آتی گئی اور رومانی عنصر کم ہوتا گیا لیکن مکمل طور پر رومینٹک ازم کو ختم نہیں کر پائے۔ وہ ''چاہے جانے'' کی خواہش میں مبتلا رہے۔''[۷۰]

ندیم، اختر شیرانی سے محبت اور قدر کے جذبات رکھتے تھے لیکن اُنھوں نے خود کو اِن کے رنگ میں رنگنے نہ دیا اور سلمیٰ، عذرا اور ریحانہ کا شکار ہونے سے خود کو بچایا۔

انیسویں صدی کے آخر میں سرسید تحریک کی وجہ سے اُردو ادب ایک زاہد خشک کی مثال بنتا جا رہا تھا۔ جہاں ہر تحریر اصلاحی مقاصد کے لیے وقف ہوتی تھی۔ اس تحریک کے ردِعمل میں پہلے ''اودھ پنچ'' اخبار سامنے آیا۔ جس نے سرسید تحریک کے خلاف آواز بلند کی اور اُردو ادب کو مقصد کی سنجیدگی کی بجائے طنز و مزاح کو شیوہ بنایا۔ ایک ایسا رجحان چل پڑا جو اسلوب کے لحاظ سے سرسید تحریک سے بالکل متضاد تھا۔ اس رجحان کی بنیاد محمد حسین آزاد، رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم شرر کے ہاتھوں پڑی۔ جس کی بنیادی صفت اسلوب کی رنگینی تھی۔ اس کے تحت اُردو ادب میں ایک نئے رجحان نے اپنی جگہ بنائی جسے رومانیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

بقول ڈاکٹر محمد حسن:

> ''رومانیت یقیناً انقلابی تحریک کی حیثیت سے شروع ہوئی۔ رومانیت محض فرار نہیں تھی بلکہ بدلے ہوئے حالات میں کائنات کی ایک نئی تلاش تھی۔ نئی قدروں کی بازیافت تھی۔ اس میں صرف پرانے اصولوں سے سرتابی ہی نہیں تھی بلکہ اِن معیاروں اور ترتیب کو رد کرنے کی کوشش تھی جس سے یہ جامد اصول تراشے اور مسلط کیے جاتے ہیں۔''[۷۱]

انیسویں صدی کے آخر میں اِس رجحان میں مزید اضافہ ہوا۔ شعرا نے ادب کو اِس کی چاشنی دوبارہ عطا کی۔ شان دار ماضی کی یاد دلائی۔ عشق و محبت کے قصوں سے اُردو ادب کا دامن مالامال کیا۔ یوں اس رجحان نے اِس قدر ترقی کی کہ اُردو ادب کی تاریخ میں اِسے رومانی تحریک کا نام دیا گیا۔ لیکن اجتماعی سطح پر کوئی ایسی نظریاتی

ہم آہنگی یا وابستگی نہ تھی جو تحریک کا خاصہ ہوتی ہے۔ اِس لیے ہر رومانی ادیب کا اپنا ایک الگ رومانی رجحان تھا۔ کسی کے ہاں عشق و محبت کو اوّلیت ہے تو کوئی فطرت کا پرستار ہے اور کسی کے ہاں ماضی کی اقدار سے وابستگی ہے۔ رومانیت اِن معنوں میں تحریک نہ تھی جیسی یورپین ادب میں ملتی ہے کہ جس نے پورے ایک عہد کو سوچنے اور دیکھنے کا ایک نیا انداز بخشا ہے بلکہ یہ ایک ایسا رجحان تھا جس کا غلبہ مخصوص ادبی، سماجی اور سیاسی حالات کے تحت اُردو ادب میں کافی مدت کے لیے رہا، مگر بعد میں دیگر عوامل کی وجہ سے دب گیا۔ رومانوی رجحان کے لیے شیخ عبدالقادر کے ''مخزن''، نیاز فتح پوری کے ''نگار''، شرر کا رسالہ ''دل گداز''، اختر شیرانی کے ''خیالستان'' اور ''رومان'' وغیرہ نے اِس رجحان کے ادیبوں کے لیے پلیٹ فارم عطا کیا۔

ندیم کے ہاں بھی اس رجحان کے اثرات پائے جاتے ہیں، اگرچہ اختر شیرانی کی صحبت کے علاوہ اِس رجحان کی نمود میں کچھ اور عوامل بھی کارفرما تھے، جن میں بچپن میں فطرت اور فطری زندگی سے قربت، کٹھن حالات کی وجہ سے بے اطمینانی اور گاؤں کی لڑکی کی سادہ مگر پرخلوص محبت، اِن سب عوامل نے مل کر ندیم کے مزاج کی رومانوی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ ندیم کی زندگی اور فن پر رومان کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ اِن کی رومانیت صحت مند ذہنی کیفیت کی پیداوار ہے اور اس کی تمام خصوصیات اِن میں دکھائی دیتی ہیں۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

> ''رومانی مزاج میں تخیل پرستی اور خیال انگیزی بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی پر رومانیت کا رنگ محل تعمیر ہوتا ہے۔ یہ رنگ محل ندیم صاحب نے بھی تعمیر کیا ہے۔ ان کے ہاں تخیل کی فراوانی ہے۔۔۔ ان کی رومانیت کسی فرار کی پیداوار نہیں ہے۔ اس کو تو احساسِ حقیقت نے پیدا کیا ہے۔۔۔ اِن کی رومانیت بڑی متوازن ہے۔ اِس میں تخیل کی فراوانی اور خیال انگیزی ضرور ہے لیکن تخیل پرستی اور خیال آرائی نہیں ہے۔ وہ زندگی کے اُفق پر بہت اونچا اُڑتے ہیں لیکن کھو نہیں جاتے۔'' ۴۲ے

ابتدا میں ندیم کے ہاں زندگی اور اُس کے حقائق کے خلاف بہت شدید جذباتی ردِ عمل نظر آتا ہے جو اِن کو رومانیت کی طرف لے جاتا ہے لیکن اِن کے ہاں شدت آرزو اور اضطراب نظر آتا ہے۔ جیسا کہ:

ے راتیں روتی ہیں کہ وہ چاند نہ اُبھرا اب تک
دن بلکتے ہیں کہ وہ مہر درخشاں نہ رہا ۴۳ے

ندیم محبت کے بارے میں سچائی سے اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کرتے ہیں اور رومانیت کو مکمل طور پر رد نہیں کرتے۔

نہ جانے کون سے چشمے ہیں ماورائے بدن
کہ پا چکا ہوں جسے مجھ کو اس کی پیاس بھی ہے ۷۴

غزل میں ندیم کی رومانیت کروٹیں بدلتی رہتی ہے۔ بدلتی کیفیات سے لے کر فلسفیانہ اور معشوقانہ انداز تک رومانیت ہی اِن کے طرزِ احساس کا خاصہ رہی ہے۔ البتہ غزل منفی مزاج کی بنا پر خارج کی طرف اس تیزی سے متوجہ نہ ہو پائی۔ وہاں رومانی جذبے کا احساس نہیں ہوتا۔ اس لیے ان کی غزل شروع سے آخر تک جس رومانیت کی مظہر ہے، اس کا بنیادی پہلو اِن کی محبت ہی ہے۔ جیسا کہ:

میں جسے شرطِ ادب کہتا ہوں تو فرطِ حیا
عشق اور حسن میں حائل ہے وہ دیوار ابھی ۷۵

تو حقیقت ہے تو آ اس کی گواہی دینے
اب مجھے تیرا تصور نہیں بہلا سکتا ۷۶

جب ندیم نے اپنی ذات کے حصار سے نکل کر ماحول کو دیکھا، تو اِن کی نظر معاشرتی حقائق پر پڑی اور انہیں احساس ہوا کہ غم صرف اِن کی زندگی کا حصہ نہیں بلکہ ہر دل کے مقدر میں ہے۔ یہاں سے اِن کی رومانیت نے ذات کے حصار سے نکل کر معاشرے کی طرف رُخ کیا اور سماج کے ناآسودہ نظام کے خلاف جو رویہ اپنایا، اُس کو رومانی تحریک کا احتجاجی رُخ قرار دیا جا سکتا ہے۔

بقول ڈاکٹر ابو سعید نور الدین:

> ''شروع میں ان کا رجحان رومان کی طرف تھا اور تخیل اور تصور سے زیادہ کام لیتے تھے لیکن بعد میں وہ حقیقت پسندی کی طرف مائل ہو گئے اور مشاہدے اور تجربے پر زیادہ زور دینے لگے۔'' ۷۷

ندیم جو کہ تلخی اور بے اطمینانی کا اظہار ذاتی وجوہات کی وجہ سے نہیں کرتے بلکہ اپنے دُکھ کو معاشرے کے دُکھ کے ساتھ وابستہ کر لیتے ہیں۔ اس طرح ندیم حقیقت و مجاز کے دوراہے پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ ایک ہی

وقت میں رومان اور حقیقت اِن کا دامن کھینچ رہے ہوتے ہیں۔ اُن کا دماغ حقیقت سے مسحور ہے تو دِل حسن کا اسیر ہے۔ اس کش مکش میں اِن سے شعری آبگینے چور چور ہو جاتے ہیں لیکن ندیمؔ کو یہ شکستگی پسند ہے۔ ندیمؔ سماج کے ناآسودہ نظام پر جب غور کرتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ معاشرے میں امن اور انصاف کی عالم گیر اقدار کا قیام کیوں نہیں ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں:

> ''بہت بعد میں مجھے یہ سوچنے کا خیال آیا کہ فلاں غریب ہے تو آخر کیوں، غریب ہے؟ فلاں نے اپنی بیٹی بیچ دی، فلاں نے چوری کی ہے تو کیوں کی ہے؟ فلاں بے گناہ نے تھانے دار کے سامنے ناک سے لکیریں کھینچیں تو کیوں اور فلاں چپکے سے بیگار پر کام کرنے چلا گیا تو کیوں چلا گیا؟'' ۸ے

ندیمؔ معاشرتی رشتوں کی طرف چل پڑے، یہ راستہ ترقی پسند تحریک کی طرف نکلتا ہے۔ ترقی پسند ادب کا مقصد ادب کو عوام کے قریب لے کر آنا ہے اور اِن تمام مسائل پر آزادی کے ساتھ رائے دینا ہے جس کا سامنا نسلِ انسانی کو ہے۔ سجاد ظہیر ترقی پسند ادب کے متعلق رقم طراز ہیں:

> ''ہم ادب کو عوام کے قریب لانا چاہتے ہیں اور اسے زندگی کی عکاس اور مستقبل کی تعمیر کا مؤثر ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔ یہ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔'' ۹ے

ندیمؔ نے اپنی غزل میں ترقی پسند رجحانات کو فروغ دیا اور ایسے الفاظ منتخب کیے ہیں جس سے اِن کی جدت فکر اور ندرت کا اظہار ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر انور صابر:

> ''جدید غزل پر اثرات مرتب کرنے والوں میں ایک اہم نام احمد ندیم قاسمی کا ہے۔ ندیمؔ کی غزل میں روایت سے رشتہ نبھاتے ہوئے ترقی پسندی کے اثرات کو نمایاں طور پر دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔'' ۸۰ے

ترقی پسند تحریک کا اہم مقصد انسان کو اِس کی گم گشتہ عظمت کا احساس دلانا ہے اور معاشرے کو اپنی تخلیقات کے ذریعے تبدیل کرنا ہے۔ محمود الظفر کے نام سے شائع ہونے والے مضمون کو ترقی پسند تحریک کا بنیادی

منشور قرار دے سکتے ہیں جس نے بہت کم عرصہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا روپ دھار کر اپنے وجود کا اثبات کرالیا۔

"--- they stand for the right of free criticism and free expression in all matters of the highest importance to the human race in general and the Indian people in particular. They have choosen the particular field of Islam, not because they bear it any 'Special' malice, but because, being born into that particular, society, they felt themselves better qualified to speak for that alone." ۸۱

کارلو کپولا نے ''انگارے'' کی اشاعت اور محمود الظفر کے اِس مضمون کو ترقی پسند تحریک میں اہم قدم قرار دیا ہے۔

"While the publication of this volume was the first step in this movement, the second was taken by Mahmud-ul-Zafar and Ahmed Ali, who wrote a rejoinder to the many newspaper editorials and articles which denounced the Angare Group." ۸۲

ترقی پسند تحریک کا بنیادی مقصد حالات کے خلاف بے اطمینانی کا اظہار اور انہیں بدل ڈالنے کی خواہش تھا اور ''انگارے'' ایک ایسا مجموعہ تھا جو ہر باشعور انسان نئی دنیا کی تعمیر کے لیے دیکھتا ہے۔

بقول احمد علی:

"This small group then lived in a colourful world of vivid imagination, alive to the sorrows of humanity and the joys of creation." ۸۳

ترقی پسند تحریک نے حقیقت نگاری کے فروغ سے ادب کو سماجی اقدار سے ہم آہنگ کیا اور اِس نے ادب کے ذریعے

انسانیت کے جذبات کی ترجمانی کی۔ ڈاکٹر محمد کامران لکھتے ہیں:

> ''ترقی پسند تحریک کی سب سے بڑی عطا اظہار کی بے باکی اور حقیقت نگاری کی روایت کا معروضی شعور ہے۔'' ۸۴

ترقی پسند تحریک جس نے ادب کے ذریعے اخوت اور عدل کا پیغام دیا۔ اُس کو بنیاد فراہم کرنے میں ''انگارے'' نے اہم کردار ادا کیا۔

بقول شبانہ محمود:

> ''۔۔۔۱۹۳۶ء میں قائم ہونے والی انجمن ترقی پسند مصنفین کی اصل بنیاد ''انگارے'' کی اشاعت کے ساتھ ۱۹۳۲ء میں رکھ دی گئی تھی۔'' ۸۵

ادب اور انسانیت لازم وملزوم ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے بغیر اپنے مقاصد حاصل نہیں کر سکتے۔ صحیح ادب کو انسانیت کے مقصد کی ترجمانی کرنی چاہیے۔ رنگ ونسل اور قومیت و وطنیت کی مخالفت اور مساوات و عدل کی حمایت کرنی چاہیے۔

اختر حسین رائے پوری لکھتے ہیں:

> ''اِن تمام عناصر کے خلاف جہاد کا پرچم بلند کرنا چاہیے جو دریائے زندگی کو چھوٹے چھوٹے چہ بچوں میں بند کرنا چاہتے ہیں۔'' ۸۶

ترقی پسند تحریک آغاز ہی سے اتنے ہمہ گیر اثرات رکھتی تھی کہ ملک کے بیشتر ادیبوں نے اِس کا ساتھ دیا۔ ندیم نے بھی اِس تحریک کے اثرات کو قبول کیا۔ ندیم اگرچہ اس تحریک کے بانیوں میں سے نہ تھے اور نہ ہی اُنھوں نے پاکستان بننے سے پہلے اس کے مصنفین کی تنظیم میں عملی طور پر حصہ لیا، لیکن ذہنی طور پر وہ اِس تحریک سے وابستہ رہے۔ اِن کی ادبی زندگی پر اس تحریک کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ حالات کو بدل دینے کی خواہش اور ملک کی تہذیب کو اُجاگر کرنا اِس کا منشور تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ندیم کے ہاں آغاز ہی سے اِس تحریک کے اثرات پائے جاتے ہیں اور ترقی پسند فکر سے یہی مماثلت انہیں ترقی پسندی کے قافلے میں شامل کرتی ہے۔ سجاد ظہیر اس تحریک

کے متعلق رقم طراز ہیں:

"ادب کی ایسی تحریک ہے جس کی بنیاد حب الوطنی، انسان دوستی اور آزادی پر ہے۔۔۔
وہ اس ملک کی تہذیب کے بہترین عناصر کو زندہ کرنا، اُجاگر کرنا اور اُن کی بنیاد پر نئی زندگی
کے حالات کے مطابق پرانے تمدن کے خمیر سے نئے اور بہتر ادب، فنونِ لطیفہ اور کلچر کی
تعمیر کی کوشش کرتی ہے۔" ۸۷ے

انقلابِ روس اور اِس کی بنا پر اشتراکی خیالات پوری دنیا کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں بھی مقبولیت
حاصل کر رہے تھے۔ اقبالؔ، فیضؔ اور جوشؔ جیسے شاعروں نے بھی اِس تحریک کے اثرات کو قبول کیا۔ ندیمؔ بھی اِس تحریک
کے مقاصد کی وجہ سے فکری طور پر اِس کے زیادہ قریب ہوئے۔ ندیمؔ قیامِ پاکستان سے پہلے ترقی پسند فکر سے متاثر
ضرور تھے لیکن یہ اثر پذیری شعوری نہ تھی، لاشعوری تھی۔ شعوری اثر پذیری کا آغاز ۱۹۴۶ء کے بعد ہوا۔ شعوری اور
لاشعوری ترقی پسند کا فرق شہزاد منظر نے اِس طرح بیان کیا ہے:

"شعوری ترقی پسندی وہ ہے جس کے تحت ترقی پسند ادیب انقلابی نظریے کو قبول کرتا
ہے اور اپنی تخلیقات کے ذریعے معاشے کو تبدیل کرنے کی شعوری کوشش کرتا ہے۔۔۔
غیر ترقی پسندی وہ ہے جس کے تحت ادیب معاشرتی برائیوں، ظلم و استحصال اور سماجی
ناانصافیوں کو محسوس کرتا ہے اور اِس کی عکاسی کرتا ہے۔" ۸۸ے

ندیمؔ کے ہاں بھی یہی غیر شعوری ترقی پسندی ۱۹۴۶ء سے پہلے تک موجود تھی مگر انقلابی فلسفے سے عدم شناسائی کی وجہ
سے اِن کے ہاں سماجی نظام کی تبدیلی کا تصور نظر نہیں آتا مگر ۱۹۴۷ء کے بعد کا ادب واضح طور پر تبدیلی کا اعلان کرتا
ہے۔ ندیمؔ نے زندگی کی حسین اور پاکیزہ قدروں کو نمایاں کیا۔ ندیمؔ کہتے ہیں:

"ترقی پسند ادب کی تحریک کی بنیاد ان تمام ادیبوں کے اتحاد پر رکھی گئی جو ادب اور
زندگی کے گہرے رشتے کے قائل تھے اور ادب کے ذریعے ملک کو غیر ملکی حکومت اور ملکی
جاگیردارانہ نظام سے نجات حاصل کرنے میں مدد دینے کے آرزومند تھے۔" ۸۹ے

ندیم نے اپنی شاعری کے ذریعے انسانی عظمت اور رواداری کی اقدار کو فروغ دیا اور ترقی پسند تحریک سے
وابستہ ہونے کے باوجود شاعری کو شعری حسن سے تہی نہ ہونے دیا۔ اگر چہ اِن کی غزل میں عصرِ رواں کی گونج سنائی

دیتی ہے۔ ترقی پسندوں کی غزل پر کئی اعتراضات بھی ہوئے اور اس میں تنوع اور تجربہ کی کمی تو نہ تھی لیکن ان کی شاعری کو گھن گرج کی شاعری کا نام دیا گیا۔

بقول ڈاکٹر ضیاء الحسن:

''ترقی پسندوں کو غزل رجعت پسند صنف نظر آتی ہے جس میں نہ انقلاب کی گھن گرج ہے، نہ مزدور کے مسائل، بس تصوف کا راگ ہے جو انفعالی ذہن پیدا کر رہا ہے۔'' ۹۰

سجاد ظہیر نے غزل کو اِسی عتاب سے بچایا اور لکھتے ہیں:

''لچر گوئی کو صرف غزل کے ساتھ منسوب کرنا، اِس کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوگی۔ نظم گو شاعر جن میں ترقی پسند شاعر بھی شامل ہیں، اس میدان میں بلاشبہ غزل گویوں کے شانہ بشانہ دوڑ رہے ہیں۔'' ۹۱

ترقی پسند ادب، ہر اُس ادب کو قرار دیا گیا جو کہ نیا تھا۔ اِس طرح اِسی تحریک کو بدنام کرنے کی کوشش کی گئی۔ انہی خیالات کا اظہار سردار جعفری یوں کرتے ہیں:

''یہ تمام چیزیں ترقی پسند ادب کے ساتھ کچھ اس طرح مل گئیں کہ ہر نیا ادیب ترقی پسند قرار دیا گیا اور ہر نئی تحریر ترقی پسند ادب کا نمونہ، نیا ادب اور ترقی پسند ادب، ہم معنی الفاظ ہو گئے۔۔۔ سجاد ظہیر نے اِس پر احتجاج کیا کہ ترقی پسند ادب کے مخالفین ہر نئے ادیب کو اور اگر وہ خراب ادیب ہے تو اور زیادہ بہ اصرار، ترقی پسند کا نام دے کر پوری تحریک کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔'' ۹۲

ندیم ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے لیکن اُنھوں نے انقلاب کے لیے اسلوب کو قربان نہ کیا اور یہی وجہ تھی کہ اِن کی غزل میں تاثیر کی کمی نہ تھی، جس کا اظہار اُن کی غزل سے ہوتا ہے۔ غزل میں خیال اور جذبہ کی ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ ان کی سادگی سچائی کے جذبات سے پیدا ہوتی ہے۔ ندیم کی فکر دوسرے ترقی پسندوں کے مقابلے میں وسیع ہے۔ اِن کی غزل کے بارے میں نظیر صدیقی لکھتے ہیں:

''اُنھوں نے جذبے اور فکر دونوں کی شاعری کی ہے لیکن جہاں تک جذبات کا تعلق ہے۔۔۔ اِن کی غزل کے بیشتر اشعار فکر پر مبنی ہوتے ہیں۔۔۔ اِن کی اس خوبی

کا اعتراف ضروری ہے کہ اِن کی فکر ونظر کا دائرہ بیشتر ترقی پسند شاعروں کے فکر ونظر
سے وسیع تر ہے۔'' ۹۳

ندیم کی غزل میں جہاں جذبوں کا بیان ہے وہاں وہ فکری توازن رکھنے میں بھی کامیاب ہیں۔ کیوں کہ ان کی فکر کا دائرہ وسیع تر ہے۔ اِس انفرادی لہجے نے ان کی غزل کو پُر تاثیر بنا دیا ہے۔ ندیم نے غزل میں نئے نئے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ثمینہ ندیم لکھتی ہیں:

''اِن کے Poetic Diction میں عام شعرا کی نسبت فکری موضوعات کی زیادہ گنجائش
تھی۔ اِس فکری توانائی کا دائرہ وسیع تر ہوا تو انہیں کہنا پڑا:

''فکر کا شاعر ہوں لیکن حسن کا گھائل بھی ہوں۔'' ۹۴

ندیم زبان کے معاملے میں بڑے محتاط تھے۔ ساقی فاروقی کی رائے میں:

''ندیم صاحب ترقی پسندوں کے ہراول دستے کے سپاہی رہ چکے ہیں۔ یہ لوگ خیالات
اور جذبات کے یکساں اظہار اور تکرار کے کمانڈر ضرور تھے مگر زبان کے معاملے میں محتاط
پائلٹ تھے۔'' ۹۵

انسان دوستی اور عام انسان کے لیے محبت کے جذبات ندیم کی غزل کا مرکزی نقطہ رہا ہے۔ ترقی پسند تحریک کا بنیادی مقصد بھی انسان کو اُس کا کھویا ہوا وقار واپس دلانا تھا اور یہی محرک اِن کی ترقی پسند تحریک سے وابستگی کا سبب بنا۔ ندیم کی شاعری کے آغاز میں ہی انسان کی عظمت کا احساس اور انسان کو اِس کا کھویا ہوا وقار واپس دلانا اور اِس کی عظمت گم شدہ سے وابستہ کرنا، بنیادی مقصد تھا۔ اِس لیے اِن کی اِس تحریک سے وابستگی کا بڑا محرک یہی انسان دوستی تھی۔ جیسا کہ ندیم کہتے ہیں:

ے پڑھتا ہوں جب اِس کو تو ثنا کرتا ہوں ربّ کی
انسان کا چہرہ ہے کہ قرآن کا پارا ۹۶

ے میں کسی شخص سے بے زار نہیں ہو سکتا
ایک ذرّہ بھی تو بے کار نہیں ہو سکتا ۹۷

تخلیقِ انسان سے اب تک ذہنِ انسانی اِس سوال کا جواب نہیں دے سکا کہ انسان کیا ہے؟ اِس کی اصل کیا ہے؟ اور

کائنات میں اِس کا وجود کیا مفہوم رکھتا ہے؟ دراصل انسانی وجود بے شمار رُخ، بے شمار پہلو اور اپنے اندر بے شمار جہتیں رکھتا ہے۔ کیتھلین رین انسان کے بارے میں مادی نقطۂ نظر کو رد کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"---Man is not a species of animal but a new kingdom, as distinct from rocks--- (man) is an invisible kingdom whose world is a mental world, subject to laws proper to itself which do not confirm to the categories of time and space or to any of the laws of nature." ۹۸

ندیم کے نزدیک انسان کی اصل معراج انسانیت میں ہے۔ ایک انسان میں تمام انسانیت کا عکس نظر آتا ہے۔ اِس سے انسانوں کی آپس میں محبت، دوستی اور تعاون کے جذبات پختہ ہوتے ہیں۔ ایک انسان کو دوسرے انسانوں پر پیار آتا ہے۔ انسان دوستی نہ صرف ترقی پسند تحریک کا منشور تھا بلکہ اُن کی شخصیت کا خاصہ تھا، کیوں کہ ندیم سراپا محبت تھے۔ اِس لیے اُنھوں نے انسان اور انسانیت کی بقا کے حوالے سے کبھی سمجھوتا نہ کیا۔ اِس سے اِن کی انسان دوستی کا اظہار ہوتا ہے۔ عابد رضا بیدار لکھتے ہیں:

''زندگی کی رنگا رنگی اور بھرپور توانائیوں کے ساتھ سارے تجربوں اور احساسات کے ساتھ فکر اور جذبے کے ہر پہلو کی عکاسی کرتے ہوئے غزل کے شعر میں جس سرچشمہ سے فیضان حاصل کر سکتے تھے اور کر رہے تھے۔۔۔احمد ندیم قاسمی اور اُن کا قبیلہ تھا۔'' ۹۹

ندیم کو ساری دنیا کے انسانوں سے شدید محبت اور ہمدردی ہے۔ اِن کے دُکھ کو ندیم اپنا دُکھ گردانتے ہیں۔ شعور و ادراک سے کام لیتے ہوئے ندیم اپنی غزلوں میں انسان دوستی، پیار اور محبت کا پیام دیتے ہیں۔ ندیم انسان، زندگی اور اُس کے مسائل پر گہری نظر رکھتے ہیں۔

ے اُس کا احساں، کہ جو نفرت کا ہدف ہیں کب سے

مجھ کو اِن خاک نشینوں کی محبت دے دی ۱۰۰

ندیم انسانیت کی حمایت میں آواز بلند کرتے ہیں۔ ایسا کر کے نہ صرف انقلابی شعور کا اظہار کرتے ہیں بلکہ خدا کی عبادت کا حق بھی ادا کرتے ہیں۔ ندیم انسان کی تفریق جغرافیائی اور نسلی تفرقات سے نہیں کرتے بلکہ

اُن کو انسانیت کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ وہ انسان کو اُس کے خواب پورا کرتے دِکھاتے ہیں، اُس کو اُمید کا درس دیتے ہیں کیوں کہ اُن کی غزل کا مرکزی کردار انسان ہے جو کہ تضادات کا مارا ہوا ہے اور عدم تحفظ کا شکار ہے۔

کتنے بہت سے روپ ہیں حضرتِ آدمی کے بھی
ولولے داوری کے بھی، وسوسے کافری کے بھی ۱۰۱؎

ممتاز حسین اپنے مضمون ''احمد ندیم قاسمی کی شعری فکر کا ایک تجزیاتی مطالعہ'' میں لکھتے ہیں:

''احمد ندیم قاسمی کی شاعری ایک سوچتی، گنگناتی ہوئی شاعری ہے۔ اِن کی شاعری میں جذبے سے زیادہ فکر اہم ہے۔'' ۱۰۲؎

ندیمؔ انسان سے بحیثیت انسان پیار کرتے ہیں۔ انسان دوستی کی تمنا کرتے ہیں کہ انسان خواہ کسی عقیدے اور نظریے سے تعلق رکھتا ہو، اِس سے بحیثیت انسان بھی محبت کے ساتھ پیش آنا چاہیے اور دنیا میں جہاں کہیں بھی کوئی انسان دُکھ، تکلیف میں مبتلا ہے۔ اِس کے درد میں شامل ہونا چاہیے۔ انسان کو اُس خالق کل نے پیدا کیا ہے جس کی وجہ سے مذہبی، نسلی، سیاسی یا معاشرتی اختلاف کی وجہ سے نفرت نہیں کرنی چاہیے۔ عظمتِ انسان کا تصور ندیمؔ کے احساسات کا حصہ ہے اور ترقی پسند تحریک میں شمولیت اور ترقی پسندوں کا انقلابی جذبہ اِن کے اِس احساس کو پختہ کرتا ہے۔ ندیمؔ اِس تصور سے وابستہ ہوکر اسے اپنی ذات کا حصہ بناتے ہیں۔

مر کر بھی نہ ہوں گے رائیگاں ہم
بن جائیں گے گردِ کارواں ہم ۱۰۳؎

معبود کے راز جانتا ہوں
میں بھی مسجود رہ چکا ہوں ۱۰۴؎

ندیمؔ جو کہ ترقی پسند نظریات رکھنے کی وجہ سے منصفانہ معاشرے کا قیام چاہتے تھے اور اِس کے لیے ایسی اقدار کو فروغ دینا چاہتے تھے جو اِس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بننے کے بجائے اس کے لیے معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اِس لیے اُنھوں نے کھوکھلے سماجی نظام، سامراج کی جابرانہ پالیسیوں اور طبقاتی نظام کو ختم کرنے کے لیے کوششیں کیں اور تعصبات، ناانصافی، خودغرضی اور دیگر سماجی برائیوں سے پاک معاشرے کے قیام کے لیے کوشاں

ہو گئے۔ انسان سے محبت کا یہی جذبہ تھا جس کی وجہ سے اُنھوں نے اسے مخلوقات میں بلند تر رتبہ دیا اور ہر حال میں انسانیت کو پروقار مقام پر اور محبت اور ہمدردی سے بھرپور حالت و کیفیت میں دیکھنا چاہتے ہیں:

اس قدر پیار ہے انسان کی خطاؤں سے مجھے
کہ فرشتہ مرا معیار نہیں ہو سکتا ۱۰۵؎

ندیم ایک انسان پر دوسرے انسان کو ترجیح نہیں دیتے بلکہ معاشرے کی طبقاتی تقسیم کے سخت خلاف ہیں۔ ان کی غزل میں انسان سے محبت کا پیغام ملتا ہے۔ وہ خود اِس معاشرے کے فرد تھے۔ اِس لیے اِن مسائل اور انسان کی طبقاتی تقسیم کو محسوس کرتے ہیں۔ ندیم کے نظریۂ فن کی بنیاد انسان دوستی، اس کا وقار اور اِس کی عظمت ہے۔

نہ وہ ہوتا، نہ میں اِک شخص کو دِل سے لگا رکھتا
میں دُشمن کو بھی گنتا ہوں محبت کے سفیروں میں ۱۰۶؎

ترقی پسند تحریک کے بنیادی مقاصد میں ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرنا تھا، اِس کے مقاصد کی نشان دہی کرتے ہوئے ڈاکٹر کریم الدین احمد لکھتے ہیں:

> ''اگر ہمیں عوام کے دُکھ درد کا خیال ہے تو اپنی تحریروں کو اِن کے مسائل کے حل کا آلہ کار بنانا چاہیے۔ عوام میں طبقاتی شعور اور اتحاد پیدا کرنا چاہیے اور ایسے معاشرے کے خلاف جدوجہد کرنے میں اِن کی مدد کرنی چاہیے جو ظلم اور ناانصافی کی بنیاد پر قائم ہے۔'' ۱۰۷؎

ندیم بھی انسان کو جاگیرداروں کے چنگل سے نجات دلانا چاہتے ہیں اور اِسے عوام کے دُکھ سکھ کا ساتھی بنانا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ جاگیردار کی حیثیت جابر حکمران کی تھی۔ جاگیرداروں نے اندھیر مچا رکھا تھا۔ کسانوں اور محنت کشوں کی بھلائی کی کوئی گنجائش موجود نہ تھی۔ آدمیت کی تذلیل کی جاتی تھی اور انسانی حقوق کو پامال کیا جاتا تھا۔ اس خوف ناک تفریق اور تضاد نے ندیم کو مسلسل کرب اور اضطراب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ جب وہ حکومت اور جاگیرداروں کو روپے پیسے اور اقتدار کی ہوس کے ہاتھوں انسانوں کو ذلت اور رسوائی کی پستیوں میں مبتلا کرتے دیکھتے تو تڑپ اُٹھتے۔ ندیم کیوں کہ انسان کی رفعتوں کے قائل تھے اور انسان کو بلند مقام پر دیکھنے کے آرزومند تھے۔

اِس لیے وہ جاگیردارانہ نظام اور اُن کے طبقاتی استحصال کے خلاف تھے۔ ندؔیم کہتے ہیں:

پرواز کو محدود نہ کر شام و سحر تک
انسان کی ہیں مملکتیں حدِ نظر تک ۱۰۸؎

ندؔیم کی غزل میں حکمران طبقے کے اِس ظلم وستم اور ناانصافی کے خلاف طنز وتعریض ملتی ہے۔ اِس سیاسی وسماجی بدحالی اور مساوات اور جمہوریت کی عدمِ موجودگی کی وجہ سے اِن میں بےزاری اور اکتاہٹ پیدا ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں:

جانے کون رہزن ہیں، جانے کون رہبر ہیں
گرد گرد چہرے ہیں، آئینے مکدر ہیں ۱۰۹؎

ندؔیم اپنے گرد وپیش میں امیر اور طاقت ور کو غریب اور کمزور لوگوں کا استحصال کرتے دیکھتا ہے۔ سماجی ناانصافیوں اور طبقاتی تقسیم کا شب وروز مشاہدہ کرتا ہے اور اپنی ذاتی زندگی میں بھی اسے محسوس کرتا ہے۔

بقول فراق گورکھ پوری:

''شاعری کی پرکھ کا سوال وہ سوال ہے، جو زندگی، نفسیات، اخلاقیات، انسانی دھرم، احساس، حیات وکائنات، تہذیب وتمدن کی گہری جڑوں تک شاعر ونقاد کو اور اِن کی رہنمائی میں پورے سماج کو سماجی شعور کی طرف لے جاتا ہے۔'' ۱۱۰؎

ندؔیم کو ساری دنیا کے انسانوں سے محبت ہے۔ اِس لیے سماجی ظلم و جبر اور ناانصافیوں اور محرومیوں کا اِن کے دِل پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ جب وہ حکمران کے ہاتھوں خدا کے بندوں کو ذلت ورسوائی کی پستیوں میں بھٹکتا ہوا دیکھتے ہیں تو تڑپ اُٹھتے ہیں کہ یہ تو وہی انسان ہے جو کہ خدا کے ذہن کا فن پارہ ہے۔ اِس لیے جب ندؔیم نے سرمایہ دارانہ نظام کی سفاکی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو اِس نظام کے خلاف سینہ سپر ہو گئے۔ سماج اور سیاست سے متعلق اِن کی غزل اِن کے تخلیقی شعور کی نشان دہی کرتی ہے۔ اِس لیے جب ندؔیم انسان کو اِس سیاسی اور سماجی جبر اور ظلم کے حوالے سے مجبور دیکھتا ہے تو وہ انسانوں کے اِس استحصال کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔

صبر کیوں دلاتے ہو، ضبط کیوں سکھاتے ہو
مجھ کو کتنی صدیوں کے یہ سبق تو ازبر ہیں ۱۱۱؎

ندؔیم جو کہ مفلس اور مظلوم انسانیت کا دُکھ درد بانٹنے والا تھا مگر ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کی وجہ سے انسانیت کی

تذلیل نے اِس کے فن کو مقصدیت کی نئی راہیں دکھائیں۔ محنت کشوں کو بھوکا اور ننگا رکھا گیا۔ ندیم نے جب یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تو اُنھوں نے جرأت اور بے باکی کے ساتھ انسان کی کوشش اور تگ و دو میں حائل جاگیرداروں کے سفاکانہ رویے کے خلاف آواز بلند کی اور انسان کو اُس کے تحفظ کی بشارت دی ہے۔

ؔ ذرا وقفے سے نکلے گا، مگر نکلے گا چاند آخر
کہ سورج بھی تو مغرب میں چھپا آہستہ آہستہ ۱۱۲

ندیم کا انسان کی عظمت پر کامل یقین اور ناقابلِ شکست اعتماد ہی تھا جس کی وجہ سے اُنھوں نے اِس ظلم وستم کے خلاف اپنی غزل میں علم بغاوت بلند کیا اور اِس بات کو اُجاگر کیا کہ انسانوں کے ساتھ کسی قسم کی تفریق نہ کی جائے اور سب انسانوں کو برابر سمجھا جائے۔

ؔ بھیک مانگے کوئی انساں تو میں چیخ اُٹھتا ہوں
بس یہ خامی ہے میرے طرزِ مسلمانی میں ۱۱۳

ندیم نے اپنی غزل میں انسان کو اُس کی حقیقی زندگی کی جھلک دکھائی اور انسانی شرف وعظمت کو پامال ہونے سے بچانے کے لیے کوششیں کیں۔ ندیم مظلوم ومحکوم اور مصائب میں گھرے ہوئے لوگوں کے دُکھ درد بانٹتے ہیں اور اسے انسانیت کی معراج سمجھتے ہیں۔ اِس لیے ندیم دنیا کے زبوں حال انسانوں کو پیغامِ حیات دیتا ہے۔ ندیم کی انسانیت کے بارے میں سوچ کی بنیاد تو اِن کے انسان آمیز رویے کی وجہ سے اُٹھی لیکن اس کی تعمیر وترقی میں انسان سے متعلق دنیا کے اہم فلسفیوں کا مطالعہ اور اِن کا عالم گیر محبت کا جذبہ اور فکر شامل ہیں۔

ؔ یزداں پہ جھپٹ پڑے گا ابلیس
انسان ہٹا جو درمیاں سے ۱۱۴

ندیم انسانیت کو انسان کا بنیادی وصف قرار دیتے ہیں۔ اس لیے انسان پر لگائی گئی پابندیوں کو ندیم ناپسند کرتے ہیں اور اِسے ظلم وجبر سمجھتے ہیں۔ یہ ظلم چاہے محنت کش کسان پر ہو یا اُس مقروض باپ پر جو اپنی بیٹی کو زمین دار کی خلوت پر بھیجنے پر مجبور ہو۔ ظلم وزیادتی اور جبر وتشدد نے انسان کو بہت متاثر کیا ہے اور اِس کو تڑپا کر رکھ دیا ہے۔ ندیم انسان میں محبت، ہمدردی، حسن وخیر کی خوبیاں دیکھنا چاہتے ہیں اور ایسی اخلاقی قدروں کو فروغ دینا چاہتے ہیں جو انسانیت کو بھرپور تحفظ فراہم کر سکے تا کہ ایک انسان دوسرے انسان سے پیار کر سکے اور تعاون اور

دوستی کے جذبہ کو پروان چڑھایا جا سکے۔

ے ہر پیارا چہرہ جانا پہچانا سا تھا
جیسے یہ صورت پہلے بھی کہیں دیکھی تھی ۱۱۵

ندیم نے اپنی غزل میں سماجی مساوات اور انسان دوستی کا پیغام دیا۔ وہ چاہتے ہیں کہ انسان امن و سلامتی کا دامن کبھی نہ چھوڑے تا کہ یہ دھرتی امن کا گہوارہ بن جائے۔ ندیم انسان کو زندگی کا خوب صورت اور مکمل مظہر اور مرکزی نقطہ قرار دیتے ہیں لیکن طبقاتی تفاوت نے انسان کو انصاف نہ دینے اور ظلم و ستم برداشت کرنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ کیوں کہ معاشرے میں پھیلتی ہوئی ریاکاری، حق تلفی اور ناانصافی نے ڈیرے جما رکھے ہیں۔ جس کی وجہ سے انسان کو اُس کا حق نہیں ملتا۔ اِس لیے ندیم انسانیت کے وصف پر زور دیتے ہیں اور یہی انسان کا اصل سرمایہ ہے جس کا حصول ہی انسان کا حاصلِ حیات ہے۔

ے مٹی سے اگر بنا تھا آدم
انسان تو پیار سے بنا ہے ۱۱۶

حالات کے جبر نے زندگی کو تڑپا دیا ہے۔ انسان جو کہ کہیں زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے لیکن کہیں وہ ان زنجیروں کو توڑنے کے لیے کوششوں میں مصروف بھی ہے۔ ندیم اِس حقیقت کی تصویریں بڑی بے باکی کے ساتھ دکھاتے ہیں۔ جس میں انسان جس کو فرشتوں نے سجدہ کیا اور جسے خدا کا پرتو قرار دیا گیا، اُس پر جاگیردار ظلم و جبر کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ندیم ایسے غیر انسانی رویوں کو ناپسند کرتے ہیں اور ہر قسم کے حالات میں انسان کو بربریت اور ظلم و ستم سے بچانے کے لیے کوشاں رہے۔ ندیم انسان کو کائنات کا اَن مول ہیرا سمجھتے ہیں۔ جوش ملیح آبادی رقم طراز ہیں:

> ''شاعری و انسانیت کے اِس پیمبرانہ معیار پر نگاہ کر کے جب قاسمی کی جانب نظر اُٹھاتا ہوں تو بلا خوف ابطال یہ نعرہ لگاتا ہوں کہ قاسمی حقیقی شاعر اور انسانیت و شعریت کا ایک ایسا دل کشا سنگم ہے جس کا اور جوڑ نہیں مل سکتا۔'' ۱۱۷

ندیم ایسے انسانوں کی تلاش کرتے ہیں جو کہ خیر کی قوتوں کو فروغ دیں اور شر کے خلاف آواز بلند کرے۔ کیوں کہ خیر کی اِس قوت کی وجہ سے انسان دوسرے انسانوں کو درپیش مسائل کو حل کرتا ہے۔ خیر کی قوت

کی طلب اور شر کی قوت کو رفع کرنا اِن کی غزل میں مکمل فنی رچاؤ کے ساتھ موجود ہے۔

بقول محمد علی صدیق:

''قاسمی صاحب کی شاعری میں قوی جذبہ، خیر وشر کے ڈرامہ میں خیر کی قوتوں کا ساتھ دینے کی تڑپ اور زبوں حال معاشرہ کی تیرہ وتار شب کے بعد مہر درخشندہ کی نمود نے انہیں نغمگی سے زیادہ فیصلہ کن ادعایت سے مالا مال کیا ہے۔'' ۱۱۸

ندیمؔ ہمیشہ کسی بھی شخص کے اندر کا انسان دیکھتے ہیں۔ اِن کے نزدیک انسان بنیادی طور پر نیک اور اچھا ہے۔ اِس لیے وہ انسان کی فطرت میں شامل جذبۂ خیر کی قدر کرتے ہیں اور احترامِ آدمیت کا درس دیتے ہیں۔ کیوں کہ اِن کی غزل کا بنیادی نظریہ خیر اور نیکی کے فروغ کی خواہش ہے۔ اگرچہ انسان خطا کا پتلا ہے لیکن ندیمؔ انسان کے مسلسل خطا کرنے کو پسند نہیں کرتے کیوں کہ اِسی جذبۂ انسانیت کی وجہ سے مٹی سے بنے اِس انسان کو اِس قدر عزت ومنزلت دی گئی ہے کہ وہ کائنات کا مرکزی نکتہ ہے اور اِسے فرشتے پر برتری دی گئی ہے۔ فرشتے کو، انسان کو سجدہ کرنے کو کہا گیا۔

اگر فرشتہ مرے غم سے آشنا ہو جائے
زمیں، مدار سے ہٹ کر کہیں ہَوا ہو جائے ۱۱۹

اسلامی نقطۂ نظر سے انسان خلاصہ کائنات ہے اور اپنی ذات میں وہ کائنات کے تمام مدارج اور مظاہر کو سموئے ہوئے ہے۔ یہی اوصاف اسے دیگر موجودات اور مخلوقات کی نسبت اشرف قرار دیتے ہیں۔ انسان کو خالقِ کائنات نے اپنے ہاتھوں سے بنایا اور اپنی اس حسین تخلیق کو دیکھ کر ایسی سرخوشی کی کیفیت سے مسرور ہوا کہ اس نے فرشتوں کو اِسے سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ انسان کی تخلیق کا حسن، محض حسن ظاہری نہ تھا بلکہ وہ مدعا بھی تھا کہ جس سے اُس وقت فرشتوں کو بے خبر رکھا گیا۔ انسان زمین پر خدا کا نائب خلیفہ ہے اور نیابتِ الٰہی کا یہ منصب ایسا ہے جسے کائنات کے دیگر موجودات نے قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن انسان نے یہ ذمہ داری قبول کر لی۔ انسان کو نہ صرف دیگر موجودات سے ممتاز قرار دیا ہے بلکہ ایک پراسرار تمثیل کے ذریعے اسے کائنات میں اس کی نہایت غیر معمولی حیثیت سے بھی آگاہ کیا گیا ہے اور ساتھ ہی اسے اپنے جوہر کی تلاش کی تلقین کی گئی ہے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے سورۃ احزاب کی آیت نمبر۷۲ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''آدمی اچھی طرح اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ کائنات میں کس نازک مقام پر کھڑا ہوا ہے۔
اب جو شخص اس امتحان گاہ میں بے فکر بن کر رہتا ہے اور کوئی احساس نہیں رکھتا کہ وہ
کتنی بڑی ذمہ داری کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے۔۔۔ اُسی کو اللہ تعالیٰ اس آیت میں
ظلوم وجہول قرار دے رہا ہے۔'' [۱۲۰]

لہٰذا انسان کو اپنی اِس ذمہ داری کو سمجھنا چاہیے۔ انسان کو اشرف المخلوقات تسلیم کیے بغیر اِس کی ستائش ممکن نہیں، کیوں کہ درگزر کرنے، لوگوں کے لیے ہمدردی کے جذبات رکھنا اور دوسرے انسانوں کو پیش آنے والی مشکلات اور مسائل پر قابو پانے کے لیے راہیں ہموار کرنا، انسان کا کام ہے۔ اِس میں احساسِ خودداری ہے۔ اِس لیے ندیم فرشتوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ بشریت سیکھو جس کی وجہ سے انسان کو تم سے برتر قرار دیا گیا۔

درگزر کرنے کی عادت سیکھو
اے فرشتو! بشریت سیکھو [۱۲۱]

ندیم انسان کی بلند پرواز کے خواہش مند ہیں۔ انسان کو مخلوقات میں بلند رتبہ اُسے انسانیت کے بنیادی وصف کی وجہ سے ملا ہے۔ اِس خوبی کی وجہ سے انسان کائنات کو تسخیر کر سکتا ہے۔ ندیم جدید اور سائنسی علوم میں انسان کی ترقی اور اُس کے انکشافات اور ایجادات کا خیر مقدم کرتے ہیں کہ انسان نے اپنے مقام کو پہچان لیا ہے۔ بقول احمد ندیم قاسمی:

''جدید علوم اور جدید سائنس نے انسان کے دل و دماغ اور دست و بازو کو بہت مضبوط
کر دیا ہے۔ انسان کو معلوم ہو چکا ہے کہ وہ شعوری عمل سے اپنا مقدر بدل سکتا ہے۔ وہ
انسانی زندگی اور ماحول اور فضا کے تغیرات کا عقلی تجزیہ کر سکتا ہے۔'' [۱۲۲]

کہکشاں ہے غبارِ راہ ندیم
کس نے یہ راستے بجھائے ہیں [۱۲۳]

ندیم کا امتیاز یہ ہے کہ وہ سائنسی ترقی اور ایجادات و انکشافات سے خوف زدہ نہیں ہوتے بلکہ اس عہد میں ہر نئے انکشاف کا خیر مقدم کرتے ہیں کہ انسان کے ظہور کا وقت آن پہنچا ہے اور کائنات میں ہونے والی ترقی کو

انسان کے ذہن کا کرشمہ قرار دیتے ہیں۔ بقول طارق محمود:

"دنیا میں ہونے والی ترقی دراصل انسانی ذہن کے ارتقا کا نتیجہ ہے۔ اِس اعتبار سے ہم انسان کے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات (Macrocosmos) کو وجودِ انسانی (Microcosmos) کا ایک پھیلا ہوا عکس قرار دے سکتے ہیں۔" ۱۲۴

لہٰذا انسان کو خدا نے ایسی صلاحیت اور طاقت عطا کی ہے کہ وہ روز بروز نت نئے انکشافات کر رہا ہے اور اِس کائنات کو تسخیر کر رہا ہے۔ انسان نے کائنات میں جو زبردست کارنامے سرانجام دیے ہیں اور جو انجام دے رہا ہے، اُس کے متعلق کارل مارکس لکھتے ہیں:

"The consequences of his activity can disappear only with the general extinction of terrestial globe." ۱۲۵

ندیمؔ انسان کے جذبۂ تسخیر کائنات کو اہم گردانتے ہیں۔ سائنس کی ترقی کے ذریعے جہاں انسان سیاروں اور سیارچوں تک رسائی کی کوشش کر رہا ہے، وہاں نئی سے نئی کہکشائیں بھی دریافت ہو رہی ہیں۔ ابراہیم مدکور لکھتے ہیں:

"جس طرح کائنات کی آخری سرحد ادراک سے پرے ہے، اِسی طرح انسان ایک ایسی لامحدود ذات ہے جسے کسی محدود تصور کے قالب میں نہیں ڈھالا جا سکتا۔" ۱۲۶

ندیمؔ انسان کی مسلسل ترقی اور کائنات کو فتح کرنے کے ساتھ ساتھ زمین پر بھی گرم و سرد سہنے کو اپنی غزل کا موضوع بناتے ہیں۔ کیوں کہ انسان کا تعلق زمین سے ہے۔ اِس لیے ندیمؔ چاہتے ہیں کہ انسان پہلے زمین کے مسائل کو حل کرے اُس کے بعد اپنی صلاحیتوں کو تسخیرِ کائنات کے لیے کام میں لائے۔

ابھی انسان کو مانوسِ زمیں ہونا ہے
مہر و مہتاب کے ایواں نہیں درکار ابھی ۱۲۷

لیکن ندیمؔ انسان کی ہمت اور حوصلے پر فخر کرتے ہیں اور اِس کی اِس صلاحیت کا ذکر یوں کرتے ہیں:

شاہد ہے میری وفا شعاری
انسان بلا کا سخت جاں ہے ۱۲۸

اِس پُراسرار کائنات کا سِرِ اکبر انسان ہے جو مسلسل ارتقا ہے لیکن اِس کے رفعت پرواز کی کوئی حد نہیں۔ لیکن ندیمؔ انسان کی یک رُخی ترقی سے خطرہ بھی محسوس کرتے ہیں اور انسان کی ترقی کے منفی اور تخریبی عناصر کی نشان دہی

کرتے ہیں کہ روحانی اور وجدانی فیضان سے محروم انسان جوہری دوڑ میں تو آگے بڑھتا جاتا ہے لیکن محبت اور حسن جیسی قدریں اس ترقی کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔

ندیمؔ چاند پہ انسان کے پہنچنے تک
اُبھر نہ جائے عناصر کی چار دیواری ۱۲۹

ندیمؔ موت پر تو یقین رکھتے ہیں لیکن چاہتے ہیں کہ انسان کو موت کا غم نہیں کرنا چاہیے۔ کیوں کہ ہر ذی روح کو اِس کا ذائقہ چکھنا ہے اور اس دنیا میں آنے کے بعد یہاں سے جانا ہے۔ اِس لیے حیات ومَمات لازم وملزوم ہیں۔ زندگی کو زندوں کی طرح ہی گزارنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ انسان موت کی فکر میں مرنے سے پہلے ہی مر جائے۔

موت سے کس کو مفر ہے، مگر انسانوں کو
پہلے جینے کا سلیقہ تو سکھایا جائے ۱۳۰

ندیمؔ حقائق کو دیکھ کر فکرمند ضرور ہوتے ہیں لیکن اُنھیں اعتماد ہے کہ انسانیت زندہ ہے۔ کیوں کہ ندیمؔ متوازن مزاج انسان ہیں، کبھی بھی مایوسی سے خوف زدہ نہ ہوتے بلکہ اُمید کا دامن پکڑے رکھتے ہیں۔ اِسی اُمید کا درس دیتے ہیں:

ابھی غیروں کے دُکھ پر بھیگنا بھولی نہیں آنکھیں
ابھی کچھ روشنی باقی ہے، لوگوں کے ضمیروں میں ۱۳۱

ناہید قاسمی، اِن کی اُمید کے متعلق لکھتی ہیں:

''ندیمؔ کی اُمید، حسبِ معمول زندہ اور توانا ہے اور توقع، سلامت ہے۔ اِسی لیے امکان قائم و برقرار ہے۔ بہرحال ان کا تصورِ انسان و انسانیت توقعاتِ انسانی اور عالم گیر بھلائی سے معمور ہے۔'' ۱۳۲

ندیمؔ جو کہ سچے اور کھرے محبِ وطن پاکستانی تھے۔ اِن کی ترقی پسندیت اُن کی حب الوطنی کی ہم نوا ہے۔ اُنھوں نے سچے پاکستانی کی طرح اپنے وطنِ عزیز پر خوش حالی کے سورج کو تابندہ دیکھنے کی خواہش کی اور اس معاملے میں اُنھوں نے کبھی کسی سے کسی طرح کا سمجھوتا نہ کیا۔ ندیمؔ کی ترقی پسندی کا لازوال اور اَن مول قوت کا

سرچشمہ اِن کی سچی پاکستانیت ہے۔ ندؔیم کو ترقی پسند نظریات اور پاکستانی قومیت میں کبھی کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ پاکستان کے ساتھ گہری محبت ہی انہیں دیگر ترقی پسندوں سے ممتاز کرتی ہے۔ ترقی پسندوں کو پاکستان میں اپنے خوابوں کی تعبیر نظر نہ آئی تھی جس کے لیے اُنھوں نے جدوجہد کی تھی۔ اس لیے وہ نظریاتی طور پر قیامِ پاکستان کو قبول نہ کر سکے اور صبح آزادی کے اُجالے کو شام کا جھٹپٹا قرار دیا۔ جس کے بعد ظلم کی رات مزید تاریک ہونے کا اندیشہ تھا۔ سو اُنھوں نے انقلاب کے لیے جدوجہد جاری رکھی۔ ندؔیم نے بھی اوّل اوّل انہی کی آواز میں آواز ملائی لیکن بعدازاں اِن سے الگ راہ اپنائی اور پاکستان کو اپنا وطن مان کر تقسیم ہند کو مصنوعی لکیر تصور کرنے کی بجائے ایک مسلم حقیقت سمجھ لیا۔ لکھتے ہیں:

> ''میں کمیونسٹ بھی نہیں ہوں، انجمن ترقی پسند مصنفین کا باقاعدہ ممبر بھی نہیں ہوں، کشمیر پر ہندوستانی فوجوں کی چڑھائی کو استبدادی اقدام سمجھتا ہوں۔۔۔ میں اپنے وطن کا وفادار ہوں، پاکستان ہماری رگ و جان ہے۔'' ۱۳۳

وطن سے محبت اِن کی غزل میں داخلی کیفیات سے آمیز ہو کر اشعار کی صورت میں ڈھلتی ہے۔ اِن کے اشعار سے وطن کا درد اِس طرح جھلکتا ہے جیسے کسی محبِ وطن کی آنکھوں میں وطن کی حالت زار دیکھ کر آنسو آ جائیں اور وہ بے اختیار یہ کہہ اُٹھے:

ے
لوگ جو خاک وطن بیچ کے کھا جاتے ہیں
اپنے ہی قتل کا کرتے ہیں تماشا کیسے ۱۳۴

ندؔیم کی شاعری میں حب وطن اور دردِ وطن ایک قلبی رشتے کے ساتھ اُجاگر ہوتے ہیں اور لگتا ہے کہ شاعر کا اپنی دھرتی، اپنی زمین اور اپنے وطن کے ساتھ گہرا قلبی تعلق ہے۔ ندؔیم کی پاکستان سے محبت سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے وہ خود پاکستان ہوں اور اپنی بنیادوں کو بچانا چاہتے ہوں۔ ندؔیم پاکستان کی بقا، خوش حالی اور استحکام کو ذاتی بقا گردانتے ہیں۔ ندؔیم کی پاکستان سے گہری محبت ہی تھی جس نے اُن کی تحریکِ پاکستان کی مخالفت کے باوجود اُس کا دستِ بازو بننے دیا اور تحریکِ پاکستان سے اُن کی گہری وابستگی نے اُن کے پائے استقلال میں لغزش نہ آنے دی۔

قائداعظم اکتوبر ۱۹۳۶ء میں تقریر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''آپ کے صوبے کے رہنما جو بڑے بڑے عہدوں پر متمکن ہیں۔ گورنمنٹ کے ہاتھ میں

کٹھ پتلی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے اور اُن کے پیش نظر خود پرستی کے علاوہ اور کوئی مطمع نظر نہیں۔" ۱۳۵

ندیم پاکستان سے شدید محبت کی وجہ سے اِن کے خلاف جدوجہد میں مصروف ہو گئے اور ہر اُس تجویز کو ٹھکرا دیا جو پاکستان کی خودمختاری اور آزادی پر ذرا سی بھی آنچ لانے کی گنجائش رکھتی ہو۔ وطن سے اسی محبت کی وجہ سے ندیم چاہتے تھے کہ دوسرے بھی اِس سے غیر مشروط محبت کریں اور اپنی تمام صلاحیتیں اس خطۂ ارض کی ترقی و تعمیر میں صرف کر دیں اور محبت کا تقاضا ہے کہ اگر کوئی اِس وطن کے امن پر ضرب لگائے تو اِس ضرب لگانے والے کے ہاتھوں کو کاٹ دیا جائے۔ ندیم سعادت حسن منٹو کے نام جو خط لکھتے ہیں اُس میں ترقی پسند اور روشن خیال تخلیق کاروں پر پاکستان دشمنی اور اسلام بے زاری کے الزامات کی تردید کرتے ہوئے بتایا کہ:

"ہمارے قریب آیئے اور اُس ترقی پسندی کو سہارا دیجیے جسے پاکستان کا استحکام چاہیے، پاکستانی عوام کی فلاح چاہیے، جمہوریت اور مساوات چاہیے۔" ۱۳۶

ندیم ایسے ترقی پسند تھے جو پاکستان میں جمہوریت کے خوابوں کو عملی طور پر جلوہ گر دیکھنے کی تمنا رکھتے تھے اور اِس کے لیے جدوجہد میں بھی مصروف رہے اور ملک میں انسانی مساوات اور سیاسی آزادی کی تشکیل کی راہ ہموار کرنے میں مصروف تھے لیکن اِس کے باوجود اِن پر پاکستان دشمنی کے الزامات بھی لگے اور انہیں کافر بھی قرار دیا گیا کیوں کہ اُنھوں نے ملک کے غاصبوں کو بے نقاب کر دیا تھا۔

"نقوش" کے اداریہ میں لکھتے ہیں:

"ہم پاکستان کے وفادار ہیں اور پاکستانی عوام کے بہی خواہ ہیں۔ ہم اُن سرمایہ داروں اور عوامی حقوق کے غاصبوں کی وفاداری کو ریاکاری سمجھتے ہیں جو مذہب کے نام پر ذخیرہ اندوزی کو جائز قرار دینے کے درپے ہیں۔" ۱۳۷

ندیم کی پاکستان سے محبت کو پاکستان دشمنی قرار دیا جاتا ہے اور اِسے ناقابلِ معافی جرم قرار دیا جاتا ہے۔ ندیم کو اِن الزامات کا دُکھ ہوا تو فقط اتنا کہ:

"میری امی حیران رہتی تھیں کہ مجھے سرکاری نوکری کیوں نہیں ملتی۔۔۔۔ اُداس ہو جاتی تھیں۔ جب خاندان کے بزرگوں سے سنتی تھیں کہ ہائے بے چارہ ندیم بھٹک گیا، نامُراد، کافر ہو گیا!___" ۱۳۸

ندیم کو سچ بولنے کی پاداش میں اظہار پر پابندی کی کوشش کی گئی مگر وہ حق گوئی و بے باکی کو انسان کا بنیادی حق سمجھتے ہیں۔ اُنھوں نے اِن سفاک حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر صداقت کو پیش کیا ہے۔

ے گل ہیں کم یاب اگر خون تو ارزاں ہو گا
کسی عنواں تو کوئی رنگ جمایا جائے ۱۳۹؎

ے حکم ہے سچ بھی قرینے سے کہا جائے ندیم
زخم کو زخم نہیں پھول بتایا جائے ۱۴۰؎

ندیم جو کہ الفاظ کو لبادے پہنانے کا عادی نہیں ہے۔ وہ آزادیٔ تحریر کو انسانی آزادی کے لیے لازمی قرار دیتا ہے اور اِس نے آمریت کے جبر و استبداد کے خلاف آواز بلند کی۔ فوجی آمریت کے دور میں آواز اور تخلیقی قوتوں پر پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ ندیم اُس وقت کے قومی منظر کی جیتی جاگتی تصویریں اور آواز پر پابندی کی جھلکیاں یوں بیان کرتے ہیں:

ے بدن آزاد ہیں، اندر مگر زنجیر بجتی ہے
کہ میں مختار ہو کر بھی گنا جاؤں اسیروں میں ۱۴۱؎

ندیم ایسے معاشرے کے خلاف ہیں جہاں آزادیٔ اظہار کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے۔ پاکستان سے گہری محبت کا یہ رنگ ستمبر ۱۹۶۵ء سے مسلسل گہرا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے المیہ پر ندیم پھوٹ پھوٹ کر روتے ہیں۔ یہ ان کی پاکستان سے ٹوٹ کر پیار کرنے کا ثبوت ہے اور کبھی ندیم ارضِ پاک کو پکارتے ہیں اور کبھی ہم وطنوں کو یاد کرتے ہیں۔

ے اے جمالِ آزادی، اے غزالِ آزادی
ہم کہ خاک برسر ہیں، تیرا ساتھ کیسے دیں ۱۴۲؎

ان کی شاعری میں حب وطن قلبی رشتے کے ساتھ اُجاگر ہوتی ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کا اپنی دھرتی اور وطن کے ساتھ گہرا قلبی رشتہ ہے۔

بقول احمد ہمدانی:

''انہیں اپنے وطن اور اسلامی ثقافت سے گہری دل چسپی ہے۔ مذہب و وطنیت کے ساتھ
ان کا دل انسان دوستی کے جذبات سے خالی نہیں۔'' ۱۴۳

ندیمؔ کے ہاں وطن پرستی اور قومیت کا یہ احساس ۱۹۶۵ء کے بعد بڑھتا گیا اور پھر ۱۹۷۱ء میں سقوطِ ڈھاکہ کے وقت یہ احساس کرب میں تبدیل ہو گیا۔ کرب اس امر پر کہ اب پاکستان آدھا رہ گیا۔ ایسے میں ندیمؔ جیسے رجائیت کا پرچار کرنے والا بھی بے اختیار رو پڑا اور عرصہ تک اِس المیے کی یاد میں سلگتا رہا۔ اگر چہ اس المیہ کا احساس تو اِن کی فکر نے کئی برسوں پہلے ہی دے دیا تھا۔ وطن کے دو ٹکڑے ہوئے تو ندیمؔ کی وطن سے محبت میں نئی گہرائی اور گیرائی پیدا ہو گئی۔

ے کیا خبر تھی یہ زمانے بھی ہیں آنے والے
سوتے رہ جائیں گے سوتوں کو جگانے والے ۱۴۴

ندیمؔ لیڈروں اور رہنماؤں کے رویوں اور ان کی نااہلی کو بڑے دُکھ کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ سیاست زندگی کے ہر میدان میں ہر پہلو سے اثر انداز ہوتی ہے۔ اِس لیے ندیمؔ جیسا حساس شاعر اِن اثرات کو کیسے نظر انداز کرتا۔ کیوں کہ افراد اور اقوام کی تقدیر بنانے اور تاریخ متعین کرنے میں سیاست اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ہمارے حکمرانوں نے روس اور امریکہ کی شرائط پر بھارت کی بالادستی قبول کرنے کے لیے نئے عزم باندھے اور نیویارک ٹائمز اور واشنگٹن پوسٹ نے ان ممالک کی بھارتی اور روسی تجویزوں کی حمایت شروع کر دی۔ اقبالؔ اور قائداعظم کے خواب ریزہ ریزہ ہو گئے اور ہمارے حکمران بھارت کے سامنے شکست کی جانب گامزن ہو گئے۔ ندیمؔ اُس دور کے حکمرانوں اور رہنماؤں کے بارے میں کہتے ہیں:

ے رہنماؤں سے بس اتنا سا گلہ ہے مجھ کو
اِن کے ہونٹوں پہ جو باتیں ہیں، وہ ذہنوں میں نہیں ۱۴۵

ے رہنماؤں سے بس اتنا ہی ہمیں کہنا ہے
کہ وہ الفاظ کے ناموس کو بیچا نہ کریں ۱۴۶

شہراہِ شب پہ راہنماؤں کی بھیڑ تھی
ہر ہاتھ میں چراغ تھا، لیکن بجھا ہوا ۱۴۷

ندیمؔ جو کہ وطن کے ہر دُکھ کو اپنا دُکھ گردانتے ہیں۔ سقوطِ ڈھاکہ جیسا المیہ بھی اِس لیے پیش آیا کہ ہمارے لیڈر اور صاحبِ اقتدار لوگ کسی کی بات سننے کو تیار نہ تھے اور اکثر حکمران ذمہ دار نہ تھے اور نااہلی اور ناعاقبت اندیشی کا شکار تھے۔ انھی رہنماؤں کی وجہ سے ملک دو حصوں میں بٹ گیا۔ ندیمؔ جیسا سچا مفکر اور شاعر اِن اثرات کا جائزہ لینے سے نہیں کتراتا۔ اِن حکمرانوں کے دھوکے اور فریب نے اِن کو یہ دن دکھائے ہیں۔

بے وقار آزادی، ہم غریب ملکوں کی
تاج سر پہ رکھا ہے، بیڑیاں ہیں پاؤں میں ۱۴۸

انگریزوں کے پروردہ حکمران طبقہ اور انگریز سے تربیت یافتہ افسران عوام کو اپنی آزاد حکومت کے فیوض و برکات سے دُور رکھنے میں کوشاں تھا۔ یہ لوگ کیوں کہ ظالم تھے، جابر تھے اور ایسے حکمران کبھی بھی ملک کے مخلص نہیں ہو سکتے۔ ملک کے سیاسی حالات کی وجہ سے ندیمؔ نے حکومت پر کڑی تنقید کی ہے۔

سب کو مجبور کر دیا اُس نے
جس کے قبضے میں اختیار آیا ۱۴۹

ندیمؔ کہتے ہیں کہ اگرچہ دانا اور باشعور رہبر کی وجہ سے ملک تو آزاد ہو گیا لیکن یہ خوشی اُدھوری رہی کیوں کہ ایک تو بااختیار طبقے نے اپنے وعدے پورے نہ کیے اور دوسرا ملک کی منصفانہ حدبندی بھی نہ ہوئی۔ اس لیے ندیمؔ کہتے ہیں:

پھر بھیانک تیرگی میں آ گئے
ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے ۱۵۰

حکومت اور رہنماؤں کا فرض ہے کہ تمام لوگوں کو عدل و انصاف میسر ہو لیکن ایسا نہیں ہے۔ ہمارے ہاں سیاست دانوں نے انصاف کے اِن پلڑوں کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال رکھا ہے۔ مظلوم اور کمزور پر یہ حکمران

ظلم وستم ڈھاتے ہیں۔

ے مجھے تلاش ہے اِس عدل گاہ کی جس میں
مرے گناہوں کے الزام آئیں سر میرے ۱۵۱

ہمارا ملک انہی ناانصاف رہنماؤں اور حکمرانوں کی وجہ سے ترقی کی منزل پر گامزن نہیں ہو سکا۔ ہمارے ہاں مسلسل نااہل حکمرانوں کی وجہ سے اگر کبھی کوئی سچا راہنما اِس ملک کو مل بھی جائے تو عوام اِن پر بھروسہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی کیوں کہ ایسے لوگ خال خال ہیں اور دھوکے اور فریب کی وجہ سے سچے راہنماؤں کی بھی قدر نہیں ہوتی۔

ے سزا ملی ہے مجھے گردِ راہ بننے کی
گنہ یہ ہے کہ میں کیوں راستہ دکھا بیٹھا ۱۵۲

ندیمؔ چاہتے ہیں کہ حکمران اس ملک میں انصاف اور مساوات کو فروغ دیں اور صحیح معنوں میں جمہوریت اور جمہوری نظام کو مستحکم کریں۔ ارسطو کا کہنا ہے کہ:

"عوام پر عوام کی مرضی سے عوام کی حکومت کو جمہوریت کہا جاتا ہے۔" ۱۵۳

اِس لیے عوام کے منتخب نمائندوں کو چاہیے کہ اپنے ملک کے اور عوام کے مسائل کو حل کریں۔ ریاکاری، دھوکہ، فریب سے یہ حکمران کوسوں دُور ہوں۔ ایسا محسوس ہو کہ یہ حاکم نہیں بلکہ اُن کے خادم ہیں لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ عوام، اپنے حکمرانوں کو دیکھنے کے لیے ترستے ہیں۔ یہ لوگ منتخب ہونے کے بعد عوام سے اپنا رشتہ توڑ لیتے ہیں۔

ے میں نے بھیجا تجھے ایوانِ حکومت میں مگر
اب تو برسوں ترا دیدار، نہیں ہو سکتا ۱۵۴

ے شانِ جمہور تو جب ہے کہ ہر انسان کہے
میرا حاکم، مرا ہر حکم بجا لاتا ہے ۱۵۵

ندیمؔ خیر کی قوتوں اور اچھائی کی قدروں کے ساتھ ساتھ زندگی کے تسلسل کا پاس بھی رکھتے ہیں۔ اِن کے نزدیک زندگی کا معیار انصاف، ہمدردی، سچائی اور حوصلہ مندی جیسی قدروں پر مشتمل ہے۔ اُنھوں نے زندگی اور اس کی قدروں کو ہر حوالے سے پرکھا اور پھر اُسے بیان بھی کیا ہے۔ ندیمؔ زندگی کی حقیقت اور اِس کی اہمیت پر

غور کرتے ہوئے کہتے ہیں:

؎ اِک پل کی زندگی ابدیت سے کم نہیں
کس شان سے چلی ہے سواری حباب کی ۱۵۶؎

زندگی جو کہ مسلسل حرکت میں ہے۔ اِس کو بسر کرنے کے لیے عزم اور کوششیں کرنی چاہئیں۔ اگر چہ اس کو بسر کرتے وقت بہت سی آزمائشوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی میں اُتار چڑھاؤ بھی آتے ہیں لیکن اِن سے ڈرنا نہیں چاہیے بلکہ ہمت کے ساتھ اِن مشکلات کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

؎ جو حسن و عشق کی پیکار میں آنکھوں سے ٹپکے تھے
انھیں تاروں سے ہے دامانِ ہستی زرنگار اب تک ۱۵۷؎

ندیمؔ زندگی کے کڑے سفر کے دوران پیش آنے والے لمحات کو محبت کے سے جذبے کے ذریعے آسانی سے گزار لیتے ہیں۔ اِن کے نزدیک محبت زندگی کے تاریک پہلوؤں سے توجہ ہٹا دیتی ہے۔ ندیمؔ کہتے ہیں کہ اگر چہ انسان کو دُکھوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن یہی دُکھ انسان کی زندگی کے لیے اہم بھی ہیں۔ دُکھوں کا سامنا کرنے کی وجہ سے ہی انسانیت محفوظ رہتی ہے۔ تکالیف کا مقابلہ کرنے سے ہی انسان سبق سیکھتا ہے۔ اِس لیے زندگی کی قدر کرنی چاہیے اور اسے بے کار بسر کرنے کے بجائے سلیقے سے بسر کرنا چاہیے۔

؎ اگر وہ موت نہیں ہے تو زندگی بھی نہیں
وہ زندگی، جو کٹے جنسِ رائیگاں بن کر ۱۵۸؎

زندگی، ندیمؔ کے نزدیک قیمتی تحفہ ہے۔ اِس لیے اِس کی قدر کرنی چاہیے۔ کیوں کہ اللہ نے جو نعمتیں دی ہیں اُن میں سے سب سے قیمتی حیات ہے۔ زندگی ہی کی بدولت انسان اپنے خدا کو پہچان سکتا ہے۔ اُنھوں نے زندگی کے راز جاننے کے لیے زندگی کو ہر ہر پہلو سے دیکھا ہے۔ زندگی میں بعض اوقات تو ایسے دُکھوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ اُن کے اظہار کے لیے انسانی عمر کم پڑ جاتی ہے لیکن اگر غور و فکر سے کام لیا جائے تو یہی دُکھ اور آگہی بخشنے لگتے ہیں۔

؎ درد سینے میں چمکتے ہیں کہ تیری شمعیں
زندگی، میں ترے احساں نہیں گنوا سکتا ۱۵۹؎

ندیمؔ سوچتے ہیں کہ خدا نے کائنات میں موجود کسی بھی چیز کو بے کار پیدا نہیں کیا۔ اس لیے زندگی جیسی قیمتی چیز کو خدا کیسے بے فائدہ اور بے کار بنا سکتا ہے۔ اگر چہ زندگی میں طوفان اور بھنور بھی آتے ہیں اور زندگی کو موت جیسی اٹل حقیقت کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ موت پر غور وفکر کرتے وقت اِن کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر موت کا مقصد کیا ہے؟ کیا زندگی، موت کے آنے سے ختم ہو جاتی ہے؟ لیکن غور وفکر کے بعد انہیں احساس ہوتا ہے کہ ایک زندگی کے ختم ہوتے ہی ایک اور زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ موت جو کہ عارضی ہے، اس لیے اس سے ڈرنا نہیں چاہیے بلکہ اس کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں:

ے برحق ہے موت اگر، تو ہے برحق حیات بھی
یوں جیتے جی تو موت کی ہیبت سے مر نہ جا ۱۶۰

ندیمؔ نے وجود، عدم اور فنا کے حوالے سے اپنے خیالات کا جس طرح اظہار کیا ہے۔ اِس سے ہمیں زندگی کی ماہیت اور سچائیوں پر غور کرنے کا اشارہ دیتے ہیں۔ موت بھی زندگی کو ختم نہیں کر سکتی بلکہ موت سے تو زندگی کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے اور اِس کی وجہ سے ہی تو زندگی کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ موت زندگی کے تسلسل اور روانی کا نام ہے۔

ے کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں، سمندر میں اُتر جاؤں گا ۱۶۱

ندیمؔ کے نزدیک اگر چہ زندگی چند روزہ ہے اور ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ اِس لیے موت جیسی اٹل حقیقت سے منہ نہیں موڑنا چاہیے بلکہ اس حقیقت کو خوش دلی کے ساتھ قبول کرنا چاہیے اور زندگی کو بھرپور طریقے سے بسر کرنا چاہیے۔ اپنی ذمہ داریوں کو صحیح طریقے سے بسر کرنا چاہیے۔ ایسا کرنے سے جو موت بھی آئے گی، وہ بھی انوکھی ہوگی۔ کیوں کہ ایسی زندگی بسر کرنے کے بعد جو موت آتی ہے وہ ایک اور زندگی میں اُتر جانے کا عمل بنتی ہے۔

ے الٰہی جب بھی مروں میں تو اِس ادا سے مروں
کرن کی طرح کلی میں نفوذ کر جاؤں ۱۶۲

کائنات اور زمین کے بارے میں بہت سے نظریات سامنے آئے ہیں لیکن کائنات کی وسعت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکا۔ اس بے حد وسیع وعریض کائنات میں زندگی کے ناقابلِ تردید ثبوت نہیں ملے۔

علی ناصر زیدی رقم طراز ہیں:

''آئن سٹائن نے ۱۹۰۵ء میں بتایا کہ قدرت نے مادے کو ہر ذرّے میں بے پناہ قوت مرکوز کر دی ہے۔'' ۱۶۳؎

اور پھر کائنات کے متعلق مختلف نظریات ملتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر مسرت حسن:

''شروع میں کرۂ ارض ایک بہت بڑے خشکی کے ٹکڑے کی شکل میں تھا، جس کے آس پاس سمندر تھا، بعد میں مختلف ارضی تبدیلیوں کی وجہ سے زمین خطوں میں بٹتی گئی۔'' ۱۶۴؎

ندیمؔ بھی کائنات اور زمین کے بارے میں اپنا ایک نظریہ رکھتے ہیں۔ ندیمؔ زمین کو انسان کا مسکن کہتے ہیں۔ زمین جو کہ مٹی کا تودہ ہے، انسان بھی اِسی مٹی سے بنا ہے اور کائنات میں زمین پر ہی سب سے زیادہ رنگینی اور دل کشی ہے۔ اِس لیے ترقی کے لیے کیے جانے والے کاموں پر پہلا حق زمین کا ہے۔ اِن کے نزدیک اگر کائنات کا نمونہ دیکھنا ہو تو انسان کو دیکھ لیا جائے۔ ندیمؔ کہتے ہیں:

؎ چاند ہے قیس دشتِ ہفت افلاک
اور زمیں ناقۂ روانِ جمال ۱۶۵؎

کائنات کی وسعتوں اور اُس کا راز جاننے کی خواہش انسان کو بے چین رکھتی ہے اور یہی اضطراب اُسے کائنات کو فتح کر لینے پر مائل کر لیتا ہے۔ ندیمؔ بھی کائنات کی وسعتوں کو کھوجنے کی خواہش کرتا ہے۔

؎ یوں خلاؤں کے تجسس میں ہوں غلطاں جیسے
اِک زمیں اور بھی ہو ماہ و سہا سے آگے ۱۶۶؎

ندیمؔ جو کہ کائنات کی حقیقت کو جاننا چاہتا ہے، اِن کی سوچ اور غور و فکر انہیں کائنات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ اس لیے ندیمؔ کہتے ہیں:

؎ میں نے کی حدِ نظر پار، تو یہ راز کھلا
آسماں تھے تو فقط میرے خیالات میں تھے ۱۶۷؎

ندیمؔ اگرچہ اس کائنات کی وسعتوں کے قائل ہیں لیکن ان سب پر زمین کو ترجیح دیتے ہیں۔ کیوں کہ

ان کے نزدیک مٹی کی اہمیت ہے اور اسی مٹی سے زمین بنی ہے جو کہ اُن کو عزیز ہے۔ ندیم موت کو ایک حقیقت تو مانتے ہیں لیکن اُن کا ایمان ہے کہ اس سے زندگی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اُن کے نزدیک اِس سے زندگی خاک میں مل جاتی ہے اور اس سے نئی طرح کی نمو بن جاتی ہے۔

اپنی فنا سے مجھ کو بلا کی ضد ہے ندیم
سبزہ بن کر اپنی لحد سے نکلا ہوں ۱۶۸

اس زمین سے محبت کی وجہ سے ندیم حیات و ممات کو زندگی کے دو رُخ تو قرار دیتے ہیں بلکہ ہمیشہ رہنے والا ایک دائرہ ہے، اِس لیے موت، زندگی کو ختم نہیں کرتی۔ کیوں کہ ندیم کائنات میں زمین کو اہمیت دیتے ہیں اور زندگی زمین کے علاوہ اور کہیں بھرپور نظر نہیں آتی۔

دیکھ کر قبر سے اُگتا ہوا پھول
اپنا معیارِ بقا یاد آیا ۱۶۹

کائنات میں ندیم کے نزدیک اہم ترین اور اہمیت کی حامل زمین ہے۔ آسمان کے مقابلے میں بھی زمین کو ہی اہمیت دیتے ہیں۔ ندیم کو زمین سے اس قدر پیار ہے کہ وہ اس کو جنت کی طرح خوب صورت گردانتے ہیں۔ زمین کو حد درجہ حسین و جمیل گرداننے کی وجہ سے وہ چاہتے ہیں کہ جنت بھی اِس خوب صورت زمین پر اُتر آئے۔

وہ بہشتوں کے محل ہوں، کہ فرشتوں کی اڑان
سایہ ہر چیز کا بر روئے زمیں ہوتا ہے ۱۷۰

پروفیسر قیصر نجفی، ندیم کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''وہ انسان، زندگی اور کائنات کو اِن کے فطری ربط و انسلاک باہمی کے تناظر میں رکھتے ہیں۔۔۔ اور اِن کے ہر مشاہدے میں خداداد بصارت و بصیرت کے تعمق کا احساس ہوتا ہے۔ وہ حیرت انگیز حد تک انسان کی نفسیات، زندگی کے رموز اور کائنات کے مزاج سے واقف تھے۔'' ۱۷۱

ندیم کا خیال ہے کہ زمین جو دُور تک انسان کا ساتھ دیتی ہے۔ اِس لیے اسے حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔

انسان جتنا چاہے ترقی کر لے اور کائنات کو تسخیر کر لے لیکن اُس پر اُس کی زمین کا حق سب سے زیادہ ہے۔ اس لیے اسے کمتر تصور نہیں کرنا چاہیے۔ ایسا کرنے سے انسان کی اپنی عزت کم ہوتی ہے اور اُس کی عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے۔ اپنی زمین سے وابستہ رہنے اور اُس سے اپنا رابطہ استوار کرنے کی وجہ سے آسمان کی بلندیاں بھی اُس کا احترام کرتی ہیں۔

جو پیار نہ کر سکے زمیں سے
پائیں گے نہ بھیک آسماں سے ۱۷۲ؔ

کائنات کا سیارہ زمین پر زندگی بے حد حسین اور دل فریب ہے۔ اِس میں بے شمار قوتیں ہیں۔ بہت سی ایسی رنگینیاں اور دل چسپیاں ہیں جو انسان کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ پہاڑ، جنگل، صحرا، چرندے پرندے، پھول، بھنورے کی وجہ سے زمین خوب صورت محسوس ہوتی ہے۔ ندیم زمین کو اہمیت زندگی کے نور کی وجہ سے بھی دیتے ہیں اور اس زمین کے بیٹے انسان کی وجہ سے بھی۔ ندیم زمین کو اہم گردانتے ہیں اور انسان کی کامیابیوں کا سہرا زمین کے سر دیتے ہیں۔

زمیں کو میں نے کبھی آسماں نہ ہونے دیا
متاعِ خاک کو یوں رائیگاں نہ ہونے دیا ۱۷۳ؔ

ندیم جو کہ زمین پر مضبوطی سے قدم جمائے ہوئے ہیں اور زمین کو آسمان کی وسعتوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ اِس زمین پر بسنے والا انسان کائنات کا مرکزِ نگاہ ہے اور یہ کائنات جو کہ اُس کے لیے بنائی گئی ہے۔ انسان جو کہ خدا کا شاہکار ہے۔ ندیم اِس شاہکار میں اس کو تخلیق کرنے والے خالق کو ڈھونڈتے ہیں۔ ندیم اگرچہ ترقی پسند تھے لیکن اِس کے باوجود خدا، انسان اور کائنات، موت و حیات کے بارے میں اِن کے نظریات خالص اسلامی فکر کے حامل ہیں۔ انسان کا اپنے خدا سے تعلق ازل سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ ندیم کے ہاں خدا کا ذکر مختلف اور متنوع انداز میں ہوا:

چلن خدا کا، مجھ انسان سے نبھ نہ پائے گا
اُسے مناؤں گا، کیسے، جسے بناؤں گا میں ۱۷۴ؔ

ندیم خدا کو دل کی گہرائیوں سے پکارتے ہیں، کیوں کہ وہ خدا کو ہی مالک اور مختار سمجھتے ہیں۔ خدا ہی ہے جو ہر بات کی خبر رکھتا ہے۔ انسان کے دُکھوں اور تکلیفوں کو سمجھتا ہے۔ اِس لیے وہ اپنے رب کو پکارتے ہیں۔ اسی سے مدد مانگتے ہیں۔

بقول منصورہ احمد:

''انسان ہمیشہ سے کسی ایسی پناہ گاہ کی تلاش میں ہے جسے وہ معبود کہہ سکے۔۔۔ انسان اور خدا، یا دوسرے لفظوں میں انسان اور فطرت کا سب سے سچا رشتہ یہ ہے کہ انسان کا مایوسی اور خوف سے ڈولتا ہوا دل امید اور سہارے ڈھونڈتا ہے اور اس سہارے کو وہ خدا کا نام دیتا ہے۔'' ۱۷۵

جیسا کہ ندیم کہتے ہیں:

چپ ہوں کہ چپ کی داد پہ ایمان ہے مرا
مانگوں دعا جو میرے خدا کو خبر نہ ہو ۱۷۶

ندیم کا خدا پر بھرپور اعتماد ہے جس کی وجہ سے وہ اپنا ہر راز اپنے اِس مہربان کو بتاتے ہیں اور اسی مہربان اور رازداں سے مدد مانگتے ہیں۔ اُنہیں اپنے خدا پر اعتماد ہی ہے جو انہیں اس بات پر خوشی دیتا ہے کہ خدا انہیں کسی لمحہ نہیں بھولتا۔ اس لیے ندیم اپنی خواہشات کو خدا کے حضور بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہر بشر کو جو خدا پاس بلا لیتا ہے
وہ خدا بھی تو کسی روز بشر تک پہنچے ۱۷۷

کہنا چاہوں، مگر اے کاش کبھی کہہ پاؤں
آسمانوں سے اُتر آ کہ تجھے اپناؤں ۱۷۸

ندیم جو کہ خدا کو اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ یہی دوست ان کا غم گسار ہے۔ اس ہم درد دوست سے ندیم دوستی نباہنے کی توقع رکھتے ہیں۔ اپنے اِس دوست کے جو کہ بڑا جلال و جمال والا ہے، علیم وخبیر ہے، اسی کے بڑے قدردان ہیں۔ اِس کی ہمدردیوں اور مہربانیوں کے دل سے شکرگزار ہیں۔ کیوں کہ اِسی ہم درد دوست کا سہارا

ان کے لیے ہمت کا باعث ہے۔

مرا کوئی بھی نہیں کائنات بھر میں ندیمؔ
اگر خدا بھی نہ ہوتا تو میں کدھر جاتا ۱۷۹؎

ندیمؔ نے خدا سے اپنے تعلق کو بیان کرنے کے لیے الگ انداز اختیار کیا ہے۔ اُن کا انداز غالبؔ، اقبالؔ اور جوشؔ سے ہٹ کر ہے۔ اُن کے ہاں انفرادیت بھی ہے اور اُنھوں نے خدا سے اپنے تعلق کو بیان کرتے ہوئے اپنے خیالات اور جذبات سے منفرد انداز اختیار کیا ہے۔

بقول الطاف حسین حالی:

''یہ صحیح نہیں ہے کہ جو خیالات اگلوں نے زمانہ کے اقتضا سے یا جذبات کے جوش میں ظاہر کیے ہیں، ہم بھی وہی راگ گاتے رہیں اور انہیں کے خیالات کا اعادہ کرتے رہیں،نہیں، بلکہ ہم کو چاہیے کہ اپنی غزل کو خود اپنے خیالات اور اپنے جذبات کا آرگن بنائیں۔'' ۱۸۰؎

ندیمؔ کے ہاں خدا دوست اور ہم درد ہے۔ ندیمؔ اپنے اِس دوست خدا سے بے تکلف ہے۔ یہ دوستی اِس قدر گہری ہے کہ بعض اوقات وہ اپنے اِس دوست پر طنز بھی کرتے ہیں اور اِن سے طنزیہ سوال بھی کرتے ہیں۔ ندیمؔ اپنے سوالوں کا جواب چاہتے ہیں۔ اِس لیے وہ پوچھتے ہیں:

مرے سوال کا، یارب! کوئی جواب ملے
زمیں پہ کیوں مجھے اتنے فلک مآب ملے ۱۸۱؎

یارب! تو اوجِ عرش سے اُترے تو یہ کہوں
اِس عدل گاہ میں مارا گیا بے خطا سدا ۱۸۲؎

ندیمؔ کے ہاں خدا نگراں کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس تعلق کی بنا پر ہی وہ خدا سے گلہ کرتا ہے۔ مجتبیٰ حسین ان کے اس تعلق کے متعلق رقم طراز ہیں:

''ندیم کے کلام میں خدا کوئی گہرا اور پیچیدہ انسانی یا مابعدالطبیعاتی مسئلہ نہیں ہے۔ خدا، اِن کے یہاں دوست، نگراں، دل نشیں اور گاؤں ہے۔'' ۱۸۳؎

ندیم اگرچہ بعض اوقات خدا سے گلہ شکوہ بھی کرتا ہے لیکن یہ گلہ اس لیے ہے کہ وہ انسان اور خدا کے تعلق کو بھی سمجھتے ہیں۔ انسان جسے خدا نے بنایا ہے، لیکن خدا اِس انسان کو تمام مخلوقات پر اوّلیت دیتے ہیں اور اسے کائنات کی پیاری شے گردانتے ہیں۔ اس لیے اُن کا خدا سے شکوہ بھی بطورِ انسان کے ہی ہے۔ انسانی سوچ اور نفسیات کے مطابق اپنے رب سے شکوہ کیا ہے۔ کہتے ہیں:

سہارا ہے مجھے جس کے محیطِ کبریائی کا
اُسی سے مجھ کو شکوہ ہے دعا کی نارسائی کا ۱۸۴

ندیم نے جو تصورِ انسان دیا ہے، اِس پر مغرب کی ہیومیزم کی تحاریک اور مشرق کے صوفیانہ تصورات دونوں کے اثرات نظر آتے ہیں لیکن ندیم نے محض تقلیدی رویہ نہیں اپنایا بلکہ ان دونوں روایتوں کے تصورات انسان کا محاکمہ بھی کیا ہے۔ صوفیا نے خدا کو، جواب تک پردہ تجرید میں رکھا۔ ندیم نے اِس تصور کی نفی کی اور خدا اور انسان کے مابین حائل پردوں اور فاصلوں کو ختم کیا۔ دوسری طرف مغرب میں انسان دوستی کے نام پر مذہب اور خدا کی نفی ہوئی۔ اس پر بھی ندیم نے اعتراض کیا اور اُسے منفیت کا منشور قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک خدا انسان کا دوست ہے، نہ کہ ایسی ہیبت ناک ہستی ہے جس سے انسان خدا سے کلام نہ کر سکے۔ ملاؤں نے ایسے خدا کا تصور دیا ہے جس سے اِس ہستی پر غور وفکر نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو خدا انسان کے ذہن میں تجسس کی گنجائش کبھی نہ رکھتا۔ ندیم اُن باطل تصورات کے خلاف جنگ کرتے ہیں۔ یہ تصورات عموماً استحصال کی قوتوں نے گھڑ رکھے ہیں۔ اس لیے فتح محمد ملک رقم طراز ہیں:

''ندیم کے طنز کا نشانہ صحنِ حرم کے وہ برہمن ہیں جو خدا کے نام پر انسانی زندگی سے حسن وتوازن اور خیر و برکت کی اقدار چھین لینا چاہتے ہیں۔'' ۱۸۵

ندیم کہتے ہیں:

حسن وتوازن کے رسیا ہیں کیوں اضداد سے صلح کریں
اس لیے تو صحنِ حرم کے برہمنوں سے لڑائی ہوئی ۱۸۶

ندیم جو کہ اِس مطلق العنان حکمران کے سوا اور کسی مظہر کی طرف توجہ نہیں دیتا بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ خدا کے اِس لامحدود حسن میں جذب ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس لیے اس خدا کو دل کی گہرائیوں سے آواز دیتے

ہیں۔ جب بیکراں حسن سے پردہ اٹھتا ہے تو ندیم کو حجابات اُٹھنے پر اِس حسن کار کے کئی شاہکار دیکھنے کو ملتے ہیں۔ حقیقتِ مطلق سے آگہی اور اُس کی پہچان نے ندیمؔ پر خدا اور اِس کائنات و انسان کے راز کو منکشف کیا اور خدا کے حسن کا عاشق حرم کے برہمنوں اور شیخ و واعظ سے یوں گفتگو کرتا ہے۔

؎ نفسی نفسی بھی وہی بیچ کی دُہائی بھی وہی
تیرا محشر مرا مانوس نظارا نکلا ۱۸۷

ندیمؔ، قرۃ العین طاہرہ کو دیے گئے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

''اسلام دنیا کا ترقی پسند ترین'' مذہب ہے۔ یہ ملائیت کے مذہب سے الگ، سادہ اور سچا مذہب ہے اور میری ترقی پسندی نے بیشتر، قرآن و حدیث اور حضورؐ کے اسوۂ حسنہ سے انسپریشن حاصل کیا ہے۔'' ۱۸۸

غزل جس کا اہم ترین موضوع تصوف ہے اور غزل نے تصوف اور عشق سے اپنا علامتی نظام وضع کیا۔ تصوف کو روحانیت تک پہنچنے کا اہم ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ تصوف کے حوالے سے ڈاکٹر نجیب جمال لکھتے ہیں:

''تصوف کا تعلق تمام تر وارداتِ قلبی اور محسوسات داخلی سے ہے۔'' ۱۸۹

ندیمؔ خدا کے مقابلے میں ہمیشہ خود کو انسان سمجھتے ہیں لیکن ندیمؔ کے یہاں تصوف کا جو رنگ ہے، وہ صوفی سے بالکل مختلف ہے۔ صوفی دنیا سے دل نہ لگانے کی نصیحت کرتے ہیں تاکہ جو زندگی اُنہیں ملی ہے اُس کو جلد از جلد مکمل کر کے اِس دنیا سے رخصت ہو جائیں۔ لیکن ندیمؔ کو زندگی بہت پیاری ہے۔ لیکن یہ محبت اُن کی اچھائی کو ظاہر کرتی ہے، نہ کہ ایسی محبت ہے جو کہ دنیادار کی ہوتی ہے۔ ندیمؔ کہتے ہیں:

؎ سب خدوخال خدا کے ہیں مصور جیسے
یہ جو انسان نظر آتے ہیں تصویریں ہیں! ۱۹۰

ندیمؔ خدا کو اِس طرح پہچانتے ہیں کہ اِس رنگا رنگ اور خوب صورت کائنات کو انسان کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس طرح اِن کے یہاں تصوف کا جو رنگ ہے وہ جدید دور کا نمائندہ ہے اور بڑا باشعور ہے۔ ندیمؔ کو مجازی

محبوب کے پردے میں بھی حقیقی محبوب کا رنگ نظر آتا ہے۔

ترے جمال کی سرحد سے کبریا کا مقام
بہت قریب تو کیا ہے، مگر قریب سا تھا ۱۹۱

ندیم کے ہاں تصوف کی جو جھلک نظر آتی ہے۔ وہ اُردو کے بیشتر غزل گو شعرا سے مختلف ہے۔ دوسرے شعرا نے متصوفانہ رنگ اپنایا ہے جب کہ ندیم نے اپنی انفرادیت کو قائم رکھا ہے اور مستی اور مدہوشی کی بجائے شعور و ادراک سے کام لیا ہے۔

وہی خدا، کہ جو افلاک سے اُترتا نہیں
اُسی کا عکس مجھے خاک پر نظر آئے ۱۹۲

غزل کی اہم ترین صفت سادگی، صفائی اور خوبیٔ بیان ہے۔ ایسی غزل جس میں تاثیر ہو اور جو ذہن اور قلب کو گہرائیوں تک متاثر کرے اور جس میں ظاہری کشش ہو اُس کو بہترین غزل کہا جاتا ہے۔ اِس لیے غزل کی نمایاں ترین خصوصیات میں اختصار، بلند تخیل، الفاظ کا صحیح استعمال، رمزیت و ایمائیت، درد و غم، موسیقی، سادگی، صداقت، فصاحت و بلاغت شامل ہیں۔ اچھی غزل کے لیے شاعر کی موزونی طبع کے ساتھ ساتھ روشن دماغ، مثبت سوچ اور حساس دل، روایات کا تحفظ اور اپنے عہد کے تقاضوں کا احساس ضروری ہے۔ ندیم نے جو غزلیں لکھی ہیں، اُس میں سنجیدگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ اگرچہ اُنھوں نے غزل کے لیے جو زبان استعمال کی ہے اُس میں لہجے کی رعنائی بھی پائی جاتی ہے لیکن اِس کی غزل میں جو آواز سنائی دیتی ہے اُس میں نہ تو جوش حد سے تجاوز کرتا ہے اور نہ وہ ایسی مسحور کن ہوتی ہے کہ لوری دینے لگے بلکہ اس میں ایسا انداز پایا جاتا ہے جس سے سوچ اور احساس کی مثبت تحریک پیدا ہوتی ہے اور اِن کی آواز کی یہی مستقل مزاجی اِن کی غزل کے وقار کو اور نمایاں کرتی ہے۔ ندیم نے اپنی غزل میں مناسب الفاظ کا انتخاب کیا۔ ان کے اس متنوع ڈکشن کے بارے میں مولانا عبدالمجید سالک، ندیم کے مجموعۂ کلام ''شعلہ گل'' کے تعارف میں لکھتے ہیں:

''ندیم نے ہماری شاعری میں گراں بہا اضافہ کیا ہے، اس نے اظہار کے کئی نئے راستے دکھائے ہیں۔ وہ وزن و بحر اور قافیہ ردیف کے معاملے میں بھی صرف اِس حد تک تجاوز یا

انحراف کا روادار ہے، جو ہماری شاعری کے مزاج کے مطابق ہو، وہ الفاظ کے انتخاب میں
بے حد محتاط ہے، وہ ان کی موسیقی کو بھی سمجھتا ہے اور بعض اوقات اِن کے استعمال میں ایسا
امتیاز کرتا ہے کہ پرانے شعرا منہ تکتے رہ جاتے ہیں اور انہیں انکار و اعراض کی جرأت
نہیں ہوتی۔'' ۱۹۳

ندیم نے اپنی غزلوں میں ایسے بامعنی، سادہ اور انوکھے الفاظ سلیقے سے استعمال کیے ہیں جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ الفاظ و زبان کے باکمال شاعر ہیں۔ ندیم کی غزل کی آواز ایسی ہے جو مغلیہ عہد سے لے کر تقسیم برصغیر تک کی قدیم آواز سے بالکل مختلف ہے بلکہ اس کو بیسویں صدی کے نصف آخر کی نمائندہ آواز کہہ سکتے ہیں۔ ندیم نے اپنی غزل میں فارسی اور ہندی الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے اور اِس کے ساتھ ساتھ پنجابی کے الفاظ کو بھی برتا ہے لیکن ایسے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں جو اردو غزل کے مزاج سے مختلف ہیں۔ ایسے الفاظ کے استعمال سے ہی ندیم نے اجتہاد سے کام لیا ہے اور ایسے الفاظ، غزل میں جس جس مقام پر استعمال ہوئے ہیں۔ برمحل و برموقع ہیں۔ کچھ ایسے الفاظ میں مڈبھیڑ، انجماد، مسلط، کڑکا، غماز، کٹی پتنگ، کیسہ، کڑیاں، بھن رہا تھا، جھریوں، اندمال، محیط، لدے لدے جھٹپٹے، بھوبھل، ہول آفرینی، تھاہ، بغاوت، بدکردار، پھڑ پھڑائیں، کترا، اترا، جراحت، چوٹ، سفارش، بدکردار، مصافحہ، اسلوب، تعاقب، جراحی، دل ربائی، ابتدائی، بھیانک، سوگند، دھتکار، عنایات، کھٹکھٹا، مبہوت، پھاند کے، دسترس، کوتاہی، بچھاؤ، چھاگل، تعارف، عنایات، بلک، تمازت، چھلنی وغیرہ شامل ہیں۔ اُردو غزل میں کچھ حروف کے استعمال سے گریز کیا گیا جن میں ت، ٹ، چ، ڈ، ڑ، ز، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، پھ، ٹھ، ڈھ، کھ وغیرہ شامل ہیں لیکن ندیم نے اپنی غزل میں اِن الفاظ کے استعمال میں ہچکچاہٹ کو دُور کیا۔

بقول قاضی عبدالرحمٰن ہاشمی:

''شاعر اپنے گہرے اور پیچیدہ جذبات کے اظہار کے لیے عام الفاظ کو غیر معمولی
سیاق و سباق میں استعمال کر کے نہ صرف لفظوں کو ایک نوع کی حرارت عطا کر دیتا ہے
بلکہ جذباتی تناؤ کے عالم میں استعمال کیے گئے الفاظ کا یہ غیر معمولی انداز اِس کے
طرزِ احساس کو متاثر کر کے اِس کے سامنے ان خیالات و تجربات، تلمیحات و علائم اور

حسی پیکروں کا دروازہ کھول دیتا ہے، جو عام حالت میں اِس کے تحت الشعور میں
پوشیدہ ہوتے ہیں۔" ۱۹۴

ندیم اپنی غزل میں نئے نئے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور الفاظ و بیان کے ساتھ ان کی تراکیب بھی انوکھی ہیں۔ جیسا کہ مصحف نورانی، مقصد خاص، درسِ ترک عشق، بہ خط جلی، خانہ تباہ، رسم بے سر و سامانی، شہر عزت مند، نذرِ اُمید بہار، تصویر شمیم گل وغیرہ۔

ندیم کی غزل کا مطلع انوکھا اور معنی خیز ہوتا ہے اور ان کا مقطع بھی ان کی فنی پختگی کا ثبوت دیتا ہے۔ ندیم کے تخلص کا اِن کے کلام پر گہرا اثر ہے۔ اِن کا تخلص ان کے مزاج اور لہجے کا تعین کرتا ہے۔ ان کا دوستی بھرا ہم درد لہجہ نہ صرف اپنے دوست کے ساتھ بیٹھ کر آنسو بہاتا ہے بلکہ اُس کو اُمید بھی دیتا ہے۔ ایسا دوست جو کہ مخلص ہے، اس لیے وہ نہ صرف اپنے دوست کی خامیوں کی نشان دہی کرتا ہے بلکہ اُس کو دُور کرنے کی خواہش کرتا ہے۔ یہی خاصیت اِن کے کردار اور اشعار میں دکھائی دیتی ہے:

؎ یہ فقط میرا تخلص ہی نہیں ہے کہ ندیم
میرا کردار کا کردار ہے اور نام کا نام ۱۹۵

ندیم نے غزل میں متنوع پیرایہ میں بحروں کا استعمال کیا ہے، انھوں نے طویل بحر ہو یا مختصر، اس کو سلیقے سے برتا ہے۔ بحریں شاعر کے مزاج اور اِس کے لہجہ کو ظاہر کرتی ہیں۔

بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

''غزل کی ہیئت اور اِس کے جمالیاتی پہلو میں کسی مخصوص بحر کے انتخاب کو بڑا
دخل ہے۔" ۱۹۶

ندیم نے چھوٹی، درمیانی اور لمبی ہر بحر میں طبع آزمائی کی ہے اور اِن بحروں کو بے تکلفی سے برتا ہے لیکن انھوں نے چھوٹی بحروں میں ایسے اشعار کہے ہیں جس سے ان کو انفرادی غزل گو کہا گیا ہے۔ اگر چہ چھوٹی بحروں میں اشعار کہنا مہارت کا متقاضی ہوتا ہے لیکن ندیم نے تھوڑے اور مختصر الفاظ کے ذریعے خیال کا اظہار ایسے طریقے سے کیا کہ ان کی ذہانت اور خوب صورتی اُجاگر ہوتی ہے۔ انتہائی خوبی سے اِس بحر کا استعمال آغاز ہی سے کیا۔

اپنے مجموعہ کلام ''بسیط'' کی مختصر بحر کی غزلیں اِن کے اظہار کے کمال کے بہترین نمونے ہیں۔ اس طرح ''جلال و جمال'' کی ۱۹۳۸ء میں کہی گئی یہ غزل بھی اِن کی اس انفرادیت کو ظاہر کرتی ہے:

ے جب سے میں قریب ہوں تمہارے
ہر چیز کو دُور دیکھتا ہوں ۱۹۷

۱۹۴۱ء میں کہی گئی چھوٹی بحر کی یہ غزل بھی جامع خوبیوں کی حامل ہے:

ے چھلنی چھلنی ہوئے ہیں جسم و جاں
تیر کیوں بے نشاں لگائے ہیں ۱۹۸

''بسیط'' میں چھوٹی بحر کی یہ غزل شاہکار ہے۔

ے چپکے سے فریب کھا لیا ہے
ہم نے ترا بھید پا لیا ہے ۱۹۹

درمیانی بحر کو بھی ندیم نے کمال خوبی سے برتا ہے:

ے جسے بھی دیکھوں، ترے خدوخال میں دیکھوں
جدھر بھی جاؤں، تری رہگزر نظر آئے ۲۰۰

ندیم کی طویل بحر ملاحظہ کریں:

ے میں امین و قدر شناس تھا، مجھے سانس سانس کا پاس تھا
یہ جبیں پہ ہیں جو لکھے ہوئے، یہ حساب ہیں مہ و سال کے ۲۰۱

ندیم کی غزل میں قافیہ اور ردیف بحر کی روانی اور موسیقیت سے ہم آہنگ ہوتے ہیں اور یہ بحر کی فضا میں گھل مل کر فکری وحدت کو آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً:

ے راہیں لٹ سی گئیں، مٹ سے گئے قدموں کے نشاں
سُن رہا ہوں تری پازیب کی جھنکار ابھی ۲۰۲

اِس غزل کی ردیف 'ابھی' غزل کی فکری وحدت کو مسلسل آگے بڑھا رہی ہے اور قافیہ کے ساتھ مل کر صوتی آہنگ بھی

پیدا کر رہی ہے۔

سادگی اور سلاست بھی ندیمؔ کی غزلوں میں خاص طور پر پائی جاتی ہے۔ اگرچہ ابتدائی کلام میں یہ سادگی لہجے کو کھردرا کر دیتی ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اِس سادگی نے اِن کے لہجے کو خوب صورت اور متاثر کن روانی عطا کی ہے۔ اِس سادگی نے اِن کی غزل میں جدت کو کم نہیں کیا بلکہ ان کے اسلوب کو خوب صورتی بخشی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی غزل کا لہجہ اپنے ہم عصروں سے مختلف ہو گیا ہے۔ ندیمؔ کا خاص کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے ایجاز و اختصار سے کام لیا ہے اور طویل مضامین کو سادہ اور رواں انداز میں ایک شعر کے اندر سمیٹ لیا ہے۔ اِس سے حسن کلام کے متنوع جوہر نمایاں ہو کر تخلیق کی جمالیاتی قدروں کا سبب بنے ہیں۔ اس سلسلے میں مزمل حسین رقم طراز ہیں:

> ''شاعری میں یہی ایجاز، معجز بیان کے زمرے میں آتا ہے۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ کلام میں تمام ایمائی کیفیات، خصوصاً غزل میں ایجاز ہی کی بدولت رونما ہوتی ہیں۔'' ۲۰۳؎

تخلیقی عمل کے دوران شاعر زبان کے مروجہ معنی تبدیل کر کے نئے معنی کی حامل زبان تخلیق کرتا ہے جن میں فکر و فن کی جمالیاتی قدریں نئے رنگوں سے سامنے آتی ہیں۔ یہ زبان اشاراتی کیفیات سے مالامال ہوتی ہے اور اس کا بنیادی مزاج ''ایجاز'' ہوتا ہے۔ اِس ایجاز و اختصار سے کام لیتا ہے اور غیر ضروری باتوں سے خود کو دُور رکھتا ہے۔ ندیمؔ نے اپنے اشعار میں ایجاز و اختصار سے کام لیا ہے اور اِن کے اختصار کے حامل اشعار شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔

؎ میں چھوڑ کے سیدھے راستوں کو
بھٹکی ہوئی نیکیاں کماؤں ۲۰۴؎

ندیمؔ کی اِس سادگی و سلاست اور اختصار و روانی نے اِن کے اشعار کو سہل ممتنع کی خوبی حاصل کر لینے کا رتبہ دلا دیا ہے۔ سہل ممتنع کے بارے میں حسرتؔ لکھتے ہیں:

> ''جس کو دیکھ کر ہر شخص بہ ظاہر یہ سمجھے کہ بات میرے دل میں بھی تھی اور ایسا کہنا ہر شاعر کے لیے آسان ہے مگر جب خود کوشش کرے ویسا لکھنا چاہے تو لکھ نہ سکے۔'' ۲۰۵؎

ندیم کے درج ذیل اشعار سہل ممتنع کی خوبی رکھتے ہیں:

؎ میں کشتی میں اکیلا تو نہیں ہوں
مرے ہمراہ دریا جا رہا ہے ۲۰۶

؎ کر لیا میں نے وقت کو پابند
وقت کے ساتھ ساتھ چلتا ہوں ۲۰۷

غزل کو اندرونی جذبات و احساسات کے اظہار کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے لیکن ندیم کے ہاں داخلیت اور خارجیت کا حسین امتزاج ملتا ہے کیوں کہ وہ نہ تو داخلیت پرستی کو اِس حد تک پسند کرتے ہیں کہ بیرونی دنیا سے رابطہ ختم ہو جائے اور نہ ہی خارجی لوازم کو غزل کے لیے مناسب سمجھتے ہیں۔ مثلاً:

؎ جس کو بھی دیکھتا ہوں، جستجوئے ذات میں ہے
میں کسے بزم میں شامل، کسے تنہا سمجھوں ۲۰۸

فصاحت و بلاغت کو اگر چہ ہر شاعری کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے لیکن فصاحت و بلاغت کا استعمال غزل کی خوبی سمجھا جاتا ہے اور اسے غزل کی پہلی شرط ٹھہراتے ہیں۔ بلاغت سے مراد یہ ہے کہ فکر و احساس کو حالات کے موافق بات کرنا اور فصاحت کو بلاغت کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ندیم کا فن انسان اور زندگی کی نمائندگی بھرپور اور پرتاثیر انداز میں کرتا ہے۔ اِس لیے اِن کے ہاں موزوں ترین الفاظ کا انتخاب اور فصاحت و بلاغت کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔

؎ طے کروں گا یہ اندھیرا میں اکیلا کیسے
میرے ہمراہ چلے گا میرا سایہ کیسے ۲۰۹

ندیم جو کہ بناوٹ اور تصنع کو پسند نہیں کرتے، اس لیے اپنی غزل کو صنائع و بدائع کا محتاج نہیں بناتے۔ البتہ شاعری میں رکھ رکھاؤ کا خیال رکھتے اور اہم لوازمات کی قدر بھی ضرور کرتے ہیں۔ درج ذیل شعر میں ندیم نے صنعتِ تضاد سے خوب کام لیا ہے:

؎ کتنی صدیوں سے میں پیاسا ہوں ندیم
کتنی صدیوں سے گھٹا چھائی ہے ۲۱۰

اور اِن کے وجدان کی گہرائی کا اندازہ اِن اشعار سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

ے
تو نے یوں دیکھا ہے جیسے کبھی دیکھا ہی نہیں
میں تو دِل میں ترے قدموں کے نشاں تک دیکھوں
وقت نے ذہن میں دھندلا دیئے تیرے خد و خال
یوں تو میں ٹوٹتے تاروں کا دھواں تک دیکھوں ۲۱۵

ندیم کے ہاں انوکھے استعارے استعمال ہوئے ہیں جو کہ مظاہر کے داخلی رشتوں کو ظاہر کرتے ہیں اور اِن کی منفرد قوتِ تخیلہ کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اِس طرح یہ اصطلاحی اشارے جسے علم بیان کہتے ہیں، اِن کی غزل میں جمال پیدا کرتے ہیں اور معنی کے کئی معجزے سامنے لاتے ہیں۔ ندیمؔ کی غزل میں اِن تشبیہات و استعارات کی موجودگی سے یہ مراد نہیں کہ اِن کی وجہ سے معجز بیانی کے مراحل طے ہو گئے ہیں بلکہ اِن کے استعمال سے اِن کی صناعی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ندیمؔ جیسے با کمال شاعر اور تخلیقی شخص نے جس طرح زبان کا استعمال کیا ہے، اِس سے اِن کی شاعری پُر لطف اور تاثیر سے بھر پور ہو گئی ہے۔

سید وقار عظیم رقم طراز ہیں:

''تشبیہیں، استعارے، کنایے اور تلمیحات اِن بے شمار علامات اور اشارات میں سے چند ہیں جنھوں نے نہ صرف خیال کے ابلاغ اور تحفظ کا یہ فریضہ بڑے مؤثر انداز میں ادا کیا ہے بلکہ حسنِ کلام کے اِس جوہر کو نمایاں کرنے کی خدمت بھی انجام دی، جسے ہم ایجاز کہتے ہیں۔'' ۲۱۶

شاعری میں استعاراتی زبان کا استعمال محض انفرادیت پیدا کرنے کے لیے نہیں ہوتا بلکہ اِس کے پیچھے شاعر کے عظیم مقاصد ہوتے ہیں۔ اُن تجربات و مشاہدات کو شاعر بیان کرتا ہے جن کا ادراک عام آدمی کو نہیں ہوتا۔ ندیمؔ بھی معمولی لفظوں سے غیر معمولی معنی پیدا کرتے ہیں اور جذبات کی شدت کو لفظوں کی صورت میں اُجاگر کرتے ہیں۔ ندیمؔ استعارہ کے ذریعے اپنے ایک لفظ میں بیان ہو کر معنی کی کئی تہیں کھول دیتا ہے۔ اِن کی شاعری میں بھی استعارہ حسی تاثر پیدا کرتا ہے۔

استعارے کے استعمال کے ساتھ ساتھ شاعری میں فنی جمال کے لیے علامت نگاری کے کردار کو بھی

نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ شاعری اور علامتی زبان آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ شعر اور غیر شعر میں بنیادی فرق زبان ہی کا ہوتا ہے۔ شاعری میں اظہار کے لیے علامتی زبان استعمال ہوتی ہے۔

بقول ممتاز حسین:

''ہم کسی لفظ کو اِن معنوں میں بھی استعمال کر سکتے ہیں جن معنوں کے لیے وہ لفظ وضع ہوا ہے اور اسے ایسے معنوں میں بھی استعمال کر سکتے ہیں جن معنوں کے لیے وہ لفظ وضع نہیں ہوا۔۔۔ کسی لفظ کا مجازی مفہوم ہی دراصل علامتی مفہوم ہے۔'' ۲۱۷

انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ بات کو مختلف علامتوں اور اشاروں کے ذریعے پیش کرتا ہے۔ اِسی بنا پر انسان کو Symbol - using Animal کہا جاتا ہے۔ اظہار کے اِس علامتی نظام نے ہر دور میں نئی نئی علامتیں اور اشارے تخلیق کیے ہیں۔ جن سے حسنِ کلام کے متنوع جوہر نمایاں ہو کر تخلیق کی جمالیاتی قدروں کا سبب بنتے ہیں۔ علامت کے حوالے سے حفیظ صدیقی لکھتے ہیں:

''علامت عہدِ حاضر کی شعری اصطلاحوں میں سے ایک مقبول اصطلاح ہے۔ علامت کے عام طور پر یہ معنی لیے جاتے ہیں کہ کوئی شے کردار یا واقعہ جو بطور مجاز اپنے سے ماورا کسی اور شے کی نمائندگی کرے۔'' ۲۱۸

ڈاکٹر سید عبداللہ علامت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''علامت مخفی تصورات کے وسیع نظام کی مجمل ترین شکل ہے۔'' ۲۱۹

بعض اوقات علامت اور استعارہ ایک ہی تصور کیے جاتے ہیں۔ اِس حوالے سے سید احمد دہلوی رقم طراز ہیں:

''اُردو شاعری میں استعارات اور کنایات کا استعمال باقاعدگی سے ہوا ہے۔ بعض اوقات استعارہ اور علامت کو ایک ہی تصور کیا جاتا ہے کیوں کہ لغت کے مطابق ''علامت'' کے معنی نشان، پتا، سُراغ، کھوج وغیرہ کے ساتھ ساتھ اشارہ اور کنایہ کے بھی ہیں۔'' ۲۲۰

عام طور پر علامت کا تعلق شاعر کے ذاتی اور انفرادی تجربے سے ہوتا ہے اور ان علامتوں کا پس منظر، شاعر کے ذاتی حالات اور اِس کے عہد کے سیاسی و سماجی حالات ہوتے ہیں۔ اِس لیے شاعری میں علامتوں کے استعمال کو شاعر کی شخصیت اور اِس کے عہد کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔

بقول فیض احمد فیض:

''علامت سے ہم ایسے استعارے مراد لیتے ہیں جنھیں شاعر اپنے بنیادی تصورات کے لیے استعمال کرتا ہے۔'' ۲۲۱

ندیم کے ہاں جو علامتیں استعمال ہوئی ہیں، وہ روایت کے تسلسل کو ساتھ رکھتے ہوئے جدید عہد کی بھی عکاسی کرتی ہیں اور اِس سے اِن کے خیالات کے اظہار میں خوب مدد کرتی ہیں:

ے تھک کے ٹیلوں پہ اُتر آئی ہیں پیاسی چڑیاں
جیسے صحراؤں میں چشمے ہوں اُبلنے والے ۲۲۲

بعض اوقات شاعر علامتوں اور اشاروں سے نئے معنی اخذ کرتے ہیں اور اِن کے روایتی معنی نظر انداز کر دیتے ہیں اور روایتی علامتوں سے نئے تصورات کے اظہار کا کام لیتے ہیں۔ ندیم نے علامتوں کے استعمال سے نئے معنی تلاش کیے ہیں۔ اِن کے ہاں منفرد موضوعات اور خیالات کے تنوع نے اِن کے طرزِ بیان کو یکسانیت سے بچایا ہے اور اس سے اِن کی غزل کے لہجے کی توانائی میں اضافہ ہوا ہے۔ ندیم ایک بات کو بار بار نہیں دہراتے بلکہ نئے نئے موضوعات کا اظہار کرتے ہیں۔ ندیم نے جو انوکھے اور نئے مضامین باندھے ہیں اور پرانے مضامین میں اِس طرح شعر کہے ہیں کہ جدت کا احساس ہوتا ہے۔ غزل کو انفرادیت دینے میں ندیم کی اِس صفت کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ندیم کے اِس شعر میں علامت کا خوب صورت استعمال ہوا ہے:

ے مکالمات فلاطوں ہوں یا ندیم کے شعر
کوئی بجھا نہ سکا فطرت بشر کے چراغ ۲۲۳

اس شعر میں 'فطرتِ بشر کے چراغ' روشنی کی علامت بن کر اُبھرے ہیں۔ غزل میں رمزیت و ایمائیت کی خصوصیت سب سے زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ اِس سے غزل میں مجموعی طور پر ایک مخصوص انداز پیدا ہوتا ہے۔ رمزیت و ایمائیت غزل کے بنیادی لوازم ہیں۔ یہ علامتوں اور اشاروں سے پیدا ہوتے ہیں اور تلمیحوں اور تمثیلوں کے سہارے بھی وجود میں آتے ہیں۔

ندیم کی غزل میں رمزیت اور ایمائیت سے بھی کام لیا گیا ہے۔ اِس سے سامنے کے معنی کی جگہ گہرے معنی کا وسیع تر سلسلہ پایا جاتا ہے اور اس سے شعر کی گہرائی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اِس کا تعلق علامت اور کنایے سے

بھی ہوتا ہے اور استعارے سے بھی۔ ندیم نے رمزیت و ایمائیت کی مدد سے بات کو بالکل واضح کرنے کی بجائے تھوڑا سا چھپا کر بیان کیا ہے۔

؎ حکم ہے سچ بھی قرینے سے کہا جائے ندیم
زخم کو زخم نہیں، پھول بتایا جائے ۲۲۴

غزل کا سانچہ کیوں کہ بہت محدود ہوتا ہے اور اِس کے ایک شعر میں مفہوم ادا کرنا ہوتا ہے، اِس لیے رمز و کنایہ کو دخل نہ دیا جائے تو مفہوم ایک شعر میں پوری طرح واضح نہیں ہوتا۔

ندیم نے اپنی غزل میں علامتوں کے ساتھ ساتھ امیجری سے بھی کام لیا ہے۔ شاعری میں اِن کی بے حد اہمیت ہے اِس سے جہاں ابلاغ میں وسعت ملتی ہے وہاں شعر کے حسن اور نکھار میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اِس سے شاعر بہترین مصوری کرتا ہے جس سے شعر کے حسن کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اور اس میں گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ مصوری کے ذریعے شاعر اپنے ذہنی اور جذباتی تجربے کو خوب صورتی سے پیش کرتا ہے۔

بقول انیس ناگی:

"شاعر اپنے تجربات اور جذبات کو مماثل اشیا میں مشخص کر کے امیج کی تخلیق کرتا ہے۔" ۲۲۵

جو کام علامتیں غزل میں کرتی ہیں، وہی کام کم و بیش تمثیلیں کرتی ہیں اور غزل کی روایت میں اِن کو بہت نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اِس سے غزل کی محدود فضا میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہوتی ہے۔ شاعری میں اگر امیجری سے کام نہ لیا جائے تو شعر خوب صورت تو ہوگا لیکن تاثیر سے خالی ہوگا۔ امیجری کے خوب صورت استعمال سے ہی شاعر کی ذہانت اور جذبات و احساسات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اِس کے لیے جذبے کی گہرائی، احساس کی شدت اور تخیل کی بلند پروازی کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ ندیم اِن تقاضوں کو خوب صورتی سے پورا کرتے ہیں۔ ندیم کے اشعار میں تمثیلی الفاظ، تمثیلیں، منفرد اور حسین انداز میں پائی جاتی ہیں اور اِس سے اِن کے تجربات، مشاہدات، محسوسات اور طرزِ احساس کا ادراک ہوتا ہے۔

؎ ترا انتظار نہیں رہا، ترا اعتبار نہیں رہا
مرے اعتماد کی شاخ سے یہ طیور کس نے اُڑائے ہیں ۲۲۶

ندیم اپنے مخصوص انداز سے غزل کے بیان میں نئی پرت کا اضافہ کرتے ہیں۔ سائنس کے اثرات اور

نفسیاتی احساسات کو تمثال کاری کے ذریعے اُجاگر کرتے ہیں۔

بقول سلمیٰ ہما:

> ''جدید سائنسی علوم کے اثرات کے تحت شاعرانہ تمثال کاری میں نئے نئے تجربات ملتے ہیں۔ خدا کو ماورا سمجھنے کی بجائے آج کا انسان اِسے مادی طریق سے دیکھنے کا عادی ہے۔ قاسمی کے ہاں بھی یہ اندازِ نظر ملتا ہے:
>
> یہ پھول بھی تو اِس دھول سے اُگے ہیں ندیمؔ
> میرا خدا مری دنیا کا رہنے والا ہے ۲۲۷

غزل اور تغزل ایک دوسرے کے رگ و پے میں اِس طرح سرایت کر گئے ہیں کہ اِن کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ تغزل شعر کی لفظی اور معنوی خصوصیات کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ اِس سے شعر میں رعنائی پیدا ہوتی ہے۔ اِس سے پڑھنے والے پر وہی کیفیت طاری ہوتی ہے جو غزل گو پر طاری ہوتی ہے۔

بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

> ''غزل اور تغزل لازم و ملزوم ہیں۔ غزل جسم ہے اور تغزل اُس کی روح۔ اگر غزل میں تغزل نہ ہو تو اِس میں زندگی کے آثار کا پیدا ہونا مشکل ہے۔ اِسی لیے غزل کے ساتھ تغزل کا خیال آتا ہے اور تغزل کے ساتھ غزل کا۔'' ۲۲۸

غزل اور تغزل اگرچہ لازم و ملزوم ہیں لیکن غزل ایک صنفِ سخن ہے اور تغزل ایک اندازِ بیان ہے۔ غزل میں اگر نفاست، نکتہ سنجی، رمز و ایما اور بے ساختگی اور جذبے کا سوز ہو تو تغزل پایا جاتا ہے۔ ندیمؔ کی غزل میں بھی یہ عناصر پائے جاتے ہیں۔ تغزل کے لیے عشق و محبت کے موضوعات کو بنیادی لوازم قرار دیا جاتا ہے لیکن اِس کی اساس اور تعمیر زیادہ تر دُکھ کے عناصر سے ہوتی ہے۔ ندیمؔ نے مختلف طرز کے تغزل کو اپنے اشعار کے ذریعے بیان کیا ہے۔

رچی ہوئی ہے رفاقت مرے رگ و پے میں
کچھ اِس طرح کہ اکیلا چلوں تو گھبراؤں ۲۲۹

ندیمؔ کی غزل میں ٹھہراؤ، افکار کی شائستگی اور الفاظ و بیان کی جو خوب صورتی ہے، وہ اُنہیں آج بھی دیگر غزل گو شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ اِس لیے ندیم ایک علمی و ادبی وقار کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

حواشی

۱۔ آل احمد سرور، پروفیسر، ''غزل کا فن'' مشمولہ ''اُردو غزل'' (ہندو پاک غزل سیمینار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ)، مرتبہ کامل قریشی، ڈاکٹر، اردو اکادمی، دہلی، مارچ ۱۹۸۷ء، ص ۲۶

۲۔ شبلی نعمانی، ''شعرالعجم'' (حصہ پنجم)، لاہور، تاج بک ڈپو، ۱۳۲۵ھ، ص ۳۲

۳۔ نصیرالدین ہاشمی، ''اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ پر ایک تنقیدی نظر'' مشمولہ ''نقوش''، شمارہ ۳۱، ۳۲، مئی، جون ۱۹۵۳ء، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ص ۲۶

۴۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، ''اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ'' مشمولہ رسالہ ''نقوش''، سالگرہ نمبر، ۱۹۵۳ء، ادارۂ فروغ اردو، لاہور، ص ۵۳

۵۔ نیاز فتح پوری، ''اُردو غزل''، مشمولہ ''نگار''، شمارہ ا، جلد ۵۷، جنوری، فروری ۱۹۵۰ء، ص ۹۰

۶۔ احمد ندیم قاسمی، دیباچہ بہ عنوان ''تمہید''، ''جلال و جمال''، میاں چیمبرز، ۳۔ٹمپل روڈ، لاہور، جون ۲۰۰۰ء، ص ۲۳

۷۔ احمد ندیم قاسمی، ''ارض و سما''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۱۵۱

۸۔ احمد ندیم قاسمی، ''جلال و جمال''، ص ۳۴۱

۹۔ ایضاً، ص ۳۴۶

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۵۰

۱۱۔ پرویز بزمی، ''ندیم کی غزل'' مشمولہ ''اوراق'' ماہنامہ، لاہور، جلد ۲۷، شمارہ ۶ر۷، جون رجولائی ۱۹۹۲ء، ص ۱۳۵

۱۲۔ احمد ندیم قاسمی، ''جلال و جمال''، ص ۳۳۹

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۴۸

۱۴۔ جمیل ملک، ''ندیم کی شاعری''، نوید پبلی کیشنز، راول پنڈی، ۱۹۷۲ء، ص ۱۲۴

۱۵۔ احمد ندیم قاسمی، ''جلال و جمال''، ص ۳۴۹

۱۶۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۴۵۵

۱۷۔ احمد ندیم قاسمی، ''ارض و سما''، ص ۵۶

۱۸۔ مصاحبہ بہ عنوان ''احمد ندیم قاسمی سے ایک ملاقات''، از ناصر عباس زاہد، مشمولہ ''ضیابار''، علمی و ادبی مجلّہ، گورنمنٹ کالج سرگودھا، جلد ۸، شمارہ ۱، جون ۱۹۹۱ء، ص ۱۰۹

۱۹۔ احمد ندیم قاسمی، ''دشتِ وفا''، اساطیر، لاہور، مارچ ۲۰۰۰ء، ص ۲۲۲

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۵۹

۲۱۔ احمد ندیم قاسمی، ''پس الفاظ''، اساطیر، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۵۲

۲۲۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص ۶۲۰

۲۳۔ ایضاً، ص ۲۹۱

۲۴۔ مصاحبہ بہ عنوان ''احمد ندیم قاسمی سے ایک ملاقات''، از ناصر عباس زاہد، مشمولہ ''ضیابار''، ص ۱۰۹

۲۵۔ مجتبیٰ حسین، ''احمد ندیم قاسمی'' مشمولہ ''مٹی کا سمندر''، مرتبہ ضیا ساجد، مکتبہ القریش، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۶۲۹

۲۶۔ یوسف حسن، ''پاکستان میں اُردو غزل کے پچاس سال'' مشمولہ ''پاکستان میں اُردو کے پچاس سال''، مرتبہ نوازش علی، ڈاکٹر، گندھارا بکس، اصغر مال روڈ، راول پنڈی، ۲۰۰۵ء، ص ۶۲، ۶۱

۲۷۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص ۶۶۲

۲۸۔ احمد ندیم قاسمی، ''شعلۂ گل''، اساطیر، لاہور، مارچ ۲۰۰۰ء، ص ۲۲۳

۲۹۔ احمد ندیم قاسمی، ''دشتِ وفا''، ص ۴۵

۳۰۔ ایضاً، ص ۵۰

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۲۰

۳۲۔ ایضاً، ص ۶۳

۳۳۔ فیض احمد فیض، ''دستِ تہہ سنگ''، لاہور، مکتبہ کارواں، س۔ن، ص ۶۰

۳۴۔ احمد ندیم قاسمی، ''محیط''، نقوش پریس، لاہور، اکتوبر ۱۹۹۱ء، ص ۲۱۲

۳۵۔ احمد ندیم قاسمی، ''دشتِ وفا''، ص ۲۳۴

۳۶۔ احمد ندیم قاسمی، دیباچہ بہ عنوان ''تمہید''، ''جلال و جمال''، ص ۱۵

۳۷۔ سنبل نگار، ڈاکٹر، ''اُردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ''، مجلس ترقی ادب، لاہور، س۔ن، ص۱۱

۳۸۔ احمد ندیم قاسمی، ''دشتِ وفا''، ص۱۵۶

۳۹۔ ایضاً، ص۱۳۹

۴۰۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص۵۴۷

۴۱۔ فتح محمد ملک، ''تعصبات''، مکتبہ فنون، لاہور، طبع اوّل، جون۱۹۷۳ء، ص۵۳

۴۲۔ احمد ندیم قاسمی، ''دشتِ وفا''، ص۲۹

۴۳۔ ایضاً، ص۱۸۹

۴۴۔ احمد ندیم قاسمی، ''محیط''، ص۴۰

۴۵۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص۲۷۲

۴۶۔ احمد ندیم قاسمی، ''محیط''، ص۱۵۸

۴۷۔ ایضاً، ص۱۳۲

۴۸۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ''اُردو شاعری کا مزاج''، مجلس ترقی ادب، ۲۔کلب روڈ، لاہور، اشاعت اوّل، مئی ۲۰۰۸ء، ص۲۵۵

۴۹۔ احمد ندیم قاسمی، ''محیط''، ص۴۰

۵۰۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص۵۰۶

۵۱۔ ایضاً، ص۳۱۱

۵۲۔ ایضاً، ص۴۲

۵۳۔ تحسین فراقی، ڈاکٹر، ''افادات'' (شعری مطالعات)، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص۸۴

۵۴۔ احمد ندیم قاسمی، ''محیط''، ص۳۰۷

۵۵۔ احمد ندیم قاسمی، ''دشتِ وفا''، ص۱۳۲

۵۶۔ احمد ندیم قاسمی، ''محیط''، ص۱۳۲

۵۷۔ احمد ندیم قاسمی، ''دوام''، مکتبہ اساطیر، ۴۵۔اے مزنگ روڈ، لاہور، اکتوبر ۱۹۹۵ء، ص۳۲

۵۸۔ نصیر احمد ناصر، ڈاکٹر، ''فلسفہ حسن''، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص۴،۳

۵۹۔ احمد ندیم قاسمی، ''دشتِ وفا''، ص ۱۰۵

۶۰۔ ایضاً، ص ۲۴۰

۶۱۔ احمد ندیم قاسمی، ''محیط''، ص ۲۶۲

۶۲۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص ۶۸۹

۶۳۔ احمد ندیم قاسمی، ''جلال و جمال''، ص ۳۴۵

۶۴۔ احمد ندیم قاسمی، ''شعلۂ گل''، ص ۱۹۸

۶۵۔ احمد ندیم قاسمی، ''لوحِ خاک''، اساطیر، ملک چیمبرز، متصل سیشن کورٹس، لوئر مال، لاہور، اکتوبر ۱۹۹۱ء، ص ۱۸۵

۶۶۔ احمد ندیم قاسمی، ''جلال و جمال''، ص ۳۴۱

۶۷۔ احمد ندیم قاسمی، ''محیط''، ص ۱۶۷

۶۸۔ احمد ندیم قاسمی، ''جلال و جمال''، ص ۳۳۸

۶۹۔ احمد ندیم قاسمی، ''محیط''، ص ۳۷۵

۷۰۔ عذرا اصغر، ''ندیم صاحب'' مشمولہ ''مخزن ۸'' مرتب مقصود الٰہی شیخ، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۳۵

۷۱۔ محمد حسن، ڈاکٹر، ''اردو ادب میں رومانوی تحریک''، کاروانِ ادب، ملتان، ۱۹۹۳ء، ص ۱۵

۷۲۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، ''احمد ندیم قاسمی، شخصیت اور فن (چند تنقیدی تاثرات)'' مشمولہ ''نقوش''، ادارۂ فروغِ اُردو، لاہور، شمارہ ۳۹۔۴۰، مارچ ۱۹۵۴ء، ص ۱۹۴

۷۳۔ احمد ندیم قاسمی، ''جلال و جمال''، ص ۳۵۳

۷۴۔ احمد ندیم قاسمی، ''لوحِ خاک''، ص ۹۸

۷۵۔ احمد ندیم قاسمی، ''محیط''، ص ۲۰۵

۷۶۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص ۳۹۰

۷۷۔ ابو سعید نور الدین، ڈاکٹر، ''تاریخ ادبیاتِ اُردو''، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۳۶۹

۷۸۔ احمد ندیم قاسمی، ''چند یادیں'' مشمولہ ''افکار''، ماہنامہ، کراچی، ندیم نمبر، شمارہ ۵۹/۵۸، جنوری، فروری ۱۹۷۵ء، ص ۹۴

۷۹۔ سجاد ظہیر، ''ترقی پسند ادب کی تحریک کا منشور''، لکھنو، اپریل ۱۹۳۶ء، ص ۵۸

شاعری میں تشبیہ، استعارہ اور کنایہ کی موجودگی نہ صرف قاری کے قلب و ذہن کو لطیف اثر سے ہم کنار کرتی ہے بلکہ معنی کی مختلف جہتوں سے بھی آشنا کرتی ہے اور شعر میں معنی کی جو تہہ در تہہ دنیائیں آباد ہوتی ہیں۔ اُن کا اہم سبب بھی تشبیہات، استعارات اور کنایات ہیں۔ سید عابد علی عابد تشبیہ کے متعلق لکھتے ہیں:

''تشبیہ وہ فن ہے جس کے ذریعے فن کار، انشاپرداز یا خطیب مختلف چیزوں میں مشابہتیں دریافت کرتا ہے۔ گویا ایک چیز کو دوسری چیز کے مشابہ کر دیتا ہے۔'' ۲۱۱

ندیم نے جس خوب صورتی سے اِن تکنیکی عناصر کو استعمال کیا ہے۔ اِس سے غزل کی دھج میں اضافہ ہوا ہے۔ لفظوں اور ترکیبوں کے انتخاب میں جو حسن جھلکتا ہے، وہی اِن کے استعمال میں بھی ہے۔ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد رقم طراز ہیں:

''ندیم نے بیان اور بدیع کی صنعتوں کو معنی کی وسعتوں اور تاثیر کی گہرائیوں کے لیے جابجا استعمال کیا ہے لیکن کہیں بھی اِن صنعتوں کے استعمال میں تکلف کی وہ فضا پیدا نہیں ہوئی جو ذہن کو معنی سے ہٹا کر صنعتوں کے خارجی اور ظاہری حسن کی طرف متوجہ کرے۔ تشبیہات اور استعارات کی ندرت غزل کو نئے موسموں اور منظروں سے متعارف کراتی دکھائی دیتی ہے۔ ندیم کے ہاں تشبیہ کا استعمال، پیکر تراشی اور تمثیل سازی کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔'' ۲۱۲

؎ تو نے یوں شرم کر دیکھا
جیسے تھک کر دیا بجھا ہو ۲۱۳

ندیم نے اپنے اشعار میں تشبیہ و استعارہ کو خوبی سے برتا ہے۔ اِن کے ہاں نادر اور انوکھی تشبیہات کا استعمال ہوا ہے۔ تشبیہ اِن کے بیانِ حسن میں اضافہ کرتی ہے اور اِن کی قوتِ مشاہدہ اور قوتِ متخیلہ اِس کو مزید نکھارتی ہے، جس سے شعر کی نزاکت و لطافت اور زیادہ گہری اور معنویت سے بھرپور ہو جاتی ہے۔

؎ انداز ہوبہو تری آواز پا کا تھا
دیکھا نکل کے گھر سے تو جھونکا ہوا کا تھا ۲۱۴

ندیم کی غزل میں تشبیہ کا عمل اندر سے باہر کی طرف پرواز کرنے کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ اِس طرح اِن کا مخصوص استعاراتی انداز غزل کے ہر شعر کے 'جز' کو 'کل' سے ہم کنار کر رہا ہے۔ ندیم کے شعور کی بلند پروازی

۸۰۔ انور صابر، ڈاکٹر، ''پاکستان میں اُردو غزل کا ارتقا''، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۳۰۰

۸۱۔ Mahmud-ul-Zafar, "In Defence of Angare", The Leader, Allahabad, 5 April, 1933.

۸۲۔ Coppola, Carlo, "The Angare Group : The Enfants Terribles of Urdu Literature", The Annual of Urdu Studies # 1, 1981, P : 63.

۸۳۔ Ahmed Ali, "The Progressive Writer's Movement and Creative Writer's in Urdu", In Marxist Influences and South Asian Literature. C.D. by Carlo Coppole, Delhi : Chansriya Publication, 1988, P : 43 - 44.

۸۴۔ محمد کامران، ڈاکٹر، ''انگارے''(تحقیق وتنقید)، ماورا، بار اوّل ۲۰۰۵ء، ص ۱۳

۸۵۔ شبانہ محمود، مرتبہ ''انگارے ایک جائزہ''، کتابیات، ۱۹۸۸ء، ص ۱۷

۸۶۔ اختر حسین رائے پوری، ''ادب اور زندگی''، مطبوعہ ''اُردو''، اپریل ۱۹۳۵ء، ص ۲۵

۸۷۔ سجاد ظہیر، ''ادبی روایات اور ترقی پسند ادب''، ماہنامہ ''ادب لطیف''، اکتوبر ۱۹۵۵ء، ص ۱۳۶

۸۸۔ شہزاد منظر، ''ترقی پسند افسانے کی روایت اور نیا اضافہ'' مشمولہ ''ترقی پسند ادب''، مرتبہ قمر رئیس، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۳۵۳

۸۹۔ احمد ندیم قاسمی، ''ایک جائزہ'' مشمولہ ''افکار'' آزادی نمبر، شمارہ ۱۴، کراچی، ۱۹۵۲ء، ص ۲۱

۹۰۔ ضیاء الحسن، ڈاکٹر، ''غزل اور غزل کی تنقید'' مشمولہ ''مخزن ۱۳''، شمارہ ۱، جلد ۷، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۳۷

۹۱۔ سجاد ظہیر، ''مضامینِ سجادؔ''، اتر پردیش، اُردو اکیڈمی، لکھنو، ۱۹۷۹ء، ص ۱۶

۹۲۔ سردار جعفری، ''ترقی پسند ادب''(جلد اوّل)، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۱ء، ص ۲۳۴

۹۳۔ نظیر صدیقی، ''جدید غزل ہندوستان اور پاکستان میں'' مشمولہ ''فنون''، جدید غزل نمبر، ص ۱۶۷

۹۴۔ ثمینہ ندیم، ''ندیمؔ کی غزلیں۔۔۔فکر وفن کی آمیزش'' مشمولہ ''راوی''، لاہور، جی۔سی یونیورسٹی، ۲۰۰۷ء، ص ۱۱۱

۹۵۔ ساقی فاروقی، ''ندیمؔ کی غزل پر ایک مختصر نوٹ'' مشمولہ ''معاصر''، جولائی ۲۰۰۰ء، ادارہ معاصر، لاہور، ص ۲۴۵

۹۶۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیمؔ کی غزلیں''، ص ۱۹۷

۹۷۔ احمد ندیم قاسمی، ''محیط''، ص ۲۹۰

۹۸۔ Cathlane Rayn, "What is man", IPSWICH, GOLGONOOZA Press, 1979, P : 378.

۹۹۔ عابد رضا بیدار، ''جدید اُردو غزل ۔۔۔۱۹۴۰ء سے ۱۹۸۵ء تک''، مطبوعہ کتاب نما (دہلی)، بابت اپریل ۱۹۸۷ء، ص ۶۷

۱۰۰۔ احمد ندیم قاسمی، ''دوام''، ص ۵۳

۱۰۱۔ احمد ندیم قاسمی، ''محیط''، ص ۳۰۷

۱۰۲۔ ممتاز حسین، ''ادب اور روحِ عصر''، شہرزاد کراچی، اگست ۲۰۰۳ء، ص ۱۳۳

۱۰۳۔ احمد ندیم قاسمی، ''دشتِ وفا''، ص ۱۳۰

۱۰۴۔ احمد ندیم قاسمی، ''بسیط''، اساطیر، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۵۳

۱۰۵۔ احمد ندیم قاسمی، ''محیط''، ص ۲۹۰

۱۰۶۔ احمد ندیم قاسمی، ''لوحِ خاک''، ص ۱۷۴

۱۰۷۔ کریم الدین احمد، ڈاکٹر، ''ترقی پسند تحریک، ایک جائزہ'' مشمولہ ''سیپ'' (سہ ماہی) شمارہ ۳۴، بلاک ڈی، شیر شاہ کالونی، کراچی، ص ۲۲۳

۱۰۸۔ احمد ندیم قاسمی، ''دشتِ وفا''، ص ۱۳۲

۱۰۹۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص ۳۳۷

۱۱۰۔ فراق گورکھ پوری، ''حاشیے''، سنگم پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد، س۔ن، ص ۹۲

۱۱۱۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص ۳۳۸

۱۱۲۔ احمد ندیم قاسمی، ''لوحِ خاک''، ص ۱۸۵

۱۱۳۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص ۳۹۴

۱۱۴۔ احمد ندیم قاسمی، ''شعلۂ گل''، ص ۲۲۷

۱۱۵۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص ۲۷۱

۱۱۶۔ احمد ندیم قاسمی، ''محیط''، ص ۴۱

۱۱۷۔ جوش ملیح آبادی، ''احمد ندیم۔ حقیقی شاعر'' مشمولہ ''مٹی کا سمندر''، مرتبہ ضیا ساجد، مکتبہ القریش، لاہور، بار اوّل ۱۹۹۱ء، ص ۵۴۹

۱۱۸۔ محمد علی صدیقی، ''توازن''، ادارۂ عصرِ نو، کراچی، اکتوبر ۱۹۷۶ء، ص ۲۲۴

۱۱۹۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص ۱۳۲

۱۲۰۔ ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا، ''تفہیم القرآن''، جلد۴، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۱۳۷

۱۲۱۔ احمد ندیم قاسمی، ''محیط''، ص ۳۵۵

۱۲۲۔ احمد ندیم قاسمی، ''ماضی قریب اور لمحہ رواں کی غزل'' مشمولہ ''نقوش''، جون ۱۹۸۵ء، ص ۲۶

۱۲۳۔ احمد ندیم قاسمی، ''جلال و جمال''، ص ۳۴۰

۱۲۴۔ طارق محمود، ''جدید اُردو نظم میں تصورِ انسان''، مقالہ برائے ایم۔اے (اُردو)، مملوکہ اورینٹل کالج لائبریری، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۹۴۔۱۹۹۲ء، ص ۹

125-Karl Marx, F. Engels: "Collected Works", (Vol 20), Masco, State Political Literature Publishing House, 1956, P : 357.

126-Pt. Raju, Radha Krishnan (Ed): "The Concept of Man", London, Ruskin House, 1966, IInd Edition, P : 475.

۱۲۷۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص ۱۲۷

۱۲۸۔ احمد ندیم قاسمی، ''دشتِ وفا''، ص ۱۰۷

۱۲۹۔ ایضاً، ص ۱۸۴

۱۳۰۔ احمد ندیم قاسمی، ''محیط''، ص ۸۶

۱۳۱۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص ۲۷

۱۳۲۔ ناہید قاسمی، ڈاکٹر، ''ندیم کی غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۲۰۷

۱۳۳۔ احمد ندیم قاسمی، ''میرے ہم سفر''، اساطیر، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۷۹

۱۳۴۔ احمد ندیم قاسمی، ''دوام''، ص ۹۴

۱۳۵۔ عاشق حسین بٹالوی، ''ہماری قومی جدوجہد''، آئینہ ادب، لاہور، س۔ن، ص ۱۲۹۔۱۲۸

۱۳۶۔ ماہنامہ ''سنگِ میل''، پشاور، شمارہ ۲، ص ۷۵

۱۳۷۔ احمد ندیم قاسمی، ''طلوع'' مشمولہ ''نقوش''، لاہور، شمارہ ۳، ص ۶،۷

۱۳۸۔ احمد ندیم قاسمی، ''زنداں سلاسل'' مشمولہ ''نقوش''، لاہور، شمارہ ۲۸۔۲۷، ص ۱۸۶

۱۳۹۔ احمد ندیم قاسمی، ''محیط''، ص ۸۵

۱۴۰۔ ایضاً، ص ۸۶

۱۴۱۔ احمد ندیم قاسمی، ''لوحِ خاک''، ص ۱۷۴

۱۴۲۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص ۳۶۲

۱۴۳۔ احمد ہمدانی، ''جدید غزل غالبؔ سے آج تک'' مشمولہ ''فنون'' جدید غزل نمبر، ص ۲۷۸

۱۴۴۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص ۳۶۰

۱۴۵۔ ایضاً، ص ۳۴۳

۱۴۶۔ ایضاً، ص ۱۹۵

۱۴۷۔ احمد ندیم قاسمی، ''لوحِ خاک''، ص ۱۸۶

۱۴۸۔ احمد ندیم قاسمی، ''دوام''، ص ۱۹

۱۴۹۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص ۴۱۹

۱۵۰۔ ایضاً، ص ۲۹۵

۱۵۱۔ ایضاً، ص ۴۳۷

۱۵۲۔ ایضاً، ص ۳۱۰

153-Aristotle, "Political thought from plato to the present", McGraw-Hill Book company, New York, San Francisco, Toranto, London, P: 58.

۱۵۴۔ احمد ندیم قاسمی، ''محیط''، ص ۲۹۰

۱۵۵۔ ایضاً، ص ۲۸۶

۱۵۶۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص ۵۶۸

۱۵۷۔ ایضاً، ص ۷۵۴

۱۵۸۔ ایضاً، ص ۳۶۷

۱۵۹۔ ایضاً، ص ۳۹۰

۱۶۰۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص۳۷۱

۱۶۱۔ احمد ندیم قاسمی، ''محیط''، ص۱۵۹

۱۶۲۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص۱۷۹

۱۶۳۔ علی ناصر زیدی، ''ہماری کائنات''، ہمدرد بیت الحکمت، کراچی، ۱۹۹۳ء، ص۸۳

۱۶۴۔ مسرت حسن، ڈاکٹر، ''قدیم انسان''، پولیمر پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص۷۶

۱۶۵۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص۵۱

۱۶۶۔ احمد ندیم قاسمی، ''لوحِ خاک''، ص۱۲۷

۱۶۷۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص۳۴۲

۱۶۸۔ ایضاً، ص۷۵

۱۶۹۔ احمد ندیم قاسمی، ''محیط''، ص۳۲

۱۷۰۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص۵۴۹

۱۷۱۔ قیصر نجفی، پروفیسر، ''ایک بڑا انسان۔۔۔ایک بڑا تخلیق کار'' مشمولہ ''موجات''، سہ ماہی، شمارہ ۱، جنوری تا اپریل ۲۰۰۷ء، شمارہ ۲، مئی تا اگست ۲۰۰۷ء، ص۲۷۱

۱۷۲۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص۶۴۸

۱۷۳۔ احمد ندیم قاسمی، ''بسیط''، ص۱۵۳

۱۷۴۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص۴۳۵

۱۷۵۔ منصورہ احمد، ''میرے بابا'' مشمولہ ''عبارت'' سہ ماہی، ندیم ایڈیشن، حیدر آباد، خصوصی شمارہ ۶۔۵، اکتوبر ۱۹۹۶ء تا مارچ ۱۹۹۷ء، ص۱۰۲

۱۷۶۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص۵۹۰

۱۷۷۔ ایضاً، ص۳۱

۱۷۸۔ ایضاً، ص۲۳

۱۷۹۔ ایضاً، ص۲۰۹

۱۸۰۔ الطاف حسین حالی، ''مقدمہ شعر و شاعری''، شیخ مبارک علی تاجران کتب، لاہور، ۱۹۲۹ء، ص ۱۷۴

۱۸۱۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص ۸۵

۱۸۲۔ ایضاً، ص ۲۹۸

۱۸۳۔ مجتبیٰ حسین، ''نیم رُخ''، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۱۹۷

۱۸۴۔ احمد ندیم قاسمی، ''بسیط''، ص ۱۵۷

۱۸۵۔ فتح محمد ملک، ''احمد ندیم قاسمی، شاعر اور افسانہ نگار''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۲۴۵

۱۸۶۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص ۵۳۶

۱۸۷۔ ایضاً، ص ۴۶۷

۱۸۸۔ قرۃ العین طاہرہ، ''عرضِ مرتبین''، ''انوارِ جمال''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۱۴

۱۸۹۔ نجیب جمال، ڈاکٹر، ''محاسن'' (تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ)، بیکن بکس، گلگشت، ملتان، بار اوّل، ۱۹۹۴ء، ص ۱۳

۱۹۰۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص ۵۸

۱۹۱۔ احمد ندیم قاسمی، ''دشتِ وفا''، ص ۱۸۰

۱۹۲۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص ۲۷۸

۱۹۳۔ عبدالمجید سالک، ''تعارف شعلۂ گل''، اساطیر، لاہور، مارچ ۲۰۰۰ء، ص ۱۴

۱۹۴۔ عبدالرحمٰن ہاشمی، قاضی، ''شعریاتِ اقبال''، سفینہ ادب، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۴۲۔۴۱

۱۹۵۔ احمد ندیم قاسمی، ''محیط''، ص ۲۰

۱۹۶۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، ''غزل اور مطالعہ غزل''، انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی، س۔ن، ص ۱۸۶۔۱۸۵

۱۹۷۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص ۲۷۷

۱۹۸۔ احمد ندیم قاسمی، ''جلال و جمال''، ص ۳۴۱

۱۹۹۔ احمد ندیم قاسمی، ''بسیط''، ص ۲۰

۲۰۰۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص ۲۷۵

۲۰۱۔ ایضاً، ص ۲۲۴

۲۰۲۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص۱۲۷

۲۰۳۔ مزمل حسین، ''اردو میں علم بیان اور علم بدیع کے مباحث: تحقیقی وتنقیدی جائزہ''، مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اُردو)، مملوکہ اورینٹل کالج لائبریری، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص۱۹۴

۲۰۴۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص۲۶۵

۲۰۵۔ عابد علی عابد، سید، ''البدیع''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص۱۷۴۔۱۷۳

۲۰۶۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص۱۱۹

۲۰۷۔ ایضاً، ص۱۷۱

۲۰۸۔ ایضاً، ص۳۸۰

۲۰۹۔ ایضاً، ص۲۱۹

۲۱۰۔ ایضاً، ص۳۴۸

۲۱۱۔ عابد علی عابد، سید، ''البیان''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص۸۸

۲۱۲۔ ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر، ''اُردو غزل کا تکنیکی، ہیئتی اور عروضی سفر''، مجلس ترقی ادب، ۲۰۔کلب روڈ، لاہور، اشاعتِ اوّل، اگست ۲۰۰۸ء، ص۲۰۶

۲۱۳۔ احمد ندیم قاسمی، ''شعلۂ گل''، ص۲۰۱

۲۱۴۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص۴۵۲

۲۱۵۔ احمد ندیم قاسمی، ''محیط''، ص۳۱

۲۱۶۔ وقار عظیم، سید (مدیر خصوصی)، ''تاریخ ادبیات، مسلمانانِ پاک و ہند (جلد ششم و جلد ہفتم)''، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص۵۹۱

۲۱۷۔ ممتاز حسین، ''ادب اور شعور''، کراچی، اردو اکیڈمی، سندھ، ۱۹۶۱ء، ص۱۴۷

۲۱۸۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، ''کشاف تنقیدی اصطلاحات''، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء، ص۱۳۴

۲۱۹۔ عبداللہ، ڈاکٹر سید، ''ولی سے اقبال تک''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص۲۹۲

۲۲۰۔ احمد دہلوی، سید، ''فرہنگ آصفیہ''، لاہور، مکتبہ حسن لمیٹڈ، س۔ن، ص۳۶

۲۲۱۔ فیض احمد فیض، ''میزان''، لاہور، ناشرین، ۱۹۶۲ء، ص ۴۳

۲۲۲۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص ۱۰۷

۲۲۳۔ ایضاً، ص ۶۳۸

۲۲۴۔ ایضاً، ص ۴۷۶

۲۲۵۔ انیس ناگی، ''تنقید شعر''، لاہور، میری لائبریری، ۱۹۶۸ء، ص ۱۱۱

۲۲۶۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص ۱۷۰

۲۲۷۔ سلمیٰ ہما، ''جدید اردو غزل میں امیجری''، مقالہ برائے ایم۔اے (اُردو)، مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۶۳

۲۲۸۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، ''غزل اور تغزل'' مشمولہ ''نقوش''، ۱۹۵۲ء، نومبر، دسمبر، شمارہ ۲۸، ۲۷، ص ۵۷

۲۲۹۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی غزلیں''، ص ۶۷۶

✿✿✿✿✿

باب چہارم

نظم گوئی

نظم ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس میں شاعر خیالات کو تسلسل و ترتیب کے ساتھ بیان کرتا ہے اور یہ خیالات مکمل محسوس ہوتے ہیں۔ شاعر اپنے کسی خیال کو پیش کرنے کے لیے نظم کی کسی بھی ہیئت کو استعمال کرتا ہے اور اِس کے لیے ترکیب بند، ترجیع بند، مسدس، مخمس، مثلث یا مثنوی کا انداز اختیار کر جاتا ہے۔

عبدالکریم خالد نظم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اشعار کا ایسا مجموعہ ہے جو اپنے مرکزی موضوع اور ارتقائے خیال کے سبب تسلسل کا احساس پیدا کرے۔'' ۱

ڈاکٹر وزیر آغا نظم کے متعلق رقم طراز ہیں:

''نظم فرد کی شخصیت کا اظہار ہے اور جبلت کی تندی اور لاشعور کی گہرائی سے براہِ راست متعلق ہے۔'' ۲

اُردو شاعری کے آغاز ہی سے اُردو نظم اپنی مختلف صورتوں میں موجود تھی۔ قلی قطب شاہ سے لے کر نظیر اکبر آبادی تک اِس کا اطلاق غزل کے سوا، ہر صنفِ سخن پر کیا جاتا رہا۔ نظیر اکبر آبادی کے بعد ایک طویل عرصے تک اُردو نظم کا میدان خالی رہا لیکن انیسویں صدی کے آخر میں نظم کو اہمیت دی جانے لگی۔ محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب کے ذریعے موضوعی نظمیں پیش کرنے کے لیے مشاعروں کی بنیاد رکھی لیکن یہ مشاعرے ایک سال کے بعد بند ہو گئے۔

انجمن پنجاب کے ابتدائی مشاعروں میں حالی بھی شریک ہوئے اور ان مشاعروں کے ذریعے نظم نگاری کے جس نئے رجحان کی بنیاد ڈالی گئی۔ اُس نے بیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ جن نظم گو شعرا نے اُردو شاعری میں نئے رجحانات کو فروغ دیا، اُن میں اکبر الہ آبادی، اسمٰعیل میرٹھی، نادر کاکوروی، نظم طباطبائی، عظمت اللہ خان، ظفر علی خان، جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی اور حفیظ جالندھری شامل ہیں۔

آزاد اور حالی نے مظاہر فطرت اور مناظرِ قدرت کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔ کچھ شعرا نے انگریزی نظموں کے تراجم کیے اور ہیئت کے تجربات بھی کیے۔

سرسید تحریک نے اُردو شاعری کو نیا زاویہ بخشا تھا لیکن اس کے خلاف ردِعمل بھی ظاہر ہوا۔ جس کا اہم

ردِعمل رومانیت کی صورت میں سامنے آیا۔ اقبال کی شاعری میں رومانیت کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ رومانی شعرا میں حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، ساغر نظامی اور عظمت اللہ خان شامل ہیں۔

اُردو نظم بیسویں صدی کے چوتھے عشرے میں ایک نئے دور میں داخل ہوتی ہے۔ اِس دور میں شعرا کی تخلیقی کاوشیں، اجتماعی جدوجہد کی صورت اختیار کر لیتی ہیں جس کا سبب ترقی پسند تحریک تھی، جس نے باضابطہ منشور تیار کر کے شاعروں اور ادیبوں کی ایک خاص سمت میں راہنمائی کی۔

اس تحریک کے ذریعے بھوک، پیاس، غلامی اور سماجی پستی جیسے بنیادی مسائل کو موضوع بنایا گیا۔ اِس عہد میں جس طرح جاگیردار، کسانوں اور کاشت کاروں کا استحصال کرتے تھے۔ سرمایہ دار اِن کی محنت کو نچوڑتے تھے، جس سے معاشرے میں گھٹن پیدا ہوتی تھی۔ ترقی پسند شعرا نے اپنی نظموں کے ذریعے اِس کے خلاف آواز بلند کی۔

دوسری جنگِ عظیم سے جو تباہی ہوئی اور اس نے عوام کی زندگی کو تہ و بالا کر دیا۔ اِس صورتِ حال کے خلاف شعرا نے اپنی شاعری کے ذریعے انقلاب کے نعرے لگائے۔ اِن شعرا میں جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، اسرار الحق مجاز، مخدوم محی الدین، احمد ندیم قاسمی، اختر الایمان، ساحر لدھیانوی اور عارف عبدالمتین شامل ہیں۔

ندیم نے نظم گوئی کا آغاز ۱۹۳۱ء میں میٹرک سے فارغ ہونے کے بعد کیا۔ اُنھوں نے اپنی پہلی نظم ایک خاندانی حادثہ سے متاثر ہو کر لکھی اور چچا جان کی خدمت میں پیش کیں۔ اُنھوں نے ان کی موزونی طبیعت کی داد دی اور ندیم کو نصیحت کی کہ قومی مسائل پر نظمیں کہنے کی کوشش کریں۔ ندیم نے دوسری نظم مولانا محمد علی جوہر (مرحوم) کے انتقال پر مرثیہ کی شکل میں کہی جو کہ روزنامہ ''سیاست'' کے سنڈے ایڈیشن میں صفحہ اوّل پر شائع ہوئی۔ مسمط، ترکیب بند، ترجیع بند، مستزاد، پابند نظم، آزاد نظم اور معریٰ نظم کی ہیئت میں نظمیں لکھیں۔

ندیم کی نظموں کا پہلا مجموعہ ''جلال و جمال'' ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا۔ ندیم نے جو نظمیں لکھیں ان میں ''جلال و جمال'' کی ایک سو انسٹھ (۱۵۹) نظمیں، ''شعلۂ گل'' کی اٹھاون (۵۸) نظمیں، ''دشتِ وفا'' کی تریسٹھ (۶۳)، ''محیط'' کی ایک سو سات (۱۰۷)، ''دوام'' کی سڑسٹھ (۶۷)، ''لوحِ خاک'' کی ساٹھ (۶۰)، ''بسیط'' کی چھتیس (۳۶)

نظمیں، ''ارض و سما'' میں بتیس (۳۲) اور ''انوارِ جمال'' کی اٹھارہ (۱۸) نظمیں شامل ہیں۔

ندیم جب بھی کوئی نظم مکمل کرتے، اُس کے آخر میں اپنا نام اور تاریخ ضرور درج کرتے تھے، لیکن اُن کی درج ذیل نظم جس پر اُن کے دستخط اور تاریخ تخلیق تحریر نہیں ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کی یہ نظم ابھی نامکمل تھی اور یہ ندیم کی آخری نظم ہے:

میں کسے بتاؤں کہ یہ جو ایک درخت کی کسی شاخ پر
کوئی اک پرند ہے نغمہ زن
تو یہ کون ہے
یہ صدا زمیں کی صدا نہیں
کہ یہ وہ صدا ہے جو کائنات کی ابتدا میں
کسی خلا سے دَر آئی تھی
یہی وہ صدا ہے جو ''کُن'' بنی
تو خلا میں کرّے بکھر گئے
یہی وہ صدا ہے کہ جس کی گونج
دِلوں میں نُور بسا گئی ۳

ندیم کی ابتدائی بلکہ ۱۹۴۲ء تک کی نظموں ''بارگاہ نیاز''، ''گناہ بے گناہی''، ''مردِ خود شناس''، ''مردِ آزاد''، ''عرفان''، ''وقت کا چکر''، ''ایک فلسفی دوست سے'' میں اقبالؔ، جوشؔ اور مولانا ظفر علی خان اور اختر شیرانی کے اثرات نظر آتے ہیں لیکن ندیم اپنی منزل کو بھی تلاش کرتے رہتے ہیں۔

اختر شیرانی نے ندیم کی ادبی شخصیت پر ایسے نقوش چھوڑے ہیں جو اِن کے ادب میں آخر تک جھلکتے ہیں۔ اختر ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اُردو شاعری میں عورت کا زمینی تصور پیش کیا ہے۔ جس کے بعد شعرا نے ان سے متاثر ہو کر اِس عورت کے زمینی خدوخال کو مزید اُجاگر کیا، ان میں سے ایک ندیم ہیں جنھوں نے اختر کی سلمیٰ، ریحانہ اور عذرا وغیرہ سے متاثر ہو کر صبوحی نام کا ایک کردار تخلیق کیا، جس کے ہمراہ ندیم نے پھولوں، خوشبوؤں اور خوابوں کی خیالی دنیا آباد کرنے کی کوشش کی۔ ان کے اثر کا سلسلہ ''یادِ رفتہ''، ''اُمید''، ''دعوت''، ''ایک تصور''، ''محبوب''،

''مجھے اِک گیت سنا'' جیسی نظموں سے شروع ہو کر ''سراب''، ''ترکِ محبت کے بعد''، ''لمحاتِ گریزاں'' اور ''سامنا'' تک چلتا رہتا ہے اور یہ صرف ''جلال و جمال'' تک موقوف نہیں بلکہ اِن کی زندگی کے آخر تک رومانیت کی جو لہر نظر آتی ہے، وہ بڑی حد تک اختر شیرانی کی رہینِ منت ہے۔ ندیمؔ خود کہتے ہیں:

> ''جس وقت میں نے شعر کہنا شروع کیا تو بیک وقت اقبال، جوش، ظفر علی خان اور اختر شیرانی سے متاثر تھا۔۔۔ بعد میں میری پسند میں غالبؔ اور میرؔ بھی شامل ہو گئے مگر اختر کا طلسم بھی قائم رہا۔۔۔ بلکہ بعض تحفظات سے قطع نظر اب تک قائم ہے۔'' ۴

ندیمؔ کی بعض نظموں کو پڑھنے سے ایسا لگتا ہے کہ جیسے اختر کی شاعری ہو۔ جیسے نظم ''دعوت'' میں کہتے ہیں:

آؤ ہم تم لہلہاتے سبزہ زاروں میں رہیں
اِن اُفق تک کانپنے والی بہاروں میں رہیں
زندگی کی پستیوں سے بے خبر ہو جائیں ہم
نیلے نیلے اونچے اونچے کوہساروں میں رہیں ۵

آخر تک آتے آتے یہ رجحان ایک الگ اسلوب میں ڈھلتا جاتا ہے، ایسا اسلوب جہاں وہ اختر شیرانی کی مانند جمال کے سامنے متحیر نہیں ہو جاتے بلکہ تخلیقِ حسن کی بھی کوشش کرتے ہیں اور محبوب کے ساتھ لپٹنے کی آرزو کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ ''دوام'' اور ''لوحِ خاک'' تک پہنچتے پہنچتے وہ ''حسن بے حساب'' اور ''بلیغ آنکھیں'' جیسی نظموں میں تخلیقِ حسن کے ساتھ ساتھ ''ماضی و حال'' اور ''یاد'' جیسی نظموں میں محبوبہ کے خیالی تصور سے دل بہلانے کے علاوہ کچھ نظموں میں اس کو چھونے جیسی توقعات کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ نظم ''دائرے'' میں لکھتے ہیں:

تیرے جانے سے میری ذات کے اندر
جو خلا گونجتا ہے
اک نہ اک دن اسے بھر جانا ہے
اک نہ اک روز تجھے
میری پھیلی ہوئی، ترسی ہوئی باہوں میں
پلٹ آنا ہے! ۶

ندیم کے تصورِ عورت پر بھی اختر شیرانی کا واضح اثر ہے۔ اختر کے ہاں پہلی مرتبہ عورت حرم سراؤں اور بالا خانوں کی سجاوٹ کا سامان بننے کی بجائے اپنے چاہنے والے کے پاس آتی ہے اور اِس کا دُکھ درد اپنی آنکھوں سے دیکھتی اور اِس کی داستان عشق خود سنتی ہے۔ ندیم کے ہاں بھی عورت نظر تو آتی ہے لیکن ندیم چوں کہ دیہاتی فضا کے پروردہ ہیں اِس لیے ان کی محبوبہ ''صبوحی'' کسی کالج کی لڑکی یا اونچے طبقے کی ماڈرن گرل کی بجائے پنجاب کے دیہاتی ماحول کی پیداوار ہے۔ اِس کا وجود اپنی سادگی، معصومیت اور فطری حسن کی بنا پر پنجاب کی دیہاتی فضا سے مشابہہ نظر آتا ہے۔ یہ صبوحی اِسی دھرتی سے نکلتی ہے اور اِسی ہزار رنگ دھرتی کی مانند ہر سمے بدلتے رنگ میں اپنی چھب دکھلاتی ہے۔ یوں اختر کے رومانوی تصورات کا تسلسل برقرار رکھنے کے باوجود ندیم معاشرتی مسائل کے لیے بھی جگہ بناتے نظر آتے ہیں۔

ندیم کی نظموں پر اقبال کا پرتو بھی نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ اقبال سے ندیم کی ادبی شناسائی اِن کی ادبی زندگی کے آغاز میں ہی ہو چکی تھی۔ ندیم اپنے عہد کے اِس شاعر کے بارے میں ایک خط میں لکھتے ہیں:

''آخر میری اُمیدوں کا کارواں اقبال پر آ کر رُکا، یقین فرمایئے کہ ''بالِ جبریل'' کی ہر نظم، ہر غزل، ہر قطعہ کی بحر، ردیف اور قافیہ میں ایک ایک چیز کہی جسے اب نذرِ آتش کر دیا ہے۔'' ۷

ندیم کی نظموں میں اقبال کا واضح اثر دکھائی دیتا ہے اور بعض اوقات تو اسلوب پر بھی اقبال کی واضح چھاپ نظر آتی ہے۔ نظم ''احساسِ غلامی'' میں بھی اقبال کا واضح پرتو ہے:

اب مائلِ زوال ہے ہر فن دلپسندیر
الفاظ کی تراش، کمالِ سخن وری
کرتی ہے زر کو خاک جواہر کو خشت و سنگ
مٹی کو زر بناتی تھی جو کیمیا گری
دریوزہ گر جہاں کا، ثنا خواں فرنگ کا
یہ میری شاعری ہے، وہ میری قلندری ۸

''جلال و جمال'' میں شامل نظم ''معمارِ عالم''، ندیم نے اقبال کی نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' کے تتبع میں لکھی ہے۔ ان کے ہاں اقبال کا اثر عظمتِ انسان میں بھی نظر آتا ہے۔ ندیم کے نزدیک انسان بحیثیت انسان ہی عظیم ہے لیکن اقبال انسان کی داخلی اصلاح کے بعد اُسے خارج کی طرف لے کر جاتے ہیں لیکن ندیم نے بہت سے پہلوؤں سے اقبال کی فکر سے اپنے چراغ روشن کیے۔ اُنھوں نے نہ صرف اِن کا اثر قبول کیا بلکہ شاعری میں اِن کی روایت کو پروان بھی چڑھایا۔ البتہ بعض معاملات میں ندیم، اقبال سے اختلافات ضرور رکھتے ہیں لیکن اِس معاملے میں ندیم انتہا پسندی کا شکار نہیں ہوئے بلکہ مثبت انداز اختیار کیا۔ غلام عباس اپنے ایم۔اے کے مقالے میں لکھتے ہیں:

> ''ندیم کے ہاں اقبال کی فکر کے جن پہلوؤں سے اتفاق ہے، وہاں اُنھوں نے اسے اپنے عصر سے ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور جہاں انہیں اختلاف ہے وہاں اُنھوں نے راشد کی طرح اقبال پر کیچڑ نہیں اُچھالا بلکہ اقبال کی عظمت و عزت کا ہمیشہ پاس رکھا ہے۔'' [۹]

ندیم کی نظموں ''شاعر''، ''راز گریز'' اور ''عزمِ نو'' میں بھی اقبال کا اثر نمایاں ہے۔ ندیم، اقبال کی عظمت کے اِس قدر حامل تھے کہ وہ اقبال کو متوازن شخصیت کے ساتھ پڑھنے اور پڑھانے کی تلقین کرتے تھے۔ اُنھوں نے اپنے تنقیدی مضامین میں بھی اِس عظمت کو اُجاگر کرنے کی تلقین کی ہے۔ ان مضامین میں ندیم، اقبال کی اُن جہتوں کو تلاش کرتے ہیں جن سے اربابِ اختیار نے اجتناب کیا۔ اقبال کی شعری عظمت کے متعلق ندیم لکھتے ہیں:

> ''آج اگر ہماری شاعری میں زندگی اپنے تمام رنگوں سے آراستہ ہو کر ہمارے پاس چہل پہل کی کیفیت پیدا کر رہی ہے تو یہ علامہ اقبال کی دین ہے۔'' [۱۰]

ندیم کی بیشتر نظموں میں اقبال کی آواز سنائی دیتی ہے اور ان سے ہی متاثر نظر آتی ہے۔ یعنی اقبال جس آسانی سے چاند، تاروں، فلک، سورج اور زمان و مکان پر مبنی استعارے استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح ندیم نے بھی ان کو اپنی نظموں میں برتا ہے۔ ندیم کے فکر و احساس پر اقبال کے اثرات کے متعلق جلیل عالی رقم طراز ہیں:

> ''ندیم کی خدا پرستی، اِس کی نعت گوئی، اِس کی انسان دوستی، اِس کی ترقی پسندی، اِس کی انقلابیت، اِس کی ناقابلِ شکست رجائیت اور اِس کی پاکستانیت اسی جامع

نظریۂ حیات و کائنات سے ہم رشتہ ہے جس کی تعبیر نو اقبال کے فکر و احساس کی
صورت میں ہوئی ہے۔'' [۱۱]

لیکن ''شعلۂ گل'' تک پہنچتے پہنچتے اقبال کے اثرات کم ہونے لگتے ہیں اور نظم نگاری کے ابتدائی دور میں شباب کے سبب جذباتی ہیجان اور محبت میں ناکامی کے باعث شکست خوردگی کے آثار واضح نظر آتے ہیں۔ بعد میں ندیم خارج کی طرف متوجہ ہوئے تو یہ رجحان اعتدال قائم کرتا چلا گیا۔ فکری لحاظ سے نئی جہتوں کی دریافت نے اِن کی نظم کو بھی نئے آفاق سے روشناس کرایا اور اِس منفرد اسلوب اور اپنے شاعرانہ رنگ کی نمود ہوئی، جو ندیم کی پہچان ہے۔ ''یادِ رفتہ''، ''جوگی کا گیت''، ''محبوب مجھے اِک گیت سنا''، ''بھولی بسری باتیں''، ''برسات کی ایک رات''، ''اندمال''، ''جنگل کی ساحرہ''، ''التماس'' اور ''ایک ہرجائی سے'' جیسی نظموں میں رومانیت کا رنگ کچھ زیادہ شوخ اور شدید ہے اور واضح نظر آتا ہے کہ یہاں جذبہ، فکر پر پوری طرح غلبہ پا چکا ہے۔

اگر ایک پل کے لیے کبھی تُو بلندیوں سے اُتر سکے
میرے اُجڑے پُجڑے دیار سے اگر ایک بار گزر سکے
تو مرے خلوص کا واسطہ، مری آرزو، مری آس، آ
مری بات سُن، مری بات سُن، مرے پاس آ، مرے پاس آ

(آخری سجدہ) [۱۲]

رفتہ رفتہ ندیم کی رومانیت انقلاب کی راہوں کی جانب گامزن ہو جاتی ہے، جہاں انقلاب کی تمام تر آرزو اِن کے رومانی احساس کا حاصل بن جاتی ہے۔ تقسیم کے چند سال پہلے اِن کا شعور انگڑائی لیتا ہے اور وہ اپنی شاعری کا رشتہ آزادی کی تحریکوں اور بین الاقوامی برادری سے جوڑتا ہے۔ اس سے شاعر تاریخی، سیاسی اور معاشی رشتوں کو نئے انداز سے دیکھتا ہے۔ نظم ''لمحہ لمحہ''، ''ناتمام'' اور ''اُفتادِ زمانہ'' میں اس تبدیلی کی کروٹیں نظر آتی ہیں تو پھر ''تاریخ کی آواز''، ''پنشن''، ''طلوع''، ''مہاراج ادھیراج'' اور ''مغویہ'' جیسی نظموں میں یہ احساس واضح ہو جاتا ہے کہ ندیم انقلاب کے آرزومند ہیں مگر یہ انقلاب کسی بڑے پیمانے کی قتل و غارت سے نہیں بلکہ سماجی ارتقا کے قدرتی عمل سے حاصل ہونے والی تبدیلی ہے۔

نظم ''ارتقا'' میں اُنھوں نے سارے تہذیبی ارتقا کی داستان بیان کی ہے اور آخر میں اِس انقلاب کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا ہے جس کی وہ خواہش رکھتے ہیں۔ انقلاب کی خواہش کی وجہ سے ان کے ہاں زمینی مسائل اُبھرنے لگتے ہیں اور ایک انقلابی لہجہ پیدا ہونے لگتا ہے۔ الفاظ میں گھن گرج سی محسوس ہوتی ہے۔ اِس طرح اقبالؔ کے اثرات ختم ہونے لگتے ہیں اور فیضؔ احمد فیض کے لہجے کی گونج سنائی دیتی ہے۔ ندیمؔ نے اپنے شعری مجموعہ ''دشتِ وفا'' کا عنوان بھی فیضؔ کے شعری مجموعے ''دستِ صبا'' سے متاثر ہو کر رکھا اور اس میں ندیمؔ، فیض سے خاصے متاثر نظر آتے ہیں۔ ''جلال و جمال'' کی نظم ''افشائے راز'' بھی فیضؔ کی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ'' سے متاثر نظر آتی ہے۔ فیضؔ کہتے ہیں:

اَن گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخاب میں بُنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
لوٹ جاتی ہے اِدھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے

اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ ۱۳

ندیمؔ ''افشائے راز'' میں کہتے ہیں:

تیرے گیسو کو سنواروں کہ سنوں واویلا
علم و حکمت کے گرجتے ہوئے طوفانوں کا
میں خیالوں کے لبادے میں تو چھپ سکتا ہوں
ساتھ دینا ہے مگر چاک گریبانوں کا
مجھ کو اب تجھ سے بہت دُور لیے جاتا ہے
ایک انبوہ بلکتے ہوئے انسانوں کا

اِن کو عرفان کے چمن زار میں پہنچانے دے
عشق کی منزلِ اوّل سے گزر آنے دے ۱۴

ندؔیم پر آفاقیت کے حوالے سے بھی فیضؔ کا اثر نظر آتا ہے۔ فیضؔ کی نظموں جن میں ''ایرانی طلبہ کے نام''، "Africa come back" اور ''دریچہ'' وغیرہ شامل ہیں۔ اِن کی طرز پر ندؔیم نے ''خدیجہ زہرہ''، ''ایشیا'' اور ''نیا ایشیا'' جیسی نظمیں لکھیں۔

"Africa come back" میں فیضؔ کہتے ہیں:

آ جاؤ، میں نے دھول سے ماتھا اُٹھا لیا
آ جاؤ، میں نے چھیل دی آنکھوں سے غم کی چھال
آ جاؤ، میں نے درد سے بازو چھڑا لیا
آ جاؤ، میں نے نوچ دیا بے کسی کا جال

''آ جاؤ، افریقا'' ۱۵

ندؔیم ''نیا ایشیا'' میں کہتے ہیں:

خونِ فن کار میں ہیں تمام آدمیت کی سب نو دمیدہ اُمنگیں رواں
اے رفیقو! تمہی سے فنا گاہِ عالم میں رنگِ دوام آئے گا
اب تمہارے لہو کا جو قطرہ گرے گا وہ نسلوں کے کام آئے گا
پھر اُفق کی کماں میں تناؤ سا ہے
قلبِ انساں میں پھر ایک گھاؤ سا ہے
ایشیا منتظر ہے کہ انسانیت اس کے رمنوں میں گانے لگے
چہچہانے لگے
آؤ آؤ، قدم یوں اُٹھاؤ، کہ لاکھوں کروڑوں شہیدوں کی
محنت ٹھکانے لگے! ۱۶

حبسیہ شاعری میں بھی ندؔیم کے ہاں فیضؔ کا انداز دکھائی دیتا ہے۔ فیضؔ نے زنداں کی سختیوں کو برداشت کیا اور انہیں اپنے شعری تجربے کی صورت میں ڈھالا۔ ندؔیم کو بھی جیل جانے کا تجربہ ہوا، اِس لیے اُنھوں نے بھی فیض کے رنگ میں اشعار کہے۔ مگر ندؔیم، حبسیہ شاعری میں فیضؔ سے سبقت نہ لے سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں

کی جیلوں میں بھی بڑا فرق رہا۔ فیض ایک بڑی سازش کے سلسلے میں قید ہوئے۔ ان پر تمام مدت مقدمہ چلتا رہا۔ جب کہ ندیم محض حفاظتی اقدام کے تحت کچھ عرصہ کے لیے نظر بند رہے تھے۔ ندیم، جیل کی زندگی کو فیض کی طرح محسوس نہ کر سکے۔

محمد عظیم ملک رقم طراز ہیں:

''وہ (ندیم) بہت کم عرصے جیل میں رہے۔۔۔ (اور) زنداں تو اپنے اصل رنگ میں
اس مختصر عرصے میں کسی کے سامنے آنے سے رہا۔ یہی وجوہات غالباً ندیم کے،
فیض کے ہم پلہ بننے میں مانع ہوئیں۔'' ۱۷

ندیم کی نظم ''یاد''، فیض کی نظم ''یاد'' کا سلیس ترجمہ نظر آتی ہے۔ ندیم کی ادبی شخصیت پر مجید امجد کا اثر بھی دکھائی دیتا ہے۔ ندیم لاشعوری طور پر ان سے کسی نہ کسی حد تک متاثر تھے مثلاً ندیم کی نظم ''''ناگزیر'' کی ہیئت مجید امجد کی نظم ''امروز'' سے ملتی ہے۔ البتہ موضوع کے لحاظ سے دونوں مختلف ہیں۔ اس طرح نظم ''ارتقا'' کا موضوع مجید امجد کی نظم ''بس اسٹینڈ'' جیسا ہے۔ اِس طرح نظم ''ریستوران'' بھی مجید امجد کی نظم ''ہوٹل میں'' سے موضوعاتی مطابقت رکھتی ہے۔ مجید امجد نظم ''ہوٹل میں'' میں لکھتے ہیں:

بادل گرجا۔۔۔ گرے سنہری پردے، دلوں، دریچوں پر۔۔۔
بند ہوئے دو گول پپوٹے، چونچ میں دب گئی گرم زبان
چھری چلی حلقوم پہ، تڑپا تڑپتے تو لے یہ تڑختا ماس
سج گئے میز پہ مے کے پیالے، بٹ گیا طشتوں میں پکوان
چھت پر بارش، نیچے اُجلے کالر، گدلی انتڑیاں
ہنستے مکھ، ڈکراتی قدریں، بھوکی مایا کے سب مان
باہر۔۔۔ ٹھنڈی رات کا گہرا کیچڑ۔۔۔ درد بھرے آورش
چلو یہاں سے۔۔۔ ہمیں پکارے ننگی سوچوں کا رتھ بان ۱۸

ندیم، نظم ''ریستوران'' میں لکھتے ہیں:

ریستوران میں سجے ہوئے ہیں کیسے کیسے چہرے
قبروں کے کتبوں پر جیسے مَسلے مَسلے سہرے

اِک صاحب جو سوچ رہے ہیں پچھلے ایک پہر سے
یوں لگتے ہیں جیسے بچہ رُوٹھ آیا ہو گھر سے
کافی کی پیالی کو لبوں تک لائیں تو کیسے لائیں
بیرے تک سے آنکھ ملا کر بات نہ جو کر پائیں
کتنی سنجیدہ بیٹھی ہے یہ احباب کی ٹولی
کتنے اوجِ بلاغت پر ہے خاموشی کی بولی ۱۹

تقسیم کے بعد ندیم ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو جاتے ہیں لیکن اِن کے فن کو ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے دونوں مکاتیب انتہا پسندی سے بچا لیتے ہیں لیکن ترقی پسند تحریک کے اختتام کے بعد اِن کے ہاں جذبے کی شدت اور تخیل کی اُڑان وغیرہ کم ہوتے گئے اور وجدان پر فکر کا رنگ غالب آتا گیا۔ تخیل، جذبے اور فکر کے درمیان مفاہمت اور ارتباط کی صورت پیدا ہوتی چلی گئی اور ندیم کی پوری شعریات ایک ایسے فکری آئینے میں ڈھلتی گئی جہاں جذبہ زرنگاری کا کام دیتا ہے۔ اب اِن کی رومانیت، انقلابی فکر اور فلسفیانہ مزاج توازن کی مثال بننے لگتے ہیں۔ ''وقفہ''، ''تقاضے''، ''قیامت''، ''اندھیرے نے کہا''، ''کھنڈر''، ''اے خدا''، ''امیر و غریب'' سے لے کر ''پت جھڑ کی تنہائی''، ''میرے روز و شب''، ''جبر'' اور ''ایک اُداس لمحے کی نظم'' تک یہ رجحان بالکل ہی مدہم اور نرم رو ہو جاتا ہے۔

ندیم بیک وقت غزل اور نظم دونوں پر دسترس رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے غزل کے ساتھ ساتھ نظم کو بھی باوقار لہجے سے روشناس کرایا ہے۔ ڈاکٹر اظہار اللہ اظہار لکھتے ہیں:

''اُردو نظم کو اُنھوں نے جذباتی تعمق، تخیلاتی اپج اور فکری وسعتوں کی جن سرشاریوں میں اُبھارا ہے وہ جداگانہ انفرادیت کی حامل ہیں۔'' ۲۰

ندیم نے نظم جیسی صنف کو اِس کے تمام فنی تقاضوں کے ساتھ روشن کیا۔ جس سے اُردو شعر و سخن کی دنیا میں نئے باب کھلتے نظر آتے ہیں۔ اِن کے حساس دل و دماغ کی وجہ سے اِن کے اندازِ فکر اور لہجہ میں گہرائی پیدا ہو گئی ہے۔ ندیم کی نظموں میں موضوعات کا بڑا تنوع نظر آتا ہے۔ ان کی ابتدائی نظموں پر رومان کا گہرا اثر ہے۔ ''جلال و جمال'' کی ابتدائی اڑتالیس (۴۸) نظمیں ان کی رومانیت کی ترجمانی کرتی ہے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کے ابتدائی سالوں میں

کہساروں، میدانوں اور کھیتوں کا ذکر کیا ہے۔ ان تمام چیزوں کا ندیم نے مشاہدہ کیا اور یہ سب ان کی زندگی کا بنیادی حصہ بن گئی تھیں۔ اپنی زندگی کے ابتدائی دس برس ندیم نے گاؤں میں اپنی ماں کے پاس رہ کر بسر کیے۔ اس دوران انہیں فطرت کی گود میں کھیلنے کا موقع بھی ملا۔

ناہید قاسمی ''جدید اُردو شاعری میں فطرت نگاری'' میں لکھتی ہیں:

> ''ندیم کے ابتدائی کلام کو اِن کا ''نومشقی دور'' کہا جاتا ہے لیکن اس میں فطرت نگاری اپنی سادگی اور سچائی کے ساتھ بھرپور اور مکمل وجود اور حیثیت و اہمیت رکھتی ہے۔ ان کے مناظرِ فطرت کسی آرائشی کمرے میں سجی پینٹنگ کی مانند نہیں ہیں بلکہ اُنھوں نے فطرت کو بہت پاس سے، چھو کر دیکھا ہے اور اِس کی آواز سنی ہے۔ فطرت سے یہ دوستی اور ہم آہنگی اِن کے اشعار کو انوکھا حسن دیتی ہیں۔'' ؎۲۱

ندیم کی ابتدائی نظموں میں فطرت نگاری کا عکس نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ اپنی نظموں میں ندیم فطرت اور تخیل کی خوب صورت وادیوں میں چلے آنے کی دعوت دیتے ہیں۔

ندیم دیہات سے تعلق رکھتے تھے۔ اِس لیے اِن کی نظموں میں پنجاب کے دیہات کا رومان بڑا نمایاں ہے۔ ندیم نے اگرچہ دیہات میں کم عرصہ گزارا اور دیہی زندگی کے ساتھ اِن کا اصل تعلق دس بارہ سال کا ہے۔ اس کے بعد کبھی مہینے میں ایک یا دو دفعہ گاؤں کے چکر لگاتے، بعد میں یہ وقفے طویل سے طویل تر ہوتے گئے اور سال میں ایک دفعہ کہیں اپنے گاؤں جانے کا موقع ملتا۔ ندیم نے اگرچہ زیادہ وقت شہر میں بسر کیا اور دیہات کو، جہاں وقت گزارنے کا کم موقع ملا، اِن کی نظموں میں واضح اور نمایاں مقام حاصل ہے۔ اِس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اِن کو دیہات کے ایک ایک نظارے سے بہت محبت تھی۔ لیکن ان کو کم عمری میں ہی دیہات چھوڑنا پڑا اور دیہات میں مستقل نہ رہ پانے کی وجہ سے گاؤں اور اُس کے نظارے اِن کے دل میں بستے تھے اور وہ ہر لمحہ اِس کو اپنے جلو میں لے کر چلتے رہے۔ گاؤں ندیم کا کبھی کبھار جانا، اِن کی دُوری کے احساس میں شدت اور اضافہ کا باعث بنا۔ اس لیے ان کے دل میں گاؤں ہمیشہ زندہ رہا۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی نے محمد عباس کو انٹرویو دیتے ہوئے اِس کی وضاحت

کرتے ہوئے بتایا ہے کہ:

"ندیم لاہور جیسے شہر میں اک مدت گزرنے کے باوجود ذہنی لحاظ سے اپنے گاؤں میں موجود رہے اور یہی نہیں بلکہ اپنی اولاد کا رشتہ بھی اپنی آبائی زمین سے برقرار رکھا۔" ۲۲

ندیم بظاہر تو اپنے گاؤں سے دُور ہوتے گئے لیکن گاؤں سے ان کے احساسات و جذبات کا رشتہ ہمیشہ قائم رہا۔ احساسات و جذبات کے اِسی رشتے کی وجہ سے گاؤں کی فضا اور ماحول اِن کی ادبی شخصیت کا اہم ترین حوالہ بنی رہی اور عمر بھر اپنی تحریروں میں اپنے گاؤں کی تخلیقی بازیافت کرتے رہے۔ ندیم اپنی نظم "گاؤں کی شام" میں لکھتے ہیں:

دُھندلکے پربتوں پر چھا رہے ہیں
اُجالے کے کنول کملا رہے ہیں
گپھاؤں میں گڈریے بانکے
جوانی کے ترانے گا رہے ہیں
اندھیری کھوہ میں بھیڑوں کے ریوڑ
ٹھٹھر کر ٹھنڈ سے ممیا رہے ہیں
ہواؤں کو پروں سے تھپتھپاتے
پرندے گھونسلوں کو جا رہے ہیں
دُھواں سا گاؤں پر پھیلا ہوا ہے
نظر سے کھیت چھپتے جا رہے ہیں
ستارے، اِکا دُکا، ہولے ہولے
اندھیرے سے اُبلتے آ رہے ہیں
معطر وادیوں کے نرم جھونکے
فرازِ کوہ کو مہکا رہے ہیں
کہیں کوئل دما دم کوکتی ہے
کہیں ٹڈے بھجن چلا رہے ہیں ۲۳

ندیم نے کئی نظموں میں گاؤں کے خارجی ماحول کی منظرکشی کی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے گاؤں کا ہی کوئی منظر پیش کر رہے ہیں جو کہ بچپن کے کسی لمحے میں اِن کی آنکھوں میں سمایا اور ذہن کے کسی گوشے

میں محفوظ ہو گیا۔ ندیم خود لکھتے ہیں:

> ''جب بھی میں اپنا ماضی یاد کرتا ہوں تو لہلہاتے ہوئے کھیتوں، اڈتے ہوئے بادلوں، ڈھلی ہوئی پہاڑیوں اور چکراتی، بل کھاتی اور قدم قدم پر پہلو بچاتی ہوئی پگڈنڈیوں کی ایک دنیا میرے ذہن میں آباد ہو جاتی ہے۔'' ۲۴

ندیم کی شاعری کی منفرد اور محبوب ادا، گاؤں کی زندگی کے حسن اور عذاب، دل کشی، خوب صورتی اور دل گدازی ہر دو کی مصوری اور ترجمانی ہے۔ ندیم اپنی نظموں میں دیہی زندگی کے حسین و دل رُبا مناظر پیش کرتے ہیں۔ نظم ''مادرِ فطرت'' میں کہتے ہیں:

دُور پربت پر ہیں طوفانی گھٹائیں خیمہ زن
ندیاں ناگن سے بل کھاتی رواں ہیں جابجا
آ رہی ہے جیسے ہر جانب سے چڑیوں کی صدا
جھاڑیوں پر تازگی ہے، کونپلوں پر بانکپن ۲۵

ندیم اِس نظم کو لکھتے وقت اِن کو اِن کی تمام تر جزئیات سمیت پیش کرتے ہیں اور پس منظر کی ایسی واضح شکل کو اختیار کیا گیا ہے کہ پیش منظر محسوس ہوتا ہے۔ ندیم نے جس طرح اپنی نظموں میں دیہاتی معاشرت، اِس کی زندگی اور مسائل کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ اِس حوالے سے فراق گورکھ پوری رقم طراز ہیں:

> ''ندیم کے اشعار میں زندگی اور مسائل زندگی کی بھرپور چوٹیں ہیں، ان کی آواز میں زندگی کے خواب، زندگی کے درد، زندگی کی فتوحات اور اِن فتوحات سے بھی بڑھ کر اہم چیز زندگی کی شکستیں، گہرے اور پُرخلوص سوچ کے عناصر سب مل کر حل ہو گئے ہیں اور ان کے نغمے فضائے زندگی میں وہ گونج پیدا کر رہے ہیں، وہ جھنکاریں اُٹھا رہے ہیں، اِس کھنک کو جنم دے رہے ہیں، جو شاعر اور شاعری کو لازوال بنا دیتی ہیں۔'' ۲۶

ندیم کی نظمیں ہمیں زندگی کے نشیب و فراز، گہرائیوں اور بلندیوں کی سیر کراتی اور زندگی کو نہ بھولنے والے احساسات و تجربات سے مالا مال کر دیتی ہیں۔ اِن کے ہاں مقامی معاشرت کی عکاسی کا رجحان نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ندیم نے گاؤں کی حقیقی زندگی اور رومانوی روپ میں ملنے والی گاؤں کی تصوراتی زندگی کا موازنہ کیا ہے

اور دیہات کی اصلی اور حقیقی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ندیم ایسے شاعر اور ادیب کو پسند نہ کرتے تھے جو گاؤں کی زندگی کو Idealize کرتے ہیں۔ اپنے انٹرویوز میں ندیم نے کئی بار اِس امر کے خلاف اپنے تاثرات ریکارڈ کروائے اور زندگی کی آخری سانس تک اس بات کے خلاف تھے اور چاہتے تھے کہ گاؤں کو اِس کے حقیقی خدوخال کے ساتھ پیش کیا جائے۔ عام طور پر شاعر گاؤں کو اِس طرح پیش کرتے ہیں جیسے وہاں بڑا امن وسکون ہے۔ وہاں فرشتے اور حوریں بستی ہیں، جب کہ دیہات قبائلی رسم و رواج اور فتنہ وفساد اور قتل و غارت کے شکنجے میں گھرا ہوا ہے۔

ندیم لکھتے ہیں:

> ''ہمارے ادب میں دیہی زندگی کی سچائیوں کا اظہار کم کم ہی ہوا ہے۔ اِس کی وجہ بدنیتی نہیں ہے بلکہ بے خبری ہے۔۔۔ ہمارے لکھنے والے بیش تر شہروں سے تعلق رکھتے ہیں اور شہروں سے باہر ذرا کم ہی جھانکتے ہیں۔ یوں ہمارے ادب میں دیہی زندگی کی مسلسل حق تلفی ہوتی رہی ہے۔'' [۲۷]

اُردو شاعری میں مقامی روایات و علامات کو پیش کیا گیا ہے لیکن ندیم کا کمال یہ ہے کہ اِن کے ہاں پہلی بار اُردو شاعری میں پنجاب کی دیہاتی ثقافت اور اس سے اخذ کی گئی روایات اور علامات نظر آتی ہیں۔ اِن کی نظموں میں یہ مقامی رنگ اِن کے مشاہدات و تجربات کی صورت میں جلوہ گر ہوا ہے۔ ندیم کی نظموں میں استعمال کی گئی علامات جن میں کوئل، پپیہا، گڈریا، چرواہا، پنہاری، کسان، درانتی، ہل، فصل، کھیت، کنواں، بیل، پنگھٹ، چوپال، پگڈنڈی وغیرہ شام ہیں۔ اِن کی شاعری مقامی رنگ کو اُبھارتی ہے جس کے ذریعے ہم بہتر طریقے سے محسوس کرتے ہیں۔ ندیم کی نظموں ''ان دیکھا محبوب''، ''میرا گاؤں''، ''گاؤں کی صبح''، ''ساون''، ''گاؤں کی شام''، ''مرغزار و جوئے بار''، ''شہ پارہ'' اور ''چرواہے'' وغیرہ میں مقامیت کا رنگ نمایاں ہے۔ ندیم نظم ''میرا گاؤں'' میں لکھتے ہیں:

رہوں گا اپنے وطن کے بہشت زاروں میں
جوان وادیوں، بلوان کوہساروں میں!

یہ کچے مٹی کے گھر، یہ غریب رشتہ دار
یہ آڑھی ترچھی سی بوسیدہ چھپروں کی قطار
صبیح بچوں کے جھمکٹ پہ تنگ گلیوں میں
یہ پھول بننے کے انداز تازہ کلیوں میں
یہ منہ اندھیرے ہی بیلوں کی گھنٹیوں کی صدا
یہ صبح صبح گھروں سے دُھواں سا اُٹھتا ہوا
یہ چھت پر بیٹھی ہوئی بھولی بھالی دوشیزہ
گلی سے بانکا سا اِک نوجواں گزرتا ہوا
یہ اونچے اونچے درختوں کی چھدری چھدری چھاؤں
اُفق پہ بکھرے ہوئے بے شمار ننھے گاؤں
یہ سرد راتوں میں چوپال پر سلونے گیت
یہ حادثات کا اظہار، صبر و شکر کی ریت ۲۸

ندیم نے اپنی نظموں میں دیہات کی بھرپور عکاسی کی ہے اور دیہات کی طرزِ معاشرت اور جغرافیائی ماحول پنجاب کے ہر گاؤں اور ہر علاقے میں ملتا ہے۔ خود ندیم کہتے ہیں:

''جہاں تک مجھے پنجاب کے دیگر اضلاع کو دیکھنے کا موقع ملا، میں نے دیہاتی زندگی کے بنیادی اصولوں میں کوئی فرق نہیں پایا ہے۔'' ۲۹

اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پنجاب کے دیہات میں پائی جانے والی مشترک تہذیبی روح سے ندیم بخوبی واقف تھے۔ پنجاب کا کوئی بھی علاقہ ہو، وہاں کے عوامی مسائل اور ترجیحات تقریباً ایک جیسے ہوتے ہیں۔ غربت، بھوک، افلاس، بے روزگاری، بیماری، طبقاتی کش مکش، ناخواندگی، کمزور طبقوں کا استحصال، باوسائل طبقوں کے آمرانہ اور جابرانہ رویے، یہ سب پنجاب کے دیہاتوں کے مسائل ہیں۔ ندیم نے اپنی نظموں میں اِن تمام مسائل کی خوب صورت عکاسی کی ہے۔ ندیم نے مقامی معاشرت اور اس کے مسائل کے ہر ہر پہلو سے مطالعہ کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ندیم نے ہر غریب انسان کی زندگی خود اپنی زندگی میں گزاری ہے۔ دیہات کے تہذیبی نظام کے کبھی پہلو اور

مظاہر ملتے ہیں جہاں رسومات، رہن سہن، لباس، خوراک، اجتماعی معاشرتی نظام، روزگار، جغرافیائی، قدرتی مظاہر اور رہائش کے طریقے وغیرہ کی صورت میں اِس تہذیب کے خارجی پہلوؤں کی تصویر ملتی ہے۔ وہاں عقائد، طرزِ فکر، توہمات، محسوسات اور ترجیحات وغیرہ کی شکل میں اس تہذیب کے داخلی پہلوؤں سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ ان کی نظموں میں نہ صرف فطرت نگاری اور منظرنگاری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ بلکہ ندیم پر فطرت کے مشاہدہ میں انہماک اور توجہ سے زندگی کے دائمی تسلسل کا بھید کھلتا ہے۔ ندیم کو فطرت کے خارجی مظاہر کے مشاہدے نے زندگی کی ہیشگی کا عرفان بخشا ہے۔ ندیم متنوع پیرایوں میں ہمیں بتاتے ہیں کہ جہاں سے ایک شاخ ٹوٹتی ہے، وہیں سے ایک نئی شاخ پھوٹتی ہے۔ اپنی نظم ''تحریر'' میں لکھتے ہیں:

ستارہ ٹوٹ جاتا ہے
مگر بجھنے سے پہلے اپنی اس جگمگ عبارت سے فنا پر
خندہ زن ہوتا ہے
میں مٹ کر بھی آنے والے لمحوں میں درخشاں ہوں
جو پتہ شاخ سے گرتا ہے
قرطاسِ ہوا پر، دائروں میں لکھتا آتا ہے
کہ شاخوں پر تڑپتے دوستو!
اگلی بہاروں میں مجھے پھر لوٹنا ہے، پھوٹنا ہے
ٹوٹنا ہے، خاک ہونا ہے
مگر وہ خاک، جو اشجار کی ماں ہے [۳۰]

اگر خزاں، نئی بہار کی تیاری کا عارضی وقفۂ زماں ہے تو پھر موجودہ زندگی بھی آنے والی زندگی کا سفر ہے۔ جہاں ایک زندگی کی حد ختم ہوتی ہے، وہاں سے نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اِس لیے ندیم بڑی خوش دلی کے ساتھ ہنستے کھیلتے پتوں کی مسرور اور نشاطیہ زندگی کے ساتھ، موت کی طرف پرواز کرنے کا تصور پیش کرتے ہیں اور نظامِ فطرت کے اصولوں سے زندگی اور موت کے معنی کو تلاش کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ندیم اپنی نظم ''ازلی مسرتوں کی ازلی منزل'' میں بھی اِس تلاش میں سرگرداں دکھائی دیتے ہیں اور اِس نظم کی فضا مقدر پرستی کی

فضا میں سانس لے رہی ہے۔

دیوانی کو کون بتائے، اِس مندر کی دھن میں سب تھک ہار گئے ہیں
سائے بن کر گھوم رہے ہیں، جو بے باک چلانے والے پار گئے ہیں
وہ جب ناؤ سے اُترے گی، مٹیالے مٹیالے بادل گھر آئیں گے
میدانوں پر، کہساروں پر، دریا پر، ناؤ پر، سب پر چھا جائیں گے
اوّل تو پگڈنڈی کھو کر گر جائے گی کالے غاروں میں بے چاری
بچ نکلی تو ہو جائے گی اِس کے نازک دل پر اک ہیبت سی طاری
ہوش میں آئی تو رگ رگ پر ایک نشہ سا بے ہوشی کا چھایا ہو گا
جس کے بدلے اِس مندر میں ایک لجیلا اک چکیلا سایا ہو گا ۳۱

ندیم اس نظم میں موت کو انسانی خودی کے لیے کڑی آزمائش کا مقام سمجھتے ہیں۔ فطرت سے یہ لگاؤ ان کی ابتدائی نظموں میں بہت زیادہ ہے۔ اس کے بعد نقطہ نظر کی تبدیلی کی وجہ سے دیکھنے اور بیان کرنے کا انداز تبدیل ہو جاتا ہے۔ اب ندیم کو مقامی معاشرت میں طبقاتی تضاد، سماجی بگڑی ہوئی صورتِ حال دکھائی دیتی ہے۔ اِس طرح ندیم اپنی نظموں کے ذریعے دیہات کی معاشرتی اصلاح چاہتے ہیں۔ محمد اکرم رضا لکھتے ہیں:

''اِن کی شاعری کا نصب العین بھی بڑی حد تک دیہات کی فضا سے اخذ کردہ ہے۔ دیہات کی فضا میں اگرچہ حسن جاذبیت اور دل ربائی کی فراوانی ہے مگر عصرِ حاضر کے ندیم سے اہلِ دیہات کی حالت زار بھی پوشیدہ نہیں ہے۔'' ۳۲

ندیم چوں کہ خود دیہات سے تعلق رکھتے تھے۔ اِس وجہ سے وہ دیہات کو اپنے مشاہدات کی روشنی میں پیش کرتے ہیں اور دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی طرح دیہات کو ہمدردانہ نگاہ سے دیکھنے کی بجائے دیہاتی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اُنھوں نے دیہات کی زندگی کو جن رنگوں میں دیکھا اور محسوس کیا، اُنھی رنگوں میں اِس کو پیش کیا اور اس پر ملمع کاری کرنے کی بجائے اُسی حقیقت کے ساتھ پیش کیا۔ نظم ''دیہات کی شہزادی'' میں کہتے ہیں:

کھیلے گی شعاعوں سے، لپٹے گی ہواؤں سے
تھپکائے گی دھرتی کو جھانجھن کی صداؤں سے
خلوت کو سجائے گی گیتوں کی رداؤں سے ۳۳

ندیم کی شاعری میں رومانیت، حسن کی تصویر کاری، جذبات کی پیش کش، محبت کی اہمیت کئی پہلوؤں کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ ان کے خیال میں محبت انسان کا سب سے بڑا حسن ہے۔ اس اندازِ نظر نے ندیم کی عشقیہ شاعری میں ندرت پیدا کی ہے۔ اپنی نظم ''آخری سجدہ'' میں اِس کیفیت کا خوب صورت اظہار کیا گیا ہے:

مری زندگی ترے ساتھ تھی، مری زندگی ترے ہات تھی
مرے قلب میں ترا نُور تھا، مرے ہونٹ پر تری بات تھی
مری روح میں ترا عکس تھا، مری سانس میں تری باس تھی
ترے بس میں میرا شباب تھا، ترے پاس میری ہر آس تھی
ترے گیت گاتی تھی جب بھی میں، مجھے چھیڑتی تھیں سہیلیاں
مگر اِن پہ کھل نہ سکیں کبھی مری زندگی کی پہیلیاں
میں ترے جمال میں محو تھی، میں ترے خیال میں مست تھی
مجھے کیا سمجھتیں وہ لڑکیاں، کہ میں اپنے حال میں مست تھی
تری شان میں مری شان تھی، ترا دبدبہ مرا ناز تھا
تری دلبری مری جان تھی، تری عاشقی مرا راز تھا ۳۴

ندیم کی عشقیہ شاعری میں جذبۂ محبت احساس کی تمام تر شدتوں سے غور و فکر کرنے کا دور ہے اور وہ جذبۂ عشق کا سماجی اور نفسی ہر دو کیفیات کے حوالے سے خالصتاً محسوساتی سطح پر تجزیہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ''یاد کا چاند''، ''توحید''، ''بہار''، ''یہ ستارے''، ''لمحے اور صدیاں''، ''یہ عجب شب ہے''، ''شامِ فراق''، ''دُوری''، ''عشق کرو''، ''قریۂ محبت''، ''ماضی و حال''، ''دائرے''، ''حسن بے حساب'' جیسی نظمیں رومانیت کے جذباتی انداز یا زمانے کی تلخی کی بجائے جذبۂ عشق کا خالص فکری انداز میں تجزیہ پیش کرتی ہیں۔ ندیم کی عشقیہ شاعری میں محبت کو اولیت دی گئی ہے۔ حسن، محبت کے بغیر حسن نہیں رہتا، اُن کی عشقیہ شاعری میں محبت بلند درجہ رکھتی ہے۔ جو عام طور پر دوسرے شعرا کے ہاں نظر نہیں آتی، عورت کو سراسر جسم سمجھنے اور اِس کی جان کے نازک احساسات سے منہ موڑنا، عورت کے مکمل وجود سے انکار ہے۔ اکثر شعرا کے ہاں یہ انکار جگہ جگہ نظر آتا ہے لیکن ندیم کے ہاں ایسا نہیں ہے۔

بقول خدیجہ مستور:

''شاعروں نے عشق کو صرف جسم سمجھ کر اپنے خیالات کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ اس عورت کے احساسات و خیالات کو کوئی دخل نہیں۔ عورت کو محبت اور اس کے نیک جذبات کا کوئی شائبہ تک نہیں۔ مگر ندیم کی عشقیہ شاعری عورت کے جذبات و احساسات سے گزر کر اِن کے قلم تک آتی ہے اور یہی اِن کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی ہے۔'' ۳۵

جذبہ و احساس پر رموزِ محبت کی شدت کے ساتھ اس پر غور و فکر کا زمانہ ندیم کی عشقیہ شاعری پر نکھار کا زمانہ ہے۔ ندیم میں شباب کے سبب جذباتی ہیجان اور محبت میں ناکامی کے باعث شکست خوردگی کے آثار واضح نظر آتے ہیں۔ بعد میں ندیم خارج کی طرف متوجہ ہوئے تو یہ رجحان اعتدال قائم کرتا چلا گیا۔ فکری لحاظ سے نئی جہتوں کی دریافت نے اِن کی نظم کو بھی نئے آفاق سے روشناس کرایا اور اِس منفرد اسلوب اور اپنے شاعرانہ رنگ کی نمود ہوئی جو ندیم کی پہچان ہے۔ ندیم کے نزدیک اِن کا محبوب گوشت پوست سے بنا ہوا ہے جس کے پاس دل کے ساتھ ساتھ دماغ بھی ہے۔ ان کا محبوب دل و دماغ کے ساتھ اپنے عاشق سے عشق کرتا ہے۔ اِس لیے ندیم اپنے محبوب کو ایک وقت میں زمین اور آسمان کہہ رہے ہوتے ہیں۔ نظم ''توحید'' میں کہتے ہیں:

دھر کو تشنگیِ ناز بتاں ہے اب تک
تو میری یاد میں کیوں سوختہ جاں ہے اب تک
تجھ کو اک مجھ سے، فقط مجھ سے محبت کیوں ہے
یہ تو میں مانتا ہوں تو میری جاں ہے اب تک
کیوں مسرت سے ہے محروم تری شانِ جمال
کیوں میرا غم تیرے چہرے سے عیاں ہے اب تک
میرا معیار وفا ہے تیرے دم سے قائم
ہر گھڑی تُو مری جانب نگراں ہے اب تک ۳۶

ندیم اور اُس کا محبوب دونوں ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے ہیں۔ نظم ''ایک رات'' میں اِن خیالات کا

اظہار یوں کیا گیا ہے:

برسوں کے بعد آج بھی اے مبدءٔ حیات
تو میری دوست بھی ہے، مری ہم سخن بھی ہے
تو میرا شعر، میرا فسانہ، مری زباں
تو میرا فن بھی ہے، مرا موضوعِ فن بھی ہے ۳۷

ندیم کی عشقیہ شاعری میں عورت اپنے اصل روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ وہ اپنے محبوب کے فراق میں روتی ہے، وفا کرتی ہے، ایثار و قربانی دیتی ہے، نیک جذبات سے سرشار کرتی ہے، وہ اپنے عاشق کی دوست ہے اور اس کے دُکھ سکھ کی ساتھی ہے اور یہ عورت، ندیم کے غرورِ وفا کی جان ہے۔ ندیم کی عشقیہ شاعری میں محبت اور تعلقاتِ محبت کے تمام روپ نظر آتے ہیں۔ ان میں ہجر کی تلخی سے لے کر وصال تک کی خواہشیں انگڑائیاں لیتی ہیں۔ عشق بیک وقت ناکام بھی ہے اور کامیاب بھی۔ ندیم اپنی نظم ''ہجر و وصال'' میں بھی اِن خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ بعض اوقات محبوب قریب ہو کر بھی دُور ہو جاتا ہے اور بعض اوقات دُور رہ کر بھی رگ و جاں بن جاتا ہے۔ ندیم کہتے ہیں:

اب کہ تو شب کی طرح میری رسائی میں نہیں
میری رگ رگ میں ترے لمس کے شعلے ہیں رواں
میرے ہاتھوں کی یہ پوریں ہیں کہ شمعوں کی لویں
میرے ہونٹوں میں تپاں ہیں تری سانسوں کی رویں
میری آنکھوں میں بسا ہے تری زُلفوں کا دھواں ۳۸

ندیم اس نظم میں بتاتے ہیں کہ قرب کی سرشاریوں اور وصل کی لذتوں کے باوجود یہ دونوں اشخاص ایک قالب میں نہیں ڈھل سکتے۔ ندیم نے جس طرح گوشت پوست کے اس محبوب کے ساتھ وصل کی کیفیات کا اظہار کیا ہے، وہ اُردو شاعری میں اپنی مثال آپ ہے۔ ندیم کے ہاں عورت کی عزت اور تقدس کو نہ تو پامال کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی عورت اِن کے نزدیک محض شباب نظر آتی ہے بلکہ اِن کے ہاں عورت وفادار اور وفا شعار ہے۔ ندیم کی نظموں کو پڑھنے سے کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ ان کے نزدیک عورت حقیر ہے۔ اگرچہ اُنھوں نے وصال،

فراق، رقیب، بے وفائی اور جسمانی حسن، ہر پہلو سے شاعری کی ہے لیکن کہیں بھی عورت پر حرف نہیں آنے دیا اور نہ ہی اِس کی محبت کو گراوٹ کا شکار ہونے دیا۔ اِن کے ہاں عورت فطرت کے عین مطابق ہے۔

ندیمؔ کی زندگی میں سب سے پہلے آنے والی عورت، اِن کی ماں تھی، اور اِسی عورت کے وجود نے انہیں عورت کے احترام اور وقار کا احساس دلایا۔ اس لیے اِن کی اکثر نظموں میں غیور ماؤں کے کردار کے ساتھ ساتھ، نادار اور غریب بچوں کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ نظامِ معیشت نے جس طرح غربت کی چکی میں پستی ہوئی ماؤں کو مسلسل کرب اور تکلیف میں بتلا کر رکھا ہے، اِس کا اظہار ندیمؔ اپنی نظم ''چوگا'' میں کرتے ہیں:

باجرے کا اِک دانہ اپنی چونچ میں رکھے
چڑیا اماں چوگا دینے آئی ہے
بچے اتنے ننھے منے سے ہیں
جب وہ چیختے ہیں
سر سے پنجوں تک چونچیں بن جاتے ہیں
دانہ ایک اور بچے دس ہیں
چڑیا اماں کس کو چوگا دے
کس کس کی چونچ سے چونچ ملا کر ڈھارس دے
ذرہ توڑ کے حشر بپا کرنا تو تم نے سیکھ لیا ہے
دانہ توڑ کے زندگی برپا کرنا اِس سے اُونچا فن ہے
کیا تم دانہ توڑ سکو گے؟
دانہ ایک اور بچے دس ہیں! ۳۹

دانہ توڑ کر زندگی برپا کرنے کا یہ چیلنج خود ندیمؔ کی ماں کو بھی درپیش تھا۔ یہ وہ ماں ہے جو قربانی اور ایثار و محبت کا پیکر ہے اور اس نے اپنے بچوں کے مستقبل کی خاطر اپنی ذاتی زندگی کی مشکلات اور ستم کو کرم بناتی ہے۔ اِس ماں کی یاد خود ندیمؔ کے دل میں ہمیشہ زندہ رہی۔ اِن کا کہنا ہے کہ:

''میری زندگی پر سب سے عظیم اثر میری ماں کا ہے ___ جب میں دیکھتا ہوں کہ اِس دنیا کی بیش تر ماؤں نے اپنے بچوں کے لیے توے کی کالک سے روشنائی بنائی ہے۔۔۔

اور جب میں دیکھتا ہوں کہ میرے جیسے کروڑوں، اربوں، بیٹوں نے ایک پیسے کے حصول
میں ناکامی کے دُکھ پر آنسو بہائے ہیں اور ماؤں کی آغوش میں منہ چھپا کر روئے ہیں
جب میں یہ دیکھتا ہوں۔۔۔۔تو میرے احساسات میں تموج نمایاں ہوتا ہے۔'' ۳۴؎

اِس طرح ندیم نے غریب، نادار اور مفلس بچوں کے مصائب و مسائل اور فقر و فاقہ میں مبتلا ماؤں کے درد اور کرب کو بڑی دردمندی کے ساتھ اپنی نظموں میں پیش کیا ہے۔ ندیم کو اپنا بچپن ہمیشہ یاد رہا اور وہ ہمیشہ اپنے بچپن کی سادگی، معصومیت، حیرت اور بے ساختگی کو رومانی کرب کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ ندیم کی ذات میں یہ بچہ ہمیشہ سرگرم تمنا اور زندہ رہتا ہے۔ ندیم اس دنیا کی تمام ماؤں کو فقر و فاقہ سے آزاد کرانا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کے چہروں پر خوشی کا رنگ دکھائی دے۔ اس طرح ان کی نظمیں، ان کی ادبی شخصیت پر ماں کے اثرات کو ظاہر کرتی ہیں۔ کیوں کہ ندیم اور ان کی والدہ کو معاشی مسائل کا سامنا تھا بلکہ ان کی ماں کو اپنے محدود وسائل کے ساتھ تین بچوں کی پرورش کا چیلنج بھی درپیش تھا۔ ندیم اِن تمام مسائل کو اپنی روح کی گہرائی تک محسوس کرتے ہیں۔ اُنھوں نے پہلے اپنی ماں کی آنکھوں کے سامنے ان دُکھوں کو لہراتے دیکھا اور بعد میں دنیا کی تمام دکھیاری ماؤں کو اپنی ماں کے روپ میں دیکھا اور یہی احساس ان کی نظموں کی صورت میں ڈھل کر سامنے آیا۔

ندیم نے جب اپنی ذات سے نکل کر اِدھر اُدھر کے ماحول کو دیکھا تو اِن کی نظر معاشرتی حقائق پر پڑی تو انہیں احساس ہوا کہ غم صرف ان کا ہی نہیں بلکہ ہر دل کا مقدر ہے۔ یہیں سے ندیم نے معاشرے کے ناآسودہ نظام کے خلاف آواز بلند کی اور حقیقت پسندی کی طرف مائل ہو گئے۔ ندیم، تلخی اور بے اطمینانی کا اظہار ذاتی وجوہات کی بنا پر نہیں کرتے بلکہ اپنے دکھ کو معاشرے کے دکھ کے ساتھ وابستہ کر لیتے ہیں۔ ندیم سماج کے ناآسودہ نظام پر جب غور کرتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ معاشرے میں امن اور انصاف کی عالم گیر اقدار کا قیام کیوں نہیں ہے۔ ان حقائق پر غور و فکر کے بعد ندیم حقیقت پسندی کی طرف مائل ہو گئے اور معاشرتی رشتوں کی طرف چل پڑے۔ یہی راستہ ترقی پسند تحریک کی طرف نکلتا ہے۔ ترقی پسند ادب کا مقصد ادب کو عوام کے قریب لے کر آتا ہے اور نسلِ انسانی کو جن مسائل کا سامنا ہے، اُن تمام مسائل پر آزادی کے ساتھ رائے دینا ہے۔ اِس تحریک کا ایک اہم مقصد یہ

بھی تھا کہ انسان کو اِس کی گم گشتہ عظمت کا احساس دلایا جائے اور اس کو اِس کا کھویا ہوا وقار واپس دیا جائے۔ اس طرح اس تحریک نے حقیقت نگاری کے فروغ سے ادب کو سماجی اقدار سے ہم آہنگ کیا اور ادب کے ذریعے انسانیت کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی۔ ندیم نے اس تحریک کے اثرات کو قبول کیا اور ان کی ادبی زندگی پر اِس تحریک کے نمایاں اثرات ہیں۔ ندیم انسان کی عظمت اور برتری کے قائل ہیں۔ اُنھوں نے اپنی نظموں میں انسان دوستی، انسانیت، پیار اور محبت کا درس دیا۔ اُن کی بیش تر نظمیں اِسی قسم کے خیالات و نظریات کے گرد گھومتی ہیں۔ ندیم اِن خیالات و نظریات کو پیش کرتے ہوئے فلسفیانہ رنگ و آہنگ اختیار نہیں کرتے بلکہ ان خیالات کو جذبے میں سمو کر بیان کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے خیالات و نظریات فکری گہرائی کے ساتھ ظاہر ہوئے ہیں۔ اس طرح ان کی نظموں میں انسان کی عظمت کا تصور بہت نمایاں ہے۔

بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

> ''قاسمی کے خیال میں انسان نے زندگی کے ہر شعبے میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں اُن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان عظیم ہے۔ کیوں کہ اُس کی کوششوں اور کاوشوں سے زندگی ارتقا کے راستے پر گامزن ہوتی ہے۔ وہ زندگی کو سنوارتا ہے۔ اُس میں رنگ بھرتا ہے۔'' [۱۴]

ندیم کی نظموں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر ایک انسان دوست شاعر ہیں اور انسان اور انسانی زندگی سے والہانہ محبت کرتے ہیں اور اِسی کو اپنا نصب العین بنا لیتے ہیں۔ انسان، ندیم کی شاعری کا ہیرو ہے جو زندگی کے کھیل میں شدید کرب سے دوچار ہے۔ ندیم نے اپنی نظم ''انسان عظیم ہے'' میں خدا کو مخاطب کر کے اِس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اُس کی عظمت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن انسان جو اِس خدا کی مخلوق ہے وہ بھی عظیم ہے کیوں کہ خدائی ذات کے ساتھ اُس کو ایک خاص نسبت ہے۔ ان کی یہ نظم اِن اسباب سے برسرِ پیکار نظر آتی ہے جن کے باعث انسان آلام و مصائب میں گھرا ہوا ہے۔

ندیم کے نزدیک انسان ایک ایسی ہستی ہے جسے قدرت نے رفعتوں سے نوازا ہے اور جس کے وجود

میں امکانات کی ہزاروں دنیائیں آباد ہیں۔ انسان کے وجود ہی سے کائنات نے نشوونما پائی اور اِس دنیا کے ہنگامہ کو رنگ و بو نصیب ہوئی۔ ندیؔم اپنے مخصوص شعریت سے بھرپور انداز میں اِس کا اظہار یوں کرتے ہیں:

تُو سنگ ہے اور وہ شرر ہے ۔۔۔ تُو آگ ہے اور وہ اُجالا
تُو نم ہے، نمو کا پاسباں وہ ۔۔۔ تُو دشت ہے، وہ چراغ لالہ
اس نے ہی تجھے حسیں بنایا
انسان عظیم ہے خدایا!

تُو عینِ حیات ہے، مگر وہ ۔۔۔ تزئینِ حیات کر رہا ہے
اس پر ہے غلط فنا کا الزام ۔۔۔ سامانِ ثبات کر رہا ہے
اب جینے کا ڈھب سمجھ میں آیا
انسان عظیم ہے خدایا!

تُو وقت ہے، روح ہے، بقا ہے ۔۔۔ وہ حسن ہے، رنگ ہے، صدا ہے
تُو جیسا ازل میں تھا سو اب ہے ۔۔۔ وہ ایک مسلسل ارتقا ہے
ہر شے کی پلٹ رہا ہے کایا
انسان عظیم ہے خدایا! ۴۲

ندیؔم انسان کو فطرت کا شاہ کار سمجھتے ہیں۔ زندگی میں اس کی حیثیت روشنی کی ہے۔ اُن کے نزدیک انسان ترقی کا پیشوا اور ارتقا کا پیام بر ہے۔ اُن کا مقصدِ حیات، تزئینِ حیات اور زندگی کو دوام بخشنا ہے۔ اُس کو فنا سے کوئی تعلق نہیں۔ یہی اُس کی زندگی کا بنیادی مقصد ہے اور اسی کے لیے انسان ازل سے کوشاں ہے لیکن انسان کی تخلیق کے بارے میں ذہن میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ کائنات میں اس کا وجود کیا مفہوم رکھتا ہے۔

انسان کے بارے میں جارج لوکاچ لکھتے ہیں:

"------- There is no content of which man himself is not the focal point. However, various the donnees of literature (a particular experience, a didactic purpose), the basic question is, and will remain:

"What is man ?" ۴۳

ندیم انسان کی ترقی اور برتری میں زندگی میں حرکت وعمل کو اہمیت دیتے ہیں، کیوں کہ ندیم زندگی کو متحرک دیکھنا چاہتے ہیں اور اس لیے اِن کے نزدیک حرکت ہی میں زندگی کا حسن ہے۔ ندیم کہتے ہیں کہ حرکت کے اِس عمل کو تیز کر کے حُسن کو پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ندیم کی انسان کے ساتھ بڑی اُمیدیں وابستہ ہیں۔ وہ اس کے مصمّم ارادے پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ اِس لیے اُنھوں نے انسان اور انسانی عمل کے نغمے گائے ہیں۔ ندیم نے اپنی نظم ''نغمۂ انسان'' میں اِس حقیقت کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ اِس نظم میں انسان اِس احساس کا اظہار یوں کرتا ہے:

اِس خراب آباد میں مثلِ بہار آئیں گے ہم
بادہ ریز و رنگ بیز و نغمہ بار آئیں گے ہم
کوہساروں سے برنگِ آبشار آئیں گے ہم
اور میدانوں میں بن کر برگ و بار آئیں گے ہم

اوس کے پیکر میں اُتریں گے چمن زاروں پہ ہم
برق کی صورت میں کوندیں گے جہانداروں پہ ہم

یہ عروسِ زندگی کی دلربائی ہم سے ہے
کارگاہِ زیست کی ہنگامہ زائی ہم سے ہے
جذبۂ تخلیق کی انجم رسائی ہم سے ہے
کبریائی ہم سے، شانِ کبریائی ہم سے ہے

ہم نہ ہوں تو اِس طرح اُجڑے خدائی کا سہاگ
جس طرح خرمن میں بجلی، جس طرح جنگل میں آگ

ہم نے دھرتی کے کلیجے میں نمو پیدا کیا
ہم نے مٹی کے مرکب سے سبو پیدا کیا
خوشۂ انگور سے ہم نے لہو پیدا کیا
ہم نے یہ ہنگامہ زارِ رنگ و بُو پیدا کیا

گو عناصر چیختے، چلاتے، غراتے رہے
ہم ضمیرِ زندگی میں جذب ہو جاتے رہے (۴۴)

ندیم نے اس نظم میں بتایا ہے کہ انسان کا ولولہ، عمل اور حوصلہ اس کی زندگی کو گل وگلزار بناتا ہے اور زندگی عمل سے عبارت ہے۔ انہیں کائنات کی ہر شے میں حرکت کا احساس ہوتا ہے۔ اس لیے وہ فطرت کے شاہ کار یعنی انسان میں بھی ایک حرکت اور جولانی دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُن کی نظریں اپنے دامن میں نور اور روشنی کو دیکھتی ہیں اور انہیں سورج کی شعاعوں میں بھی لرزشِ خفی نظر آتی ہے۔ ندیم کے نزدیک انسان اپنے اس سفر میں اب اس مقام پر پہنچ گیا ہے جس کو رقصِ نو سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی رقصِ نو میں انہیں زندگی کا حسن اور نکھار نظر آتا ہے۔ ندیم کیوں کہ انسان دوست شاعر ہیں۔ اس انسان کا تصور کرتے ہی اِن کی روح وجد میں آ جاتی ہے۔ کیوں کہ ندیم انسان کے جلال و جمال کا مغنی ہے۔ اِس حوالے سے فتح محمد ملک رقم طراز ہیں:

> ''اِس پراسرار کائنات کا سرِ اکبر انسان ہے جو مسلسل ارتقا ہے جسے ندیم نے حسنِ یزداں سے لے کر حُسنِ بتاں تک دیکھنے کے بعد خدا کے ذہن کا پارۂ عظیم قرار دیا ہے۔'' ۴۵

ندیم نہ صرف مثالی انسان کی تعریف و توصیف کو بیان کرتے ہیں بلکہ اِس انسان کے اَن گنت اور لاتعداد روپ بھی پیش کرتے ہیں۔ کیوں کہ یہی انسان اِن کی شاعری کا مرکز ومحور ہے۔ ندیم کو انسان سے بے حد محبت ہے۔ وہ انسان کو باوقار اور عظیم دیکھنا چاہتے ہیں۔ اپنے ایک انٹرویو میں ندیم نے اپنے جس قلق اور آرزو کا ذکر کیا ہے وہ ہے انسان کو اُس کا وقار واپس دلانا۔ ندیم کہتے ہیں:

> ''مجھے اگر کوئی قلق ہے تو صرف یہ کہ انسانوں کو اِن کا وقار واپس نہیں مل رہا ہے اور کرۂ ارض کی ہر حکومت انہیں بے وقار کیے جا رہی ہے۔ آرزو اگر تھی تو صرف یہ تھی کہ میں انسانی برادری کو بے احتیاج دیکھوں اور وہ کسی کی محتاج نہ ہو۔ مجھے یقین ہے کہ ایسا وقت ضرور آئے گا جب ہر انسان باوقار قرار پائے گا۔'' ۴۶

ندیم کو انسان، اس کے جوہر اور اِس کی باطنی طاقت پر زبردست یقین ہے۔ انسان سے محبت ندیم کے ہاں گہرا صوفیانہ رنگ لیے ہے۔ خدا سے اِس کی حسین ترین مخلوق سے بے اعتنائی اور بے توجہی کا شکوہ ہے کہ خدا نے جسے اتنے ناز سے بنایا، ملائک کا مسجود کیا، بہشتوں کا لاڈلا بنایا، پھر زمین پر اسے ایک عظیم مقصد کے ساتھ مبعوث

بنایا اور انسان نے خدا کی آرزو کو بدرجہ اتم پورا کیا اور زمین خدا آشنا ہوئی مگر وہی انسان زمین پر ایک کم تر مخلوق ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ ذلتیں، رسوائیاں اُٹھا رہا ہے مگر اپنے خالق کے التفات سے محروم ہے۔ اِن خیالات کا اظہار ندیم اپنی نظم ''مجاز'' میں کرتے ہیں:

اِک مٹی کا دِیا لو کو سنبھالے کب تلک
تیل بھی ختم ہے، طوفاں بھی اُمڈ آیا ہے
اے بلندی کے خدا! تُو نے بنا کر پستی
کیا فقط جذبۂ تخلیق کو بہلایا ہے؟

چھلکا پڑتا ہے ستاروں سے ترا ساغرِ شب
میری قسمت میں فقط ایک چراغِ مُردہ
کیا تجھے عرش کی خلوت کا سکوں جچتا ہے
فرش پر ہو ترا محبوب اگر آزُردہ؟ [۴۷]

ندیم انسان اور انسانی مزاج کے عاشق ہیں اور یہ صورتِ حال اِن کے مزاج کی حقیقت پسندی اور خیالات ونظریات کی پختگی پر دلالت کرتی ہے۔ ندیم کا نصب العین محبت ہے اور یہ چاہتے ہیں کہ محبت کے ذریعے نسل و رنگ کو ختم کیا جائے اور تمام انسانوں کو برابری کے حقوق ملنے چاہئیں۔ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن لکھتے ہیں:

''انسان دوستی کے گہرے جذبے کے ساتھ حقیقت یا سچائی کے اندر اُترنا اور حقیقت یا سچائی کی روح کو پانا اور اسے اپنے وجود میں جذب کر کے جمالیاتی صورت میں پیش کرنا ہی بڑی بات ہوتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے یہی کارنامہ انجام دیا ہے۔'' [۴۸]

ندیم کو بحیثیت انسان اپنی عظمت کا احساس تھا۔ اُنھوں نے کئی ایسی لافانی اور عظیم نظمیں تخلیق کی ہیں جن میں احترامِ آدمیت کا درس دیا گیا ہے۔ اس حوالے سے مقصود الٰہی شیخ اپنے مضمون ''دریا کا سمندر ہونا'' میں لکھتے ہیں:

''احترامِ آدم و آدمیت اِن کا بڑا وصف تھا۔ یہی اُنھوں نے دوسروں کو سکھایا۔ عظمتِ آدم کے حوالے سے اِن کے خیالات منفرد، خوب صورت اور پہلودار تھے۔'' [۴۹]

ندیم انسان کی عظمت کے قائل ہیں۔ اس لیے وہ انسان پر بداعتمادی کا اظہار نہیں کرتے بلکہ ان غیر انسانی اور غیر اخلاقی رویوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں جو انسان کو انسان کا دشمن بنا دیتے ہیں۔ ندیم کی خواہش ہے کہ انسان دوسرے مذہب اور دوسری تہذیبوں کے لوگوں سے بھی پیار کرے۔ کیوں کہ اگر ایک ہی عقیدے اور فکر کے لوگوں سے پیار کیا جائے تو یہ قدرتی پیار ہے۔ اِس لیے دوسروں کے ساتھ بھی انسانیت کے اِس جذبے کو پروان چڑھانا چاہیے۔ ندیم کا اپنا مضمون اِن کے اپنے انسان دوستی کے نظریے پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"سچی انسان دوستی کی شان ہی یہی ہے کہ انسان اپنی مذہبی اور تہذیبی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے دوسرے مذاہب کے پیروؤں اور دوسری تہذیبوں کے نمائندوں کے ساتھ انسانیت کی لگن محسوس کرے۔" ۵۰

معاشرے کے تضادات نے انسان کو مظلومیت کی دلدل میں اُتار دیا۔ ندیم اپنی شاعری کے ذریعے اِن تضادات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں اور انسان کو معاشرے میں اِس کا جائز اور صحیح مقام دلانے کی خواہش کرتے ہیں۔ ندیم حقیقی شاعر ہیں اور انسانیت کے لیے ایسی ہمدردی رکھتے ہیں جس کا اور کوئی جوڑ نہیں مل سکتا۔ نظم "انسانیت" میں ندیم کہتے ہیں کہ:

وہ اعتماد ہے مجھ کو سرشتِ انساں پر
کسی بھی شہر میں جاؤں، غریبِ شہر نہیں
یہی یقین ہے شیرازہ بندِ نسل و نسب
یہی یقین ہے میرا خلوص، میرا وقار
یہی یقین ہے میرا ادب، مرا مذہب
یہی طلسمِ صبا ہے، یہی ورودِ بہار

یہی یقین کہ انسان کی جبلت میں
بایں شکستہ دلی آشتی ہے، قہر نہیں
وہ اعتماد ہے مجھ کو سرشتِ انساں پر
کسی بھی شہر میں جاؤں، غریب شہر نہیں ۵۱

ندیم کی شاعری میں انسان دوستی، قدرِ خیر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اُنھوں نے انسان دوستی کے حوالے سے اپنی شاعری میں جن خیالات، جذبات واحساسات اور رویوں کا اظہار کیا ہے۔ اِسے پڑھ کر اِس کے فیض کے سرچشمے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ندیم حالات کی تلخیوں سے بدمزہ نہیں ہوتے اور نہ ہمت ہارتے ہیں۔ ندیم اپنی صلاحیتوں کا عکس دوسروں میں بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ اِس لیے صحت مند رویوں کو فروغ دینے کی خواہش کرتے ہیں۔ کائنات کو فتح کرنے اور حالات کا رُخ بدل دینے کی خواہش فطری طور پر انسان میں موجود ہے۔ ندیم اپنی شاعری کے ذریعے ان صلاحیتوں کو بیدار کرنے کی جدوجہد کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ندیم کی وسعت نظر اور مشاہدہ کا کمال ہے کہ جس کی وجہ سے ہمیں اِن کی شاعری میں ہمہ گیری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ ندیم کی شاعری کا اہم وصف ان کا نظریہ انسانیت ہے جس میں کائنات وحیات کی وسعتوں نے پناہ لی ہے۔ ندیم کو حسن وعشق کی طرح زندگی کے حقائق کا احساس بھی گاؤں اور اُس کے ماحول سے ہوتا ہے اور وہ رومان اور فطرت کی گود میں پروان چڑھتے ہوئے زندگی کے حقائق کو محسوس کرتا ہے۔

ندیم انسان کے عدم مساوات کے خلاف مسلسل جنگ لڑتے ہیں۔ اِس تصور نے انہیں انسان دوست شاعر کا اعلیٰ منصب عطا کیا ہے۔ انسان اِن کے ہاں خیر و برکت کا نمائندہ بن کر اُبھرتا ہے۔ ندیم اپنی نظموں میں انسان، زندگی اور اِس سے وابستہ مسائل پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اِن کے ہاں انسان کو نسلی اور جغرافیائی تفرقات اور تعصّبات سے الگ بنیادی انسانیت کے حوالے سے دیکھا گیا ہے۔ مجموعی طور پر وہ انسان کو اُس کے خوابوں کے حوالوں سے دیکھتے ہیں۔ آج انسان عدم تحفظ کا شکار ہے لیکن ندیم کی آواز اُسے اقدار کے تحفظ کی بشارت دے رہی ہے۔ اُنھوں نے اپنی شاہ کار نظم ''پتھر'' کی صورت میں انسانیت کے عالم گیر اخلاقی وتہذیبی زوال پر عہد آشوب قلم بند کر دیا ہے۔

ریت سے بُت نہ بنا، اے مرے اچھے فن کار
ایک لمحے کو ٹھہر، میں تجھے پتھر لا دوں
میں ترے سامنے انبار لگا دوں___ لیکن
کون سے رنگ کا پتھر ترے کام آئے گا؟

جتنے معیار ہیں اس دور کے، سب پتھر ہیں
جتنے افکار ہیں اس دور کے، سب پتھر ہیں
شعر بھی، رقص بھی، تصویر و غنا بھی پتھر
میرا الہام، ترا ذہنِ رسا بھی پتھر
اس زمانے میں تو ہر فن کا نشاں پتھر ہے
ہاتھ پتھر ہیں ترے، میری زبان پتھر ہے
ریت سے بُت نہ بنا، اے مرے اچھے فن کار ۵۲

انسان جو کہ فطرت کا شاہ کار اور معدنِ کائنات کا سب سے اَن مول ہیرا ہے۔ انسان کو اشرف المخلوقات اور خدا کا نائب تسلیم کیے بغیر اس کی ستائش ممکن نہیں۔ انسان ہی کی وجہ سے زندگی کے ہنگامے اور جوش و خروش ہے۔ حسن رضوی مرحوم کو انٹرویو دیتے ہوئے ایک سوال کے جواب میں ندیمؔ نے کہا تھا کہ:

> ''بچپن سے ہی جب استحصال کی کوئی صورت میرے سامنے آتی تو مجھے اس سے شدید کراہت اور نفرت ہوتی تھی۔ ہمارے گاؤں میں موچی، نائی، دھوبی، مراثی وغیرہ پر ہونے والے مظالم پر میں اپنے گھر بیٹھا کڑھتا رہتا تھا کہ آخر ان میں اس کے سوا اور کیا کمی ہے کہ ایک جوتا گانٹھتا ہے، ایک ہل کا پھل بناتا ہے اور ایک ہمارے بال کاٹتا ہے۔'' ۵۳

ندیمؔ غربت کا خاتمہ چاہتے ہیں اور یہ خواہش کرتے ہیں کہ مساوات، عدل و انصاف اور اعتدال و تناسب کو ہمارے معاشرے میں جگہ ملنی چاہیے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بہترین فطرت پر پیدا کیا ہے۔ اقبالؔ کے کلام میں جگہ جگہ ہمیں انسان کے خلیفۃ اللہ یا نائب الٰہی ہونے کے منصب و مقام کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ جیسا کہ نظم ''مسجد قرطبہ'' میں اقبالؔ کہتے ہیں:

ع ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کار کشا، کار ساز ۵۴

خود شناسی، خدا شناسی کا زینہ بن جاتی ہے۔ حیات و کائنات میں انسان کے اعلیٰ مرتبہ و مقام کے حوالے سے ندیمؔ نے بھی اقبال کی طرح کئی نظموں میں تفاخر اور سرخوشی کا اظہار کیا ہے۔ ندیمؔ نے اپنی نظم ''مراجعت'' میں بھی خلائی

تسخیر کے حوالے سے انسانی کامیابیوں پر فخر و انبساط کے تاثرات کو بیان کیا ہے۔

کیوں لرزنے لگے ہو ستارو
یہ تو پرواز کی ابتدا ہے
آسماں میری منزل نہیں ہے
آسماں تو خلا ہی خلا ہے
اپنی گم گشتہ جنت کو پاؤں
صرف اتنا مرا مدعا ہے
ہوشیار اے فرشتو، کہ پھر سے
ایک سجدے کا وقت آ رہا ہے ۵۵

ندیم کا تصورِ انسان، اقبال کے مردِ مومن کی بازگشت ہے۔ اِن کی شعری عظمت کے ندیم خود بھی قائل ہیں۔

ندیم کو انسان کی عظمت اور برتری کے گیت گاتے ہوئے بڑا سرور ملتا ہے۔ ان کی نظموں کا یہ بڑا دل نشیں رنگ ہے۔ انسان کی عظمت اور برتری کو اہمیت دینے اور انسان کو عظیم قرار دینے کی فکر نے اِن کی نظموں میں رَس بھر دیا ہے۔ انسان جو کہ خیر و شر کا امتزاج ہے اگر انسان شر پر قابو پا لے تو معاشرہ امن و سکون کا گہوارہ بن جاتا ہے۔ اِس لیے ندیم ایسے انسانوں کے گروہ کو تلاش کرتے ہیں جو خیر کے نمائندہ بن کر سامنے آئیں۔ کیوں کہ ہر انسان کے اندر خیر کا جذبہ موجود ہے اور انسان جلد یا بدیر اِس خیر کے عنصر کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اِس کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ انسان دوسرے انسان کو پیش آنے والے مسائل اور مشکلات کو دُور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے لیے وہ بے چین اور مضطرب نظر آتا ہے۔

جیلانی کامران اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

"بعض مقامات پر انسان اپنی روح سے بچھڑ گیا ہے اور بعض مقامات پر انسان اپنے جسم کو زندہ رکھنے کی صبر آزما کوششوں میں پریشان ہے۔۔۔ اس کیفیت نے ہر انسان کی صورتِ حال کو ہزارہا منطقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔" ۵۶

اِس صورتِ حال میں انسان کی اصل پہچان اِس بے چینی اور اضطراب سے ممکن ہوتی ہے۔ کہیں پر تو یہ صورتِ حال ہے کہ انسان اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے کوششیں کر رہا ہے اور کہیں پر انسان اپنی ہی روح سے بچھڑ گیا ہے۔ کیوں کہ انسان ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ اِس لیے ہر انسان کی بے چینی اور اس بے چینی سے چھٹکارا پانا بھی الگ ہے۔ عدل و انصاف اور حسن و خیر آغاز ہی سے ندیمؔ کے فن کی بنیادی اقدار ہیں لیکن سیاسی آزادی کی منزل کے قریب تر آ جانے کے احساس نے اِن کو عظمتِ انسان کا ممتاز مغنی بنا دیا۔ اپنی نظم ''انسان'' میں کہتے ہیں کہ:

اگر حریم بقا سے فنا ملی ہے مجھے
اِسی فنا میں بقا کی ادا ملی ہے مجھے
خدا شناس بھی ہوں، اور خود شناس بھی ہوں
خدا سے دُور بھی ہوں، اور خدا کے پاس بھی ہوں
یہاں زمیں پہ بھی تخلیق کام ہے میرا
کہ کبریائی سے منسوب نام ہے میرا
زمیں مری ہے، فضا بھی مری، خلا بھی مری
خلا مری ہے تو اقلیمِ ماورا بھی مری
خدا کے ذہن کا فن پارۂ عظیم ہوں میں
تمام دہر کا دُولھا ہوں میں، ندیمؔ ہوں میں ۵۷؎

ندیمؔ کی انسان دوستی اور انسان شناسی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک فلسفے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ندیمؔ خیر کو اہمیت دیتے ہوئے شر کی قوتوں کے خلاف جنگ لڑتے ہیں۔ ندیمؔ نے انسان کو جو تصور دیا ہے اُس میں اُن کے ذاتی مشاہدات کا بڑا عمل دخل ہے۔ ندیمؔ نے اپنے ماحول میں انسان کی مخدوش صورتِ حال کے باعث انسان اور اِس کے جوہر کو موضوعِ سخن بنایا۔ ندیمؔ نے جس ماحول میں جنم لیا، اِس میں طبقاتی کش مکش کے ساتھ انسان کی جہالت اور توہم پرستی ہر طرف موجود ہے اور اِس زبوں حالی کے باعث انسان ظلم کی چکی میں پس رہا ہے۔

فتح محمد ملک رقم طراز ہیں:

> ''فرشتوں کے اِس مسجود اور خدا کے اِس محبوب پر دیہات کے خدا(جاگیردار) کی شیطنیت سے جو بیت رہی ہے اس کی صداقت آفریں تصویریں ندیمؔ کے فنی آئینے میں منعکس ہیں۔ ندیمؔ نے اپنے انقلابی اندازِ نظر کے ساتھ جاگیرداری نظام میں طبقاتی استحصال اور نسلی استبداد ہر دو کے جیتے جاگتے مرقع پیش کیے ہیں۔'' ۵۸؎

ندیمؔ جابر و قاہر قوتوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ وہ انسان کو ایک نئے اور تازہ جہاں کا حکمران بنانا چاہتے ہیں۔ ہر قسم کے حالات میں ندیمؔ انسان کو ظلم و ستم سے بچانے کے لیے کوششیں کرتے ہیں۔ کیوں کہ اِن کی شاعری کا مرکزی نقطہ انسان دوستی ہے۔ اِس لیے وہ نیکی اور خیر کو فروغ دینے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ اِس لیے شر کو دُور کرنا اور خیر کی تمنا کرنا ان کی نظموں میں مکمل فنی اور تہذیبی رچاؤ کے ساتھ موجود ہے۔ ندیمؔ کے نزدیک زمین پر زندگی انسان کی وجہ سے موجود ہے۔ انسان اور اِس کی زندگی کی وجہ سے ہی انسان، خدا، حیات و کائنات کے مسئلوں اور رشتوں پر غور کیا جا سکتا ہے۔ اِس لیے ندیمؔ انسان اور اِس کے فن کو اہمیت دیتے ہیں اور فن کی وجہ سے انسان زندگی کی خوب صورت بنیادوں کو حاصل کرتا ہے جن کو فنونِ لطیفہ کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے۔ اِس کی وجہ سے انسان حسن اور توازن کو حاصل کر سکتا ہے، جس سے زندگی کو زندہ رہنے کے قابل بنایا جا سکتا ہے۔ ندیمؔ انسان کی عظمت اور محبت کے قائل ہیں۔ ندیمؔ کے دل کی خواہشوں اور کوششوں کی وجہ سے ہی آج ہمیں ذروں میں بھی ستارے بننے کی خواہش نظر آتی ہے۔ زمین پر انسان سے انسان کا بُعد صرف ایک صورت میں ختم ہو سکتا ہے اور وہ ہے انسان، انسان سے محبت کرے، کیوں کہ یہی اِس کا منصب ہے۔ ندیمؔ انسانی زندگی کو عشق کرنے کا بہترین وقت قرار دیتے ہیں لیکن افسوس انسان، اِس لمحے کو ضائع کر رہا ہے۔ ندیمؔ یہ محسوس کرتے ہیں کہ انسان ایک دوسرے سے کدورت کا شدید جذبہ رکھنے لگا ہے۔ انسان اِس قدر جذباتی ہو گیا ہے کہ معمولی باتوں پر بھی جنگ چھڑ جاتی ہے۔ ندیمؔ بتاتے ہیں کہ انسان کو انسان سے اس قدر نفرت ہو گئی ہے کہ اب ایک دن وہ خود اپنی تباہی کا باعث بنے گا۔ ندیمؔ اپنی نظم ''عشق کرو'' میں یہ آرزو کرتے ہیں:

اتنی نفرت بھی نہ ہوؤ کہ قیامت کاٹو
عشق کر لو، کہ یہی عشق ہے اب شرطِ بقا

پتھروں نے اِسی قوت سے اُبھارے کہسار
یہی قوت ہے سمندر، یہی قوت صحرا
اِسی قوت سے ہے مربوط ستاروں کا نظام
شاخ گل ہے اسی قوت کے سہارے گلنار
یہی قوت ہے توازن، یہی قوت ہے خدا
آج ہو جائے جو انسان کو انسان سے پیار
چار سُو ایک تبسم کا ہو عالم طاری
صحنِ گلشن میں بدل جائے یہ دھرتی ساری
توپ ہو روئے زمیں پر، نہ فضا میں بم بار

لاکھ طوفان اُٹھیں، لاکھ عناصر گرجیں
عشق چاہے تو شجر کیا، کوئی پتا نہ ہلے
آدمیت کا جو منصب ہے، اسے پہچانو
اِس سے بہتر کوئی لمحہ تمھیں شاید ہی ملے
عشق کرنے کا یہی وقت ہے، اے انسانو ؁۵۹

ندیمؔ جو کہ انسان بھی ہیں اور شاعر بھی۔ ان کا دل دوسرے انسان کے لیے تڑپتا ہے کیوں کہ اِن کے دل میں دوسروں کے لیے جگہ ہے۔ اِن کو ساری دنیا کے انسانوں سے ہمدردی اور محبت ہے۔ اِن کی محبت میں نسل اور ذات پات کو کوئی دخل نہیں۔ وہ ان کے دکھوں پر تڑپتے ہیں۔ سماجی جبر وظلم اور ناانصافیوں اور محرومیوں کا اِن کے دل پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ اِن کی نظموں میں انسان سے بے پایاں محبت کھل کر سامنے آتی ہے۔ ندیمؔ جب خدا کے بندوں کو اقتدار کے ہاتھوں ذلت ورسوائی کی پستیوں میں بھٹکتا دیکھتے ہیں تو تڑپ اُٹھتے ہیں اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ وہی انسان ہے جو خدا کے ذہن کا عظیم فن پارہ ہے۔ وہ انسان جسے فرشتوں نے سجدہ کیا اور وہ زمین پر خدا کا نائب ہے۔ ان کی دُکھی انسانیت سے ہمدردی پرستش کا گہرا رنگ لیے ہے۔ ندیمؔ انسانیت کی حمایت میں آواز بلند کر کے نہ صرف انقلابی شعور کا اظہار کرتے ہیں بلکہ خدا کی عبادت کا حق بھی ادا کرتے ہیں۔ ندیمؔ انسان کی

چاند کی طرف پرواز دیکھ کر کہتے ہیں کہ انسان کے ظہور کا وقت قریب آن پہنچا ہے۔

ندیم نے اپنی نظموں جن میں ''جدید انسان''، ''منفیت کا منشور''، ''بیسویں صدی کا انسان'' اور ''بیسویں صدی کے نصف آخر کا انسان'' شامل ہیں، ان میں ندیم انسان کی تسخیر اور فطرت کے تباہ کن اثرات کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان حسن اور محبت سے خالی ہے اور ترقی کی دوڑ میں آگے تو بڑھتا ہے لیکن اس ترقی کی بھینٹ اِس کے اقدار چڑھ رہے ہیں۔ ان کی نظر جب معاشرتی حقائق پر پڑتی ہے تو انہیں احساس ہوتا ہے کہ غم اور دُکھ تو ہر دل کا مقدر ہے۔ اُنھوں نے کیوں کہ غربت اور افلاس کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کی سفاکی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، اِس لیے ندیم سچے انسان دوست کی طرح اِس سفاکانہ نظام کے خلاف سینہ سپر ہو گئے۔ اِن مظلوم انسانوں کے دُکھ درد بانٹنا ندیم کا شیوہ ہے۔ ان کے نزدیک خدا نے اِس انسان کو زبان، باشعور ذہن، ضمیر اور قوتِ ارادی دی۔ اس سے اِن کے اندر انسان کی عظمت کا احساس بڑھتا گیا، اِس سے اِن کی شاعری میں تاثیر پیدا ہوئی جو کہ اِن کے درد انسانیت کی دین ہے۔ ندیم انسانی عظمت کے مبلغ ہونے کی وجہ سے استحصالِ اجرت اور طبقاتی کش مکش کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ ندیم کی خواہش تھی کہ ایسی جھونپڑیاں جہاں روشنی نہیں ہے، وہاں چراغ روشن ہو۔ اِس لیے ندیم ظلم کی چکی میں پستی ہوئی انسانیت کو انقلاب کا پیغام دیتے ہیں۔

خورشید بیگ لکھتے ہیں کہ:

> ''ریت کے محلات بنا کر انسانیت کو انقلاب سے شناسا کرنے والوں کو آپ (قاسمی) نے اصولِ تشکیلات عطا کیا کہ عمرانیاتی قوانین کو ٹھوس بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ عظمتِ ابنِ آدم کو تسلیم کیا جائے۔ جبر و استحصال کی خون ریزی سے بچا جائے۔'' ۶۰

ندیم ہر انسان کے اندر کا دُکھ جانتے ہیں۔ انسانیت اِن کے نزدیک بنیادی خوبی ہے کیوں کہ انسان بنیادی طور پر نیک اور اچھا ہے۔ اِس لیے ندیم کسی بھی شخص کے اندر کا انسان دیکھتے ہیں:

بقول اصغر ندیم سید:

> ''احمد ندیم قاسمی نے ہمیشہ اپنی شاعری کے ذریعے احترامِ آدمیت کا درس دیا اور ساری زندگی انسانوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کی۔'' ۶۱

ندیم اپنی نظم ''بیسویں صدی کا انسان'' میں کہتے ہیں کہ:

مجھے نہ توڑو
کہ میں گلِ تر سہی مگر اوس کی بجائے لہو میں تر ہوں
مجھے نہ مارو
میں زندگی کے جمال اور گہما گہمیوں کا پیام بر ہوں
مجھے بچاؤ ___ کہ میں زمیں ہوں
کروڑوں کرّوں کی کائناتِ بسیط میں صرف میں ہی ہوں جو
خدا کا گھر ہوں! ۶۲

ندیم نے اپنی شاعری کے ذریعے انصاف اور مساوات کا درس دیا اور طبقاتی ناہمواری، سامراجی تشدد، آمرانہ طرزِ عمل اور انسانیت اور انسان دشمن عوامل کی ہر سطح پر مخالفت کی۔ انہیں جہاں کہیں بھی آمر اور بالائی طبقات کے ہاتھوں مظلوم اور پست طبقات کا استحصال ہوتا نظر آیا۔ ندیم نے اس کے لیے اپنا قلم اُٹھایا اور یہ قلم مزاحمتی شمشیر بن کر اُٹھا اور ہمیشہ وحشیانہ پن اور درندگی کے خاتمہ کے لیے اور صحیح معنوں میں تہذیب یافتہ معاشرے کے قیام و دوام کے لیے جاری رہا۔

ندیم کی ظلم و زیادتی اور استحصال کی ہر شکل کو رد کرنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ بنیادی طور پر حساس اور سادہ انسان ہیں اور سچی انسانیت کے پیکر ہیں۔ ندیم نے انسان کو عزت و مرتبہ دلانے کے لیے ہمیشہ کوششیں کیں۔ ندیم اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

''ترقی پسند تحریک کے بنیادی مقاصد میں انسان کا کھویا ہوا وقار بحال کرنا، بنیادی انسانی حقوق کے ساتھ بدسلوکی کو ختم کرنا اور استحصال سے پاک معاشرہ قائم کرنا شامل تھا۔'' ۶۳

ندیم نے ہر اُس شخص، قوم اور ملک کے خلاف مزاحمت کی ہے جو اُسے ترقی پسند تحریک کے بنیادی مقاصد کے حصول میں رکاوٹ محسوس ہوتے ہیں۔ ندیم کی اس انسان دوستی اور انصاف پسند شاعر کے حوالے سے فتح محمد ملک نے بجا طور پر کہا:

''ندیم کے ہاں آپ کو آدمی کہیں تو مادی اور روحانی محکومی کی زنجیروں میں محبوس دکھائی دیتا ہے، کہیں اِن زنجیروں کو توڑنے میں مصروف۔'' ۶۴

ندیم کے ہاں ہر قسم کے ظلم و جبر کے خلاف کہیں احتجاج ملتا ہے اور کہیں انقلابی اور مزاحمتی جذبات کی بڑھتی ہوئی شدت۔ ندیم معاشرتی حقائق اور تلخیوں کا اظہار کر کے نہ صرف خاص فضا پیدا کرتے ہیں بلکہ احساسات و جذبات کی شدت سے خود کو بھی مصائب و مسائل میں گھرا ہوا ظاہر کرتے ہیں اور اپنے آپ کو بھی اِن مسائل زدہ لوگوں کی صف میں شامل کرتے ہیں۔ اِس حوالے سے فرزانہ سید رقم طراز ہیں:

> ''احمد ندیم قاسمی اپنے دل نشین لہجے اور موثر بیان کے ذریعے اپنی شاعری میں بھی معاشرتی اونچ نیچ، زندگی کی تلخیوں، محرومیوں، ناآسودگیوں اور ناکامیوں کو موضوعِ سخن بناتے ہیں۔'' ۶۵

ندیم زندگی کی ناآسودگیوں اور اِس کی پریشانیوں کا احساس رکھتے ہیں۔ زندگی سے والہانہ وابستگی ان حقائق کا شعور رکھنے کے باوجود انہیں زندگی سے بیزار نہیں کرتی بلکہ ایسی صورت میں تو ندیم زندگی سے اور قریب ہو جاتے ہیں۔ زندگی کی مسرتوں اور اس کی دل آویزیوں کا احساس، ندیم کی شاعری کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ اِس حوالے سے ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

> ''ندیم صاحب ہر فرد کے لیے زندگی کی اِن مسرتوں کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اسی لیے وہ طبقاتی تفریق کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ وہ تو اِن مسرتوں کی صحیح تقسیم چاہتے ہیں۔ ان کے خیال میں تو ہر انسان کو اِن مسرتوں سے سینہ بھر لینے کا موقع ملنا چاہیے۔'' ۶۶

ندیم مغرب کی انسان دوستی کی تحریک سے متاثر ہوئے مگر ان کی انسان دوستی، اِن کے اپنے عقیدے، اپنی مٹی کے زیرِ اثر زیادہ ہے۔ سارتر لکھتا ہے کہ:

> ''انسان کی معاشی حیثیت بھی اِس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ پیدائشی اور معاشی خرابیوں کے باوجود ہر انسان کو ایسے ذرائع دستیاب ہیں کہ وہ اُبھر سکے اور اگر وہ اِن ذرائع کو صحیح طور پر استعمال نہیں کرتا تو اس کا ذمہ دار وہ خود ہے۔ بیرونی عوامل زندگی کو نہ سنوارتے ہیں نہ بگاڑتے ہیں۔ انسان جس زاویے سے انہیں دیکھتا ہے وہی اس کی زندگی کو تعمیر کرتا ہے۔'' ۶۷

لیکن ندیم اِس نظریے کو حتمی نہیں مانتے۔

ندیمؔ نے جہاں شرفِ انسانیت اور نوعِ انسان کی یک دلی کے تصورات پیش کیے ہیں۔ وہاں اُنھوں نے مظلومیٔ نسواں پر بھی آواز بلند کی۔ جاگیردارانہ ماحول میں گاؤں کی عورت مشقت کرنے کے باوجود صلہ سے محروم ہوتی ہے۔ اِس کے مسائل میں سب سے اہم مسئلہ حسن کی پامالی اور تاراجی ہے۔ جاگیردار، سرمایہ دار، پیر سب کے سب انسانیت کی پامالی کے اِس المیے کے خوں خوار کردار ہیں۔ گاؤں کی لڑکی کی جب شادی کا مرحلہ آتا ہے تو اِن کی شادی تو برائے نام ہوتی ہے اُن کے تو بس ہاتھ پیلے کر دیے جاتے ہیں جس انداز میں اُن کی شادی ہوتی ہے اُس کی حقیقت آفریں جھلک اِن کی نظم ''سہاگن بیوہ'' میں نظر آتی ہے۔

نہ بزرگ باپ سے کچھ گلہ، نہ غریب ماں سے ملال ہے
نہ کسی کے رحم کی آرزو، نہ دراز دستِ سوال ہے
مری زندگی کے نصیب میں جو خزاں ہی تھی تو خزاں سہی
مجھے آہ و نالہ سے کام ہے، جو یہاں نہیں تو وہاں سہی
جو فلک پہ بیٹھے ہوئے خدا کی یہی رضا ہے تو شکر ہے
جو عدالتِ مہ و سال کا یہی فیصلہ ہے تو شکر ہے
مگر اِک عجیب کریدسی مرے دل میں رہتی ہے پرفشاں
کہ مرا مقدرِ غم نشاں، مجھے لے چلے گا کہاں کہاں
مرے لالہ زارِ شباب میں ابھی اور آندھیاں آئیں گی
مرے آسمانِ خیال پر ابھی اور بدلیاں چھائیں گی
مرے مرغزارِ حیات پر کئی بجلیوں کی نگاہ ہے
مرا احتجاج بھی کفر ہے، مرا بولنا بھی گناہ ہے
مجھے اپنے حال پہ چھوڑ دو، مری غم نصیب سہیلیو!
مری جیتی جاگتی موت پر نہ کڑھو، غریب سہیلیو
جو تمام باغ اُجڑ گیا تو کلی کا رنج فضول ہے
جو تمھیں بھی کرنا ہے ایک دن وہ سفر مجھے بھی قبول ہے ۶۸

خدا کی مخلوق کو ظلم سے مکمل نجات نہیں دلائی جا سکتی۔ جہاں ایسا نظام ہو، جس میں درویشی اور سلطانی دونوں عیار اور

مکار ہیں۔ ندیمؔ کے دل و دماغ میں بار بار یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِس ظلم سے کس طرح نجات دلائی جائے لیکن اِن کے ہاں عورت کی مظلومیت کے نظارے دیکھ کر یہ سوال انقلابی آرزو مندی کا ترجمان بن جاتا ہے۔ ایسی صورتِ حال جبر وظلم کے مروجہ نظام نے پیدا کر رکھی ہے۔ جب تک یہ نظام قائم رہے گا، حسن تاراج اور پامال ہوتا رہے گا اور انسانیت کی تذلیل ہوتی رہے گی۔

ندیمؔ کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ پاکستان کے محبِ وطن باشعور اہلِ قلم ہیں۔ پاکستان سے گہری وابستگی اِن کی نظموں میں نمایاں طور پر سامنے آتی ہے۔ ندیمؔ کے نزدیک جو شخص اپنی قوم اور وطن سے محبت نہیں کرتا وہ کسی سے بھی محبت نہیں کرتا اور نہ ہی اسے عدل و انصاف کا شعور حاصل ہو سکتا ہے۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان کی آزادی سے پہلے ندیمؔ آزادی کی آہٹ سن کر خوش تو ہوئے لیکن اِن کے دل میں ابھی بھی خطرہ تھا اور وہ شکوک و ابہام میں مبتلا رہتے تھے۔ اپنی نظم ''کھری کھری'' میں ندیمؔ اِس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ ملک جلد سے جلد آزاد ہو جائے تاکہ سب لوگ سکھ کا سانس لے سکیں۔ پاکستان سے یہی گہری محبت اِن کی اِس نظم میں بھی نظر آتی ہے جو اِن کے شعری مجموعے ''لوحِ خاک'' میں ''وطن کے لیے ایک دعا'' کے عنوان سے شامل ہے اور ہمارے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے:

خدا کرے کہ مری ارضِ پاک پر اُترے
وہ فصلِ گل، جسے اندیشۂ زوال نہ ہو
یہاں جو پھول کھلے، وہ کھلا رہے صدیوں
یہاں خزاں کو گزرنے کی بھی مجال نہ ہو
یہاں جو سبزہ اُگے، وہ ہمیشہ سبز رہے
اور ایسا سبز، کہ جس کی کوئی مثال نہ ہو
گھنی گھٹائیں یہاں ایسی بارشیں برسائیں
کہ پتھروں سے بھی، روئیدگی محال نہ ہو
خدا کرے___ کہ نہ خم ہو سرِ وقارِ وطن
اور اِس کے حُسن کو تشویشِ ماہ و سال نہ ہو

ہر ایک فرد ہو تہذیب و فن کا اوجِ کمال
کوئی ملول نہ ہو، کوئی خستہ حال نہ ہو
خدا کرے ___ کہ مرے اک بھی ہم وطن کے لیے
حیات جرم نہ ہو، زندگی وبال نہ ہو
خدا کرے ___ کہ مری ارضِ پاک پر اُترے
وہ فصلِ گُل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو ۶۹

ندیم اس زمین پر خصوصاً اپنے وطن میں زندگی کو جس طرح دیکھنے کے خواہش مند تھے، اُس کا اظہار اُن کی اِس نظم میں بھرپور طریقے سے ہوا ہے۔ ندیم سچے پاکستانی اور محبِ وطن شاعر کی مانند اپنے وطنِ عزیز پر شادمانی اور خوش حالی کے سورج کو تابندہ دیکھنے کی خواہش کرتے ہیں اور اِس معاملے میں اُنھوں نے کبھی بھی کسی سے سمجھوتہ نہ کیا۔ ندیم کی شعری واردات کی نہایت اہم جہت پاکستانیت ہے۔ اِن کے نزدیک پاکستان محض زمین کا ایک ٹکڑا نہیں ہے بلکہ یہ اُن کے خوابوں کی علامت ہے۔ اس کے ذریعے ندیم نہ صرف اپنے فکری و تہذیبی تشخص کی سلامتی چاہتا ہے بلکہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر حسن و محبت کے سپنوں کی تعبیر اور روشن امکانات کا ولولہ انگیز یقین رکھتا ہے۔ ندیم پر سوزِ وطن کا رنگ اِس قدر گہرا ہے کہ تمام تر رنگ اسی ایک رنگ کے عکس معلوم ہوتے ہیں اور یہ رنگ ان کی سچی، گہری اور رچی ہوئی پاکستانیت کا رنگ ہے اور ان کی شعری شخصیت کا حصہ ہے۔ پاکستان سے اِس گہری اور والہانہ محبت کا اظہار اِن کی شاعری میں جا بجا ہوا ہے۔ پاکستان کے یومِ آزادی کے حوالے سے اِس کے ذوق وشوق اور جذبہ و جوش کی ایک جھلک اِن کی نظم ''جشنِ چراغاں'' میں نظر آتی ہے:

مجھ کو اِس دیس کی ایک ایک گلی پیاری ہے
مجھ پہ اِس دیس کا احسان بہت بھاری ہے
اس کی آغوش میں پل بڑھ کے جوانی پائی
اس مکتب سے یہ اعجاز بیانی پائی
اس زمیں پر میں اندھیروں کو نہ جمنے دوں گا
اپنی دیرینہ اُڑانوں کو نہ تھمنے دوں گا

میں تجلی کا پیامی ہوں، جلاؤ شمعیں
آج ہر طاق پہ، ہر گھر میں سجاؤ شمعیں ۷۰

قیامِ پاکستان کے بعد ہمارے ہاں قومی احساس کے بتدریج زوال کا جیتا جاگتا شعور ندیم کی شاعری میں کارفرما ہے۔ ۱۹۵۲ء میں ہی ندیم نے اپنی نظم ''غمِ وطن'' میں یہ سوال اُٹھایا تھا کہ:

جس کے دانتوں میں مری قوم کے ریشے ہیں ابھی
وہی سفاک مرے دیس کا ہمدم کیوں ہو
اس کے سائے میں جب انسان کو دَم لینا ہے
خونِ انساں ہی میں ڈوبا ہوا پرچم کیوں ہو
کٹ کے بھی جھک نہ سکا جو سرِ پندارِ وطن
کسی سلطان کے دربار میں اب خم کیوں ہو ۷۱

ندیم نے بڑی جرات، بے باکی اور حوصلہ مندی کے ساتھ یہ نظم لکھی اور اِس نے لوگوں کو تذبذب کی دلدل سے نکال کر پاکستانی ہونا سکھایا۔ ندیم نے جب اِس طرح کی نظمیں لکھ کر سیاست دانوں سے محبت مانگی تو اِن کو پابندِ سلاسل کر کے زنداں میں ڈال دیا گیا۔

۶ر ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہونے والی پاک بھارت جنگ کے حوالے سے تمام پاکستانی شاعروں میں خاص طور پر ندیم نے بہت کچھ لکھا اور ہنگامی نوعیت کی شاعری میں بھی اعلیٰ ادبی قدر و قیمت کی حامل اتنی تخلیقات سامنے آئیں جو ہمارے شعری ادب کا سرمایہ بن گئیں۔ ندیم نے وطن عزیز میں رونما ہونے والے تمام اہم واقعات کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کر کے ہمیشہ اپنے پرخلوص اور دردمندانہ سروکار کا ثبوت دیا۔ ندیم اپنی نظم ''چھ ستمبر'' میں کہتے ہیں:

چاند اُس رات بھی نکلا تھا، مگر اُس کا وجود
اتنا خوں رنگ تھا، جیسے کسی معصوم کی لاش
تارے اُس رات بھی چمکے تھے، مگر اِس ڈھب سے
جیسے کٹ جائے کوئی جسم حسیں، قاش بہ قاش

اتنی بے چین تھی اُس رات، مہک پھولوں کی
جیسے ماں، جس کو ہو کھوئے ہوئے بچے کی تلاش
اتنے بیدار زمانے میں یہ سازش بھری رات
میری تاریخ کے سینے پہ اُتر آئی تھی
اپنی سنگینوں میں اُس رات کی سفاک سپاہ
دودھ پیتے ہوئے بچوں کو پرو لائی تھی

آخری بار اندھیرے کے پجاری سن لیں
میں سحر ہوں، میں اُجالا ہوں، حقیقت ہوں میں
میں محبت کا تو دیتا ہوں محبت سے جواب
لیکن اعدا کے لیے قہر و قیامت ہوں میں
میرا دشمن مجھے للکار کے جائے گا کہاں
خاک کا طیش ہوں افلاک کی دہشت ہوں میں ۲ے

سوزِ وطن کا رنگ ستمبر ۱۹۶۵ء سے مسلسل گہرا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ۱۹۷۱ء کے المیے کے حوالے سے اُنھوں نے اپنی نظموں امریکا کے ساتھ ساتھ روس کے پاکستان دشمن کردار کی بھی مذمت کی اور سقوطِ ڈھاکا کی خونی رات کو سوزِ وطن کا یہ رنگ خون کے رنگ میں بدل گیا تھا۔ اِس طرح ندیمؔ کے ہاں قومیت کا یہ احساس ۱۹۶۵ء کے بعد بڑھتا گیا اور پھر ۱۹۷۱ء میں سقوطِ ڈھاکا کے وقت یہ احساس ایک کرب میں تبدیل ہو گیا۔ کرب اِس امر پر کہ اب پاکستان آدھا رہ گیا۔ ایسے میں ندیمؔ جیسا رجائیت پسند بھی بے اختیار رو پڑا۔ اپنی نظم ''میں روتا ہوں'' میں اِس سانحے پر وطن کے حضور اپنے اشعار میں خون کے آنسوؤں کا نذرانہ پیش کیا:

میں روتا ہوں
اے ارضِ وطن
میں روتا ہوں
میں نکہتِ گل کا رسیا تھا، اب مجھ پر یہ اُفتاد پڑی
پھولوں سے بچ کر چلتا ہوں، کانٹوں کو دل میں چبھوتا ہوں

میں روتا ہوں
اے ارضِ وطن
میں روتا ہوں
آ، میری جلد اُتار کے اپنے سارے زخم رفو کر لے
جب تک، اے ماں!
اے میرے جیسے کتنے کروڑوں کی باعظمت، باعزت
باعصمت ماں!
تیرے دامانِ دریدہ کو میں آبِ سرشکِ غیرت وغم میں
دھوتا ہوں
میں روتا ہوں
اے ارضِ وطن
میں روتا ہوں ۳ے

یہ نظم ندیم نے ۱۷؍دسمبر ۱۹۷۱ء کی رات سقوطِ ڈھاکا کی خبر سنتے ہی کہی اور پھر اُس کے بعد کافی مدت تک اپنی نظموں میں اس المیے کی یاد میں سلگتے نظر آتے ہیں۔ ''ایک ہی رنگ ہے''، ''تتلی''، ''سقوط کے بعد''، ''اور باقی ہے''، ''دوستو آؤ'' اور ''اگر ہے جذبۂ تعمیر زندہ'' وغیرہ جیسی نظموں میں واضح محسوس ہوتا ہے کہ اِس سانحے پر ندیم کے احساسات کو کس طرح جہنم سے گزرنا پڑا۔ سقوط کے بعد لکھی جانے والی نظموں میں ندیم کبھی تو قائداعظم کو مخاطب کر کے روتے ہیں اور کبھی ارضِ پاک کو پکار کر اپنے کرب کا اظہار کرتے ہیں۔ ندیم کا سقوطِ ڈھاکا کے المیے پر شدید کرب، دُکھ اور غم کی شدت اور اچانک پن کا احساس اِس بات کا غماز ہے کہ وہ پاکستان سے ٹوٹ کر پیار کرتے ہیں۔ اقبال اور قائداعظم کے خواب پاکستانی عوام کے سینوں میں دفن رہے اور ہمارے حکمران بھارت کے سامنے قدم بہ قدم پسپائی کی راہ پر گامزن رہے جس کے نتیجے میں قومی احساس کا زوال قومی احساس کے فقدان کا روپ دھار گیا۔ اِس کربناک اور الم ناک صورتِ حال کی بہترین تصویر کشی ندیم کی نظم ''کھنڈر'' اور ''صفر'' میں کی گئی ہے۔ نظم ''کھنڈر'' میں کہتے ہیں:

یہ میری تاریخ کا کھنڈر ہے
یہ میرے رہوارِ برق پیکر کی ہڈیاں ہیں

یہ میری تلوار ہے جو تنکا بنی پڑی ہے
یہ ڈھال ہے جس پہ پاؤں رکھ دو تو خشک پتے
کے ٹوٹنے کی پکار سن لو!
یہ میرے پرچم کی دھجیاں ہیں
یہ میری قدروں کی کرچیاں ہیں
یہ میرے معیار ہیں، جو پتھر بنے پڑے ہیں
یہ میرے افکار ہیں، جنھیں عنکوت نے
اپنے تانے بانے کی کھونٹیاں سی
بنا لیا ہے!
یہ ٹوٹتی چھت کو سالہا سال سے سنبھالے ہوئے جو
اِک ناتواں ستوں ایستادہ ہے
یہ مری اَنا ہے [۴۳]

اِن حالات میں ندیم جیسا پراُمید شخص ریزہ ریزہ ہو گیا۔ ندیم اپنی ذاتی زندگی اور شاعری میں جی بھر کر روئے۔ سقوطِ ڈھاکا کے بعد ندیم نے ''نامناسب'' اور ''عشق کے امتحان'' میں بھی طنزیہ لب ولہجہ اپنایا۔ اس المیے کے بعد بنگلہ دیش کے مہاجر کیمپوں میں زندگی گزارنے والے بہاری پاکستانیوں پر عالمی ریڈکراس والوں نے پابندی عائد کر دی کہ وہ ۲۵ الفاظ سے زیادہ کا خط نہیں لکھ سکتے۔ وہ لوگ جو اپنے ہی ملک میں اپنے ہم وطنوں کے ہاتھوں ذہنی اور جسمانی عذاب کی اِس انتہا سے گزر چکے تھے اور اب انتہائی بے بسی اور بے چارگی کی زندگی گزار رہے تھے، اِن پر یہ پابندی ندیم نے دل کی گہرائیوں تک محسوس کی اور پھر ان ستم زدگان کے دُکھ میں شریک ہونے اور اُن کے جذبات کی نمائندگی کرنے کے لیے اُنھوں نے ایسی مختصر نظمیں لکھیں جو صرف ۲۵، ۲۵ الفاظ پر مشتمل تھیں۔ یہ نظمیں جہاں اِن پناہ گزینوں کے کرب کا بے پناہ اظہار کرتی ہیں، وہاں ہیئتی لحاظ سے بھی بالکل ایک نیا تجربہ ہیں۔ ایک نظم میں لکھتے ہیں:

بھیا جب تم مجھ کو لینے آنا
اُردو کا اِک لفظ نہ کہنا

چپکے رہنا
مجبوراً کچھ کہنا پڑے تو اِتنا
"میں گونگا ہوں"

(۲۵الفاظ) ۷۵

ندؔیم کے اِس مسلسل رونے کے تخلیقی عمل نے انہیں ان کی رجائیت اور اُمید پھر لوٹا دی اور اُنھوں نے اپنی کئی نظموں میں اپنے ہم وطنوں کو ۱۹۷۱ء کی تباہی سے ایک نئے مستقبل کی تعمیر کی دعوت دینے لگے۔ محنت اور لگن سے جینے یا باعزت موت مر جانے کی تلقین کرنے لگے۔ یہ ندؔیم کی ناقابلِ شکست رجائیت کا کمال ہے کہ غم اندوہ کے اتنے سیاہ بادلوں میں بھی وہ آفتابِ اُمید کی جھلک دکھائے بغیر نہیں رہتا اور اہلِ وطن کو حوصلہ دیتے ہیں۔ ندؔیم ان حالات میں خدا سے بھی مخاطب رہے اور ہم وطنوں کو بھی رجائیت کا پیغام دیتے رہے۔ اپنی نظم "پیش گوئی" اور "اُمید کی کرن" میں اِن کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ آندھیاں اور طوفان ہمیشہ نہیں رہتے۔ رات کی سیاسی چھٹ جاتی ہے، صبح ضرور نمودار ہوتی ہے۔ اُداسیوں کے بادل چھٹ جائیں گے۔ نظم "پیش گوئی" میں کہتے ہیں:

اب تو دھوپ نکلی ہے، اب تو برف پگھلے گی
اب تو کوہساروں کے خدوخال جاگیں گے
آندھیاں نہ اُڈیں گی، شعر وفن کے میداں میں
اب خیال نکھریں گے، اب غزال جاگیں گے ۷۶

کشمیر ایک ایسا مسئلہ ہے جو مدتوں سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان وجہ تنازع ہے۔ اس مسئلے پر سرحد کے دونوں طرف نظریاتی طور پر شدید اختلاف پایا جاتا ہے اور وہ سیاست دان ہوں یا ادیب یا دانش ور، ہر حلقے میں نظریاتی اختلاف موجود ہے۔ خصوصاً ہندوستانی حلقوں کی طرف یہ شدت زیادہ نظر آتی ہے کہ وہ ایک غلط موقف اختیار کرنے کے باوجود پاکستان پر الزام تراشی کرتے ہیں۔ ایسے میں کبھی کبھی ہندوستانی ادیب کشمیر کے متعلق ایسی باتیں کرتے ہیں کہ پاکستانی قوم کا خون کھول اُٹھتا ہے اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کیا اب دنیا سے دیانت اور انصاف کا بالکل ہی جنازہ اُٹھ چکا ہے کہ لوگ اس طرح ڈنکے کی چوٹ پر جھوٹ بول کر اپنی

سچائی اور معصومیت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ندیم جب کوئی ایسی بات سنتے ہیں تو انہیں بھی ان ہندوستانیوں پر غصہ آتا ہے۔ قائداعظم نے کشمیر کو پاکستان کی شہ رگ قرار دیا ہے۔ اس کی معنوی گہرائی تک پہنچنے کے لیے ندیم نے جس جس طرح تحریکِ آزادیٔ کشمیر کو اپنے فن کا موضوع بنایا، اقوامِ متحدہ نے کردار کو بے نقاب کیا اور پاکستانی موقف کو اُبھارا ہے، اس سے بھی اس کی بے مثال پاکستانیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ نظم ''کشمیر'' میں ندیم کہتے ہیں:

پھیلا ہوا ہاتھ برہمن کا
اس چاند کا مستقل گہن ہے
جلتے ہوئے گھر چھنے ہوئے کھیت
ہر شخص وطن میں بے وطن ہے
سنتے ہیں سمندروں کے اُس پار
اقوام کی ایک انجمن ہے
آج اس کے اصول کے مطابق
ظالم ہے وہی جو خستہ تن ہے
آج اس کی بلند مسندوں پر
ہر چور کے ہاتھ میں کفن ہے
سچ کہتی ہیں سب غریب قومیں
یہ بزم بھی بزمِ اہرمن ہے ۷۷

کشمیر کا موضوع ایسا ہے کہ ندیم کے احساس کے ساتھ گندھا ہوا ہے۔ اپنے وطن سے حد درجہ محبت کرنے والا انسان بھلا اپنے ملک کی شہ رگ سے رشتہ کیسے منقطع کر سکتا ہے۔ دنیا بھر کی تحریکِ آزادی کو محبت کی نگاہ سے دیکھنے والا شاعر کشمیر کی تحریکِ آزادی سے کیوں قلبی تعلق استوار نہ کرے، اُنھوں نے کشمیر کی جدوجہد کے خلاف بولنے والے ہندوستانی ادیبوں کے خلاف جہاں پاکستانی قوم کے احساسات کی ترجمانی کی، وہاں اپنی شاعری میں بھی کشمیر کے متعلق اپنے جذبات کو پیش کیا۔

پاکستان کے حکمرانوں نے اپنے تعیش اور مفادات کی خاطر وطنِ عزیز کو معاشی اعتبار سے کھوکھلا کر کے

رکھ دیا۔ بجائے اِس کے اپنی مدد آپ کے اصول کے تحت زندہ رہتے ہمیں دوسروں کا محتاج بن کر جینے پر مجبور کر دیا گیا۔ اِس ملک میں جو بھی برسرِ اقتدار آیا، اِس نے اس ملک سے غربت ختم کرنے اور کشکول توڑ دینے کے دعوے تو بہت کیے لیکن عملاً کچھ بھی نہ کیا اور یہ سب دعوے کے دعوے ہی رہ گئے اور ملک پہلے سے بھی زیادہ مقروض ہو گیا اور اِن صاحبِ اقتدار نے اپنی غیرت اور عزت کو گروی رکھ کر امریکی امداد حاصل کرنے کے لیے کوششیں کیں۔ ندیم نے ان بے ضمیر اور بے حس حکمرانوں کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا اور ان کے ہاں یہ موضوع متنوع پیرائے میں آیا ہے۔ اپنی نظم ''بھیک'' میں ندیم نے شدتِ کرب اور دُکھ کے ساتھ حکمرانوں کے گھناؤنے کردار پر تنقید کی ہے:

تم گداگر کے گداگر ہی رہے
تم نے کشکول تہ جامہ بانات چھپا رکھا تھا
اور چہرے پہ انا تھی
جو ہمیشہ کی طرح جھوٹی تھی
وہ یہ کہتی ہوئی لگتی تھی کہ ہم بھیک نہیں مانگیں گے
یعنی مر جائیں گے، لیکن کسی منعم کے درِ زر پہ نہ دستک دیں گے
یہ جو گرتے ہوئے سکوں کی کھنک چار طرف گونجی ہے
یہ شنیدہ ہے کئی برسوں کی
اور کشکول کا لہجہ بھی وہی ہے جو ہمیں ازبر ہے
لاکھ انکار کرو، لاکھ بہانے ڈھونڈو
تم گداگر کے گداگر ہی رہے ۸ے

اِن لوگوں کا عزت اور غیرت کی زندگی پر ایمان اُٹھ چکا ہے۔ ندیم نے بڑی دل سوزی اور دُکھ کے ساتھ خودی کی موت کے بھیانک اثرات کا جائزہ لیا ہے اور اِن کی اپنی نظموں ''مجھے تلاش کرو'' اور ''نفی'' میں اِس المیہ کو بیان کیا ہے۔

آزادی کے بعد ندیم کی تخلیقی زندگی میں پابندی اظہار ایک بہت بڑا چیلنج بن کر سامنے آیا۔ ندیم جو کہ حق گوئی اور بے باکی کو انسان کا بنیادی حق مانتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے حکمرانوں سے ڈرنے کی بجائے ان کی

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی۔ ندیم کو اس آزادی رائے پر دکھ، تکلیف، تنہائی اور رنج و الم کا سامنا کرنا پڑا لیکن یہ ان کو آزادی تحریر سے نہ روک سکے بلکہ اس نے ان کی اس آزادی عمل کو اور بھی توانا بنا دیا۔ کیوں کہ ایسا شاعر جو کہ اس منافق اور مادہ پرست معاشرے میں سانس لے رہا ہے۔ اس کے باوجود اِس کا نقطہ نظر اس پاک زمین سے جڑا ہوا ہے۔ اس لیے ندیم جیسا شاعر اپنے بے زبان اور بے بس ہم وطنوں کے کرب اور دُکھ پر خدا سے التجا کرتا ہے۔

ملک میں جمہوری حکومت آئی تو انہیں ایک لحاظ سے اطمینان کا احساس ہوا کہ اب ملک سے آمریت اور جبر کے سائے چھٹ گئے ہیں اور سماجی صورتِ حال بہتر ہو گی لیکن جب ایک نئے فوجی آمر نے ملک کے سب سے مقبول وزیر اعظم بھٹو کو گرفتار کر کے تختہ دار پر لٹکا دیا تو ندیم اس کی حمایت میں بولنے سے باز نہ رہ سکے۔ گو کہ ایک بار پھر مارشل لا لگ چکا تھا مگر ندیم کو اظہار پر پابندی نہ پہلے گوارا تھی نہ اب انہیں کسی سزا کا خوف ڈرا سکا۔

دنیا کی سامراجی قوتوں نے اُن ممالک کو سیاسی، معاشی اور عسکری بالادستی کا نشانہ بنایا جنھوں نے نام کی آزادی حاصل کی۔ ندیم نے اِس دکھ کو اپنی شاعری میں بیان کیا ہے اور آمر طاقتوں کی طرف سے اظہار و بیان پر پابندیاں لگانے سے عوام میں جو زہر اور نفرت پھیلتی ہے اِس کے احساس سے ندیم کی روح تڑپ اُٹھتی ہے۔ انھوں نے اپنی کئی نظموں جیسا کہ ''ایک بیل سے''، ''جی چاہتا ہے کہ مسکراؤں'' اور ''ایک فرد ایک تاریخ'' میں گہری دردمندی کے ساتھ سوزِ وطن کی کارفرمائی دیکھی جا سکتی ہے۔ ''ایک فرد ایک تاریخ'' میں کہتے ہیں:

وہی ہوا، جو سدا اہلِ دل کے ساتھ ہوا
کہ بن گیا ہدفِ طعن، اس کا چاکِ قبا
وہ کچھ بھی تھا، مگر آسائشِ دل و جاں تھا
صدا کی شاخ پہ جب اس کا حرف پھول کھلا
وہ دشت بھی، کہ جو بنجر تھے کتنی صدیوں سے
نمو کی آنچ جو پہنچی تو سبزہ زار ہوئے
وہ کوہسار جو یخ بستگی کے حبس میں تھے
جب اس کے لمس سے چٹخے تو گل عذار ہوئے ۹ے

ندیم پاکستان کی بقا اور سلامتی کے لیے ایسے کوشاں رہتے ہیں جیسے یہ اُن کی ذاتی بقا اور استحکام کا نام ہو اور جیسے ندیم خود پاکستان ہو اور وہ اس کی بنیادوں کو بچانے کے لیے سرگرم ہو۔ ان کو جاگیردارانہ نظام، سرمایہ داری اور وڈیرا شاہی نظام نے کئی بار قلم کے ذریعے جنگ کرنے پر اُبھارا۔ اس پر انہیں سزائیں بھی ملیں۔ پہلے قیامِ پاکستان کے چار سال بعد پابندِ سلاسل کر دیا گیا، بعد میں ۱۹۵۸ء میں بھی ندیم نظر بند ہوئے۔ ترقی پسند تحریک، تقسیمِ ہند اور اِس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات نے اِن کی شاعری پر اثرات مرتب کیے۔

ندیم کی شاعری خیر اور حق وصداقت کی روشنی کو پھیلانے والی ہے۔ اِن کی شاعری میں خیر کی قوتوں کا ساتھ دینے کی بڑی وجہ ان کے چچا کی سرپرستی تھی جو انہیں اسلامی وقومی اور مذہبی موضوعات پر نظمیں لکھنے کی تلقین کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے اِن کی شاعری میں قومی جذبہ، خیر کی قوتوں کو فروغ دینا اور معاشرے سے زبوں حالی کو ختم کرنا شامل ہو گیا۔ ملک میں اکثر اوقات ایسے حکمران برسرِ اقتدار آئے جنھوں نے دھوکے بازی، خوب صورت بیان بازی اور نعرہ بازی کے ذریعے عوام کو بے وقوف بنایا۔ ایوب آمریت کی سفاک اور ہراساں روز وشب کی چکی میں پستی ہوئی عوام کے مسائل کو ندیم نے بڑے دل خراش انداز میں اپنی نظموں میں بیان کیا ہے۔

نظم ''جنگل کی آگ'' میں کہتے ہیں:

تنگ گلیوں میں اُمڈتے ہوئے لوگ
گو بچا لائے ہیں جانیں اپنی
اپنے سر پر ہیں جنازے اپنے
اپنے ہاتھوں میں زبانیں اپنی ۸۰

شاعر معاشرے کا حساس ترین فرد ہوتا ہے۔ اِن حکمرانوں کے رویوں کی وجہ سے عام آدمی بھی معترض تھے تو ایسی صورتِ حال میں ندیم جیسے شاعر کے اندر ایسے مزاحمتی جذبات کا اُبھرنا فطری امر ہے۔ اُس وقت جو صورتِ حال تھی، اس نے شاعروں پر بولنے اور اظہار کی پابندی عائد کر رکھی تھی۔ اِن آمرانہ پابندیوں کی وجہ سے ندیم نے بیانیہ انداز کی جگہ علامت پسندی اور رمز و ایما کے اسالیب کو اپنایا۔ ندیم نے اپنی نظم ''جنگل'' میں بھی سیاسی عمل کے جبر وستم کو بیان کیا ہے۔ اِس دور میں ندیم نے جو نظمیں کہی ہیں، اُس میں نیا انداز تخلیق کیا ہے، جس میں

گہرا طنز پایا جاتا ہے۔ ان کی تخلیقی زندگی پر آمریت کے بھیانک اثرات کی منظرکشی ان کی نظموں ''فنونِ لطیفہ'' اور ''کون سنے'' میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ اس آمریت کے منفی اثرات میں ایک اثر یہ بھی ہوا کہ ضمیر کی آواز پر اپنے کان بند کر لیے اور اشیا کو پوجنے لگے اور معاشرتی اقدار ختم ہوگئیں۔ اِس کے منفی اثرات ہماری تہذیبی زندگی پر بھی مرتب ہوئے۔ ایسے ماحول میں سانس لینا بھی دشوار لگتا تھا۔ اِن کا اظہار اِن کی نظموں ''مجبوری'' اور ''صدائے بے صدا'' میں ہوتا ہے۔ ''صدائے بے صدا'' میں ندیم کہتے ہیں:

اِظہار مدعا کی اجازت کا شکریہ
لیکن مری زبان تو واپس دلائیے
الفاظ سے صدا کی صفت کس نے چھین لی
اس رہزنی کا کھوج تو پہلے لگائیے
جب مل گیا مجھے میری آواز کا سراغ
جنباں رہیں گے کنجِ لحد میں بھی مرے لب
یوں بولنے کو بول تو دوں آج بھی مگر
تاروں کے ٹوٹنے سے نہ ٹوٹا سکوتِ شب ۸۱

یہ نظم ۱۹۶۵ء میں ایوب خان کے صدارتی انتخاب کے بعد لکھی گئی جس میں محترمہ فاطمہ جناح کو دھاندلی کے ذریعے ہرایا گیا تھا۔ اس میں ندیم نے حریتِ فکر اور انقلابی رویے کا کھلا اظہار کیا ہے۔ انتخاب جیتنے کی خوشی میں ایوب خان نے غریب بستیوں پر ظلم وستم اور وحشت کی یلغار کر دی۔ ایسی صورتِ حال کا اظہار ندیم نے ''حصارِ فصلِ گل'' اور ''ابلاغ'' میں بھی کیا ہے۔ اِن حالات میں الفاظ بے آواز سے ہو کر رہ گئے۔ ندیم کی شاعری جمہوری مزاج اور اقدار کی حامل شاعری ہے۔ ندیم نے ''حصارِ فصلِ گل'' میں بیان کیا ہے:

تاروں کا قتل پردۂ شب میں ہوا، مگر
دستِ سحر سے خون تو ٹپکے گا، صبح دم
چپ چاپ پی گئے ہیں لہو کی پکار کو
دانش وری کے یوں تو بڑے مدعی ہیں ہم ۸۲

ندیمؔ جو کہ ترقی پسند جمہوری مزاج رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے عوام کے ساتھ زندگی گزارنے اور ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے قلم اُٹھایا۔ اِن کی شاعری کسی اور دنیا کی محسوس نہیں ہوتی بلکہ ایسا لگتا ہے کہ یہ زمین سے بلند ہو رہی ہے۔ ندیمؔ کی شاعری کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

''اِن کے ہاں جمہوریت اور انسانیت ہی انسانیت کا درس ملتا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ قاسمی نے ترقی پسندی کو لیبل کے طور پر استعمال نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس اسے شعارِ زیست جانا اور ترقی پسندی کے آدرش کو فکری سطح پر اپنی شاعری میں شامل کیا۔'' ۸۳

ندیمؔ کو اِس انقلابی اور احتجاجی جذبات اور عوام کے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے پر قید و بند کی، صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ ندیمؔ نے جس طرح حبس اور قید و بند کی صعوبتوں کو برداشت کیا، اِن پابندیوں نے ندیمؔ کی آزادفکر کو کس حد تک متاثر کیا، اِس کا اظہار اپنی نظم ''زنداں'' میں انھوں نے یوں کیا ہے:

ارتقا کا یہ چلن ہے کہ ہر انجام سے قبل
نئے آغاز کے رستے میں اُبھرتی ہے فصیل
انقلابات کی یلغار میں دب جاتی ہے
سطوتِ کوہِ ہمالہ ہو کہ طغیانیٔ نیل
آج زنداں میں سہی، دست بہ زنجیر سہی
کل یہ میدان میں شمشیر بدست اُبھریں گے
جس طرح تیر کمانوں سے نکل جاتے ہیں
یوں بیک جست فصیلوں سے یہ مست اُبھریں گے ۸۴

ندیمؔ نے جس طرح جمہوریتوں کے نظام کو طنز کا نشانہ بنایا۔ اس کی صاف گوئی اور بے باکی کی عمدہ مثالیں ان کی نظموں ''پابندی''، ''ہم'' اور ''صبحِ آگہی'' میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ جب انقلاب آیا تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آئی کہ وہی نظام قائم دائم ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایوب خان کی آمریت ذوالفقار علی بھٹو کی جمہوریت میں بدل گئی لیکن ایوب خان کے دور کے بعد ۱۹۷۷ء کے مارشل لا کے دوران جو غلط کام انجام پائے ان میں نہایت اہم اور ناقابلِ فراموش کارنامہ بھٹو کی سزائے موت ہے۔ ضیاء الحق کے مارشل لا کے ساتھ ہی پوری قوم ایک

مرتبہ پھر اُجڑ گئی۔ اظہار پر ایک بار پھر پابندی لگا دی گئی اور زبانیں اور الفاظ پتھر بن گئے تو اِن حالات میں ندیمؔ کو بھٹو کا تاریخی کردار بہت یاد آیا۔ ندیمؔ کا بھٹو سے لگاؤ کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ بھٹو نے مظلوم و بے کس عوام کے لیے آواز بلند کی اور انہیں اپنی بات کے اظہار کے لیے زبان دی اور شعور بخشا۔ اِس لیے ندیمؔ نے بھٹو کے مسائل کو معزولی سے لے کر تختہ دار تک اپنے ذاتی دُکھوں میں تحلیل کر کے نظمیں لکھیں۔ اِن کی ۵/اپریل ۱۹۷۹ء کو لکھی گئی دو نظمیں ''کرب نامہ'' اور ''ایک نوحہ'' بھی اِسی دور کی یادگار ہیں۔ ''ایک نوحہ'' جو کہ بھٹو کا مختصر قصیدہ ہے اور غزلیہ انداز میں عمدہ مزاحمتی نظم ہے۔ اِس میں ندیمؔ، بھٹو کی مزاحمتی فکر کو اپنی، بھٹو سے ذہنی ہم آہنگی اور مزاحمتی فکر کے ساتھ اُجاگر کرتے ہیں۔ ندیمؔ صاحب اقتدار اور ارباب اختیار کے بھولپن پر گریہ وزاری کرتے ہیں جب بھٹو کے جسدِ خاکی کو سولی پر لٹکا دیا گیا۔

شعور کی دھار تھا وہ احساس کی اَنی تھا
وہ طالبِ حسنِ زندگی تھا سو کشتنی تھا
اِسی لیے تو اُداس چہرے چمک رہے ہیں
وہ نور ذہنوں کا تھا، ضمیروں کی روشنی تھا
فرازِ دار و رسن سے اِس کا مقام پوچھو
کہ اِس کا معیارِ عشق کس درجہ آہنی تھا
میں اس کی تر دامنی کی سوگند کھا رہا ہوں
کہ وہ تو دل کا غنی تھا اور بات کا دھنی تھا
تم اُس کی آواز پارہ پارہ نہ کر سکو گے
کہ جسم تو خیر جسم تھا اور شکستنی تھا
لہو لہو پتیوں سے شب سرخ ہو رہی تھی
کہ ایک گل کا یہ آخری رقصِ جاں کنی تھا ۸۵؎

بھٹو کو تو پھانسی پر چڑھا دیا گیا لیکن یہ بات ہر شخص پر واضح ہوگئی کہ بھٹو تو صرف آواز تھا اور یہ آواز اُن کے جسم کو پھانسی پر چڑھانے سے ختم نہیں ہوئی بلکہ زندہ و سلامت ہے اور اِس کے اُبھرنے میں مزید اضافہ ہوا ہے۔

ندیم نے اپنی نظموں میں کلاسیکی انداز کے ذریعے ان کے چاہنے والوں کے جذبات کو بیان کیا ہے۔ ہماری اجتماعی زندگی میں بھٹو کے جراتِ اظہار کا اثر جھلک رہا ہے اور ندیم کے ہاں یہ آواز تخلیقی زندگی کے متنوع پیرایہ ہائے اظہار کی علامت ہے۔ اس طرح آمریت کی سب سے بڑی دشمن یہ آواز ہوتی ہے۔ ندیم نے نظم ''تدفین'' میں اس المیہ کو موضوع بنایا ہے۔

چار طرف سناٹے کی دیواریں ہیں
اور مرکز میں اِک تازہ قبر کھدی ہے
کوئی جنازہ آنے والا ہے!
کچھ اور نہیں تو آج شہادت کا کلمہ سننے کو
ملے گا ۸۶

ندیم کی شاعری کھوکھلی نہیں ہے بلکہ ان کی شاعری سے واضح ہوتا ہے کہ اُنھوں نے نہ صرف اپنے ملک میں بلکہ بین الاقوامی سطح پر ہونے والے ظلم و استحصال کے حوالے سے بھی آواز بلند کی۔ ان کی بہترین عکاسی ندیم کی نظموں ''خدیجہ زہرہ''، ''روشنی کی تلاش'' اور ''جمیلہ'' میں کی گئی ہے۔ ندیم نے ان تمام لوگوں کی انقلابی جدوجہد کی حمایت کی جو اس ظلم کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ چاہے وہ ویت نام کے فن کار ہوں یا چین کے بہادر عوام۔ ندیم نے فرانسیسی استعمار کے خلاف الجزائر کی جنگ کی بھی حمایت کی۔ نظم ''جمیلہ'' جو کہ اِسی سلسلے کی کڑی ہے۔ جمیلہ جو کہ الجزائری خاتون تھی جس نے آزادی کے لیے جنگ لڑی اور شدید ظلم و ستم اور دکھ و کرب کو برداشت کرنے کے باوجود اپنے مقصد سے پیچھے نہ ہٹی اور اس آزادی کی خاطر اپنی جان قربان کر دی۔ ندیم نے اس کردار کو اپنی نظم میں پیش کر کے ان تمام لوگوں کی حمایت میں آواز بلند کی جو اپنے ملک سے ظلم و ستم اور غلامی کو ختم کرنے کے لیے مصروف ہیں۔ ''جمیلہ'' میں ندیم لکھتے ہیں:

پا بہ زنجیر ہوئی وقت کی رفتار کہاں!
جو کبھی کٹ نہ سکے، ایسی شب تار کہاں!
اے مرے جسم کو کانٹوں میں پرونے والے
ہے غلامی سے بھی بڑھ کر کوئی آزار کہاں!

باندھے جاتے ہیں زبانوں پہ جہاں انگارے
وا ہوا بھی تو ہمارا لب اظہار کہاں! ۸۷

ندیم جو کہ سامراجی قوتوں کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں، ان حالات میں لوگوں کو اُن کے بنیادی حقوق سے محروم کر دیا جاتا ہے اور انہیں دُکھ اور کرب سہنا پڑتا۔ اس صورتِ حال کے متعلق انیس ناگی لکھتے ہیں:

''ہم کبھی بھی اتنے آزاد نہیں تھے جتنا جرمنوں کے تسلط کے دوران میں تھے۔ ہمیں تمام حقوق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ ہمیں بات کرنے کا حق بھی میسر نہیں تھا۔ ہر روز ہماری توہین کی جاتی تھی اور ہمیں سب کچھ چپ چاپ سہنا پڑتا تھا۔ وہ لوگ جو زیرِ زمین کام کر رہے تھے اُن کی کش مکش کے احوال سے ہمیں ایک نئی قسم کا تجربہ ہوا۔'' ۸۸

اِن حالات کے نتیجے میں فرانس میں مزاحمتی ادب پیدا ہوا۔ ندیم نے بھی اپنی نظم ''ایشیا'' میں اس ظلم وستم کے حالات و واقعات کو بیان کیا ہے اور اس نظم میں ندیم اِن سامراجی قوتوں کو اِس طرح للکارتے ہیں:

؎ گو بظاہر ابھی پیرہن چاک ہے، اس کے ہاتھوں میں میزانِ افلاک ہے
اب جو مانگو تو برگِ گلابِ ایشیا، اور چھینو تو موجِ سرابِ ایشیا ۸۹

ندیم نے نظم ''نیا ایشیا'' بھی لکھی جس میں ۷ر فروری ۱۹۳۱ء کو چین میں چیانگ کائی شیک کی سامراج نواز حکومت کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے چھے نوجوانوں کو اپنا موضوعِ سخن بنایا۔ ندیم کو ان نوجوانوں کے خون سے نئی سحر طلوع ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ان نوجوانوں نے ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔ اس طرح یہ نظم دنیا بھر میں ہونے والی انقلابی جدوجہد کی علامت بن جاتی ہے۔ اس طرح ندیم نے دنیا بھر میں ہونے والے عصری واقعات میں سے اکثر کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا اور ان پر اپنا ردِعمل شعری انداز میں ظاہر کیا۔ جیسا کہ ندیم نے الجزائر کے شہر عرفہ میں فرانسیسی ظلم کے خلاف مظاہرہ کرتے ہوئے خدیجہ زہرہ کو جب گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا تو اس کی منظر کشی نظم ''خدیجہ زہرہ'' میں کرتے ہیں۔ اِس میں ندیم اس کو انگریزوں کے خلاف لڑنے والی بہادر فرانسیسی خاتون جون ڈی آرک اور الجزائر کی مشہور مجاہدہ جمیلہ سے مشابہ قرار دیتے ہیں۔ جمیلہ تو اس احتجاج کے باعث ایک عرصہ تک محبوس رہی لیکن سزائے موت سے بچ گئی۔ لیکن خدیجہ زہرہ جان کی قربانی دے کر اپنے وطن اور انصاف کرنے والے لوگوں

کی نظروں میں ہمیشہ کے لیے سرخ رو ٹھہری۔ اس نظم کے چند مصرعے درج ذیل ہیں:

جون ڈی آرک کے پیکر سے نکلتی لو نے
کتنے خاکے رسن و دار کے دکھلائے ہیں
کتنی پوشیدہ صلیبوں کے لگائے ہیں چراغ
جب کہیں قافلۂ عشق رواں ہوتا ہے
جون کا شعلۂ بے باک جواں ہوتا ہے
بھڑک اُٹھتے ہیں سلگتی ہوئی آنکھوں کے چراغ
الجزائر میں دمک اُٹھتے ہیں روآن کے داغ
کیا کبھی عظمتِ پیرس نے یہ سوچا بھی ہے؟
جون ڈی آرک، جمیلہ بھی، خدیجہ بھی ہے [۹۰]

جون ڈی آرک کو روآن جو کہ فرانس کا مقام ہے، نذرِ آتش کیا گیا تھا، جب کہ خدیجہ زہرہ کو الجزائر میں مار دیا گیا تھا۔ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو لوگ کبھی مظلوم و محکوم رہے ہوتے ہیں، ایک دن ظالم و حاکم بن جاتے ہیں۔ ندیمؔ نے وسیع النظری کی بنا پر خدیجہ زہرہ کو جون ڈی آرک سے مماثل قرار دے کر اصل میں اپنی باطنی کیفیت کو منظوم کر دیا ہے۔ ندیمؔ کی انسان دوستی نے اسے کسی بھی ملک کی اندھا دھند پیروی کرنے سے دُور رکھا۔ کچھ عرصہ تک ندیمؔ روس کے بڑے مداح رہے لیکن جب عرب اسرائیل جنگ ہوئی تو روس کے شرم ناک رویے پر روس کی حمایت سے ندیمؔ دست بردار ہو گئے۔ ندیمؔ نے نہ صرف وطن کے حوالے سے شاعری کی بلکہ ان کی شاعری ترقی پسند عناصر سے بھی بھرپور ہے۔

ندیمؔ کی شاعری سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ظلم و جبر کے خلاف ان کی آواز ایک فرد کی نہیں بلکہ ایک عہد کی آواز ہے۔ ندیمؔ اگرچہ ترقی پسند تحریک کے رکن تھے لیکن ان پر وہ باتیں صادق نہیں آتیں جو عام طور پر ترقی پسندوں کے بارے میں کہی جاتی ہیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا:

"Any programmed effort to propagate a brand of ideaology through literature is bound as happened in the case of progressive movement in Urdu Literature." [۹۱]

ندیمؔ نے ہمیشہ حکمرانوں کے ظلم و ستم کی پروا کیے بغیر اپنی بات کو آزادی کے ساتھ لوگوں تک پہنچایا۔ ترقی پسند تحریک کے فعال ادیب، قلم کار اور دانش ور تھے۔ اُنھوں نے لوگوں کو پیغام دیا کہ جتنے بھی مشکل حالات ہوں۔ تخلیق کا کام جاری رکھنا چاہیے۔ لہٰذا اُنھوں نے اپنے قلم کے ذریعے انسانیت، انسانی عظمت، رواداری اور محنت کی قدروں کو فروغ دیا۔ ان اقدار کے فروغ اور سچائی کے قائل ہونے کی وجہ سے انہیں دکھوں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن سچ کا ساتھ کبھی نہ چھوڑا اور ہمیشہ معاشرے کی حقیقی تصویر سب کے سامنے پیش کی۔ اُن کی نشاندہی ان کی تشبیہات، استعارات اور محاکات سے کی جا سکتی ہے۔ ندیمؔ کی نظموں میں استعمال ہونے والے استعارے بھی خاص معنی رکھتے ہیں۔ رات، سحر، بہار اور خزاں کے استعارے اِن کی شاعری میں خاص طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ ندیمؔ نے دل کش اور انوکھی تشبیہات اور علامات کو بھی اپنی نظموں میں استعمال کیا ہے۔ نظم ''وقت'' میں ندیمؔ تشبیہات، استعارات اور علامات کے ذریعے وقت کے ساتھ چلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور نظم ''گونج'' میں زندگی کی تشریح ایک علامت کے ذریعے کرتے ہیں۔ ''گونج'' مظاہرِ فطرت کے ساتھ ساتھ ارتقا کی علامت بن کر اُبھرتی ہے۔

نظم ''آخری فیصلہ'' میں جو تشبیہات استعمال ہوئی ہیں اُس سے حواسِ خمسہ میں ذائقہ، شامہ، سامعہ اور حسِ لامسہ کو ظاہر کیا گیا ہے لیکن حسِ باصرہ کو کم نمایاں کیا گیا ہے۔

ندیمؔ کی نظموں کی ایک اہم خاصیت ابلاغ ہے۔ اُنھوں نے اپنی نظموں میں پیچیدہ مسائل اور گہرے نکتوں کو آسان انداز میں بیان کیا ہے۔ نظم ''پابندی'' میں ندیمؔ کہتے ہیں:

میرے آقا کو گلہ ہے کہ مری حق گوئی
راز کیوں کھولتی ہے
اور میں پوچھتا ہوں ___ تیری سیاست، فن میں
زہر کیوں گھولتی ہے
میں وہ موتی نہ بنوں گا جسے ساحل کی ہوا
رات دن رولتی ہے

یوں بھی ہوتا ہے، کہ آندھی کے مقابل چڑیا
اپنے پر تولتی ہے
اِک بھڑکتے ہوئے شعلے پہ ٹپک جائے اگر
بوند بھی بولتی ہے ۹۵

تراکیب، علامات اور استعارے ان کی شاعری کا جوہر ہیں۔ علامت نگاری ان کے نزدیک فطری عمل ہے۔ علامت نگاری کے سلسلے میں ندیم کی نظم ''تھکن کا ایک لمحہ'' بہترین مثال ہے۔

سڑک کس قدر سخت، سفاک اور کھردری ہے
وہ جوتوں کے چمڑے
نئے ٹائروں کے ربر
رہرووں کے ارادوں کو
یوں چاٹ رہی ہے
جیسے کوئی اژدھا ہے
جو صدیوں کا بھوکا ہے
اور زندگی کو نگلتا چلا جا رہا ہے! ۹۶

ندیم کی یہ نظم موجودہ زمانے کے جدیدیت کے موضوعات کی طرف اشارہ کرتی ہے، کہ یہ راستہ سفاک ہے جس پر چلنے سے انسان دشمن خیالات کے اژدھے کا نوالہ بن جاتا ہے۔ ندیم کی ایک اور نظم ''خواب'' بھی علامت نگاری کے انداز میں لکھی گئی ہے:

چاندنی نے رنگِ شب جب زرد کر ڈالا تو میں
ایک ایسے شہر سے گزرا جہاں
صرف دیواریں نمایاں تھیں
چھتیں معدوم تھیں
اور گلیوں میں فقط سائے رواں تھے
جسم غائب تھے! ۹۷

اس نظم میں دیواریں رکاوٹوں کی، چھتیں تحفظ کی، سائے انسان کے بارے میں تصورات اور جسم، انسان کی ٹھوس حقیقت کی علامت ہے۔ آج کل کے معاشرے میں رکاوٹیں تو موجود ہیں لیکن تحفظ کا نظام نظر نہیں آتا۔ اس موجودہ صورتِ حال کو دیواروں سے گھرے ہوئے بے چھتوں کے گھر کہہ کر ندیمؔ نے علامت نگاری کے معنی اور خوب صورت مثال دی ہے۔ ندیمؔ کے اشعار میں جو گہری سوچ ہے، جس سوچ میں زندگی کے خواب، زندگی کے درد، فتوحات اور شکستیں پائی جاتی ہیں، جو ہمیں زندگی کی گہرائیوں کی سیر کراتی ہیں اور یہی صحت مند شاعری کی خصوصیت ہے۔

حواشی

۱۔ عبدالکریم خالد، ''نئے پرانے مضامین''، لاہور، اظہار سنز، ۱۹۔اُردو بازار، ۱۹۹۸ء، ص ۱۱

۲۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ''نظم جدید کی کروٹیں''، لاہور، سنگت پبلشرز، سی لوئر مال، چوتھا ایڈیشن ۲۰۰۷ء، ص ۲۶

۳۔ احمد ندیم قاسمی، ''ارض و سما''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۱۰

۴۔ احمد ندیم قاسمی، ''میرے ہم قدم''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۱

۵۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی نظمیں''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۳۰۵

۶۔ ایضاً، ص ۱۴۳

۷۔ احمد ندیم قاسمی کا ایک خط، مرتبہ خورشید ربانی، '' آدھی ملاقات''، اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء، ص ۲۷

۸۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی نظمیں''، ص ۱۱۷۶

۹۔ غلام عباس، ''ندیم بحیثیت شاعر'' (مقالہ برائے ایم۔اے اُردو)، لاہور، اورینٹل کالج پنجاب یونی ورسٹی، ۱۹۸۸ء، ص ۲۶

۱۰۔ احمد ندیم قاسمی، ''معنی کی تلاش''، لاہور، اساطیر، ۲۰۰۳ء، ص ۳۵

۱۱۔ جلیل عالی، ''ندیم کی شعری واردات کی معنوی جہتیں'' مشمولہ ''ادبیات'' سہ ماہی، اسلام آباد، جلد ۱۷، شمارہ ۷۳، اکتوبر دسمبر ۲۰۰۶ء، ص ۱۱۳

۱۲۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی نظمیں''، ص ۱۱۲۶

۱۳۔ فیض احمد فیض، ''نقشِ فریادی''، لاہور، مکتبہ کارواں، س۔ن، ص ۴۰

۱۴۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی نظمیں''، ص ۹۰۸

۱۵۔ فیض احمد فیض، ''زنداں نامہ''، لاہور، مکتبہ کارواں، س۔ن، ص ۹۱

۱۶۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی نظمیں''، ص ۱۲۷

۱۷۔ محمد عظیم ملک، ''رہ وادی خیال''، لاہور، میری لائبریری، ۱۹۶۹ء، ص ۲۰۶

۱۸۔ مجید امجد، ''کلیاتِ مجید امجد''، ترتیب و تدوین، خواجہ محمد زکریا، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۴۰۵

۱۹۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی نظمیں''، ص ۵۰۹

۲۰۔ ڈاکٹر اظہار اللہ اظہار، ''احمد ندیم قاسمی، تخلیقی جہتوں کے آسماں'' مشمولہ ''ادبیات'' سہ ماہی، اسلام آباد، (ندیم نمبر)، جلد ۱۷، شمارہ ۷۳، اکتوبر دسمبر ۲۰۰۶ء، ص ۲۰۱

۲۱۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی، ''جدید اُردو شاعری میں فطرت نگاری''، (۱۸۷۴ء سے ۲۰۰۰ء تک)، کراچی، انجمن ترقی اردو، ڈی۔۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، ۲۰۰۲ء، ص ۳۵۹۔۳۶۰

۲۲۔ محمد عباس، ''احمد ندیم قاسمی کی ادبی شخصیت کی تشکیل''، مقالہ برائے ایم۔اے اُردو، سرگودھا، یونی ورسٹی آف سرگودھا، ۲۰۰۵ء تا ۲۰۰۷ء، ص ۹۴

۲۳۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی نظمیں''، ص ۱۱۴۸

۲۴۔ محمد اسلم لودھی، ''قومی ہیرے''، لاہور، طاہر سنز، پبلشرز، اُردو بازار، اگست ۲۰۰۷ء، ص ۱۴۲۔۱۴۱

۲۵۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی نظمیں''، ص ۱۱۵۱

۲۶۔ آصف ثاقب، ''ہمارے ندیم۔۔۔!!'' مشمولہ ''بیاض'' ماہنامہ، لاہور، جلد نمبر ۱۶، جنوری ۲۰۰۸ء، ص ۱۰۰

۲۷۔ احمد ندیم قاسمی، اداریہ ''فنون''، سہ ماہی، لاہور، شمارہ ۱۲۴، جنوری/اپریل ۲۰۰۵ء، ص ۱۷

۲۸۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی نظمیں''، ص ۱۱۸۹۔۱۱۹۰

۲۹۔ احمد ندیم قاسمی، ''دیباچہ از طلوع و غروب''، لاہور، اساطیر، ۱۹۹۵ء، ص ۳

۳۰۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی نظمیں''، ص ۲۸۷۔۲۸۸

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۱۶۹

۳۲۔ محمد اکرم رضا، ''صاحبِ طرز شاعر، منفرد افسانہ نگار'' مشمولہ ''مٹی کا سمندر'' مرتبہ ضیا ساجد، لاہور، مکتبہ القریش، بار اوّل ۱۹۹۱ء، ص ۶۴۵

۳۳۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی نظمیں''، ص ۸۹۳

۳۴۔ ایضاً، ص ۱۱۲۶

۳۵۔ خدیجہ مستور، ''ندیم کی عشقیہ شاعری میں عورت کا درجہ'' مشمولہ ''عبارت''، ۱۹۹۶ء تا ۱۹۹۷ء، ص ۱۲۷

۳۶۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی نظمیں''، ص ۵۴۰

۳۷۔ ایضاً، ص ۵۶۶

۳۸۔ ایضاً، ص ۵۰۵

۳۹۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی نظمیں''، ص۳۱۶۔۳۱۷

۴۰۔ فتح محمد ملک، ''احمد ندیم قاسمی، شاعر اور افسانہ نگار''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص۱۵۷

۴۱۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ''احمد ندیم قاسمی کی شاعری'' مشمولہ ''ندیم نامہ'' مرتبہ محمد طفیل، بشیر موجد، لاہور، مجلسِ اربابِ فن، بار اوّل، ۱۹۷۶ء، ص۲۳۱

۴۲۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی نظمیں''، ص۶۹۱

۴۳۔ جارج لوکاچ، "The Idology of Modernism" مشمولہ "20th Century Literary Criticism" مرتبہ (Ed)
David Lodge, 1985, London, Longman

۴۴۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی نظمیں''، ص۶۷۵

۴۵۔ فتح محمد ملک، ''احمد ندیم قاسمی، شاعر اور افسانہ نگار''، ص۲۹

۴۶۔ احمد ندیم قاسمی، انٹرویو، طلباء سول سروس اکیڈمی، لاہور، محمد خان رانجھا، ساجد ظفر ڈال، عدنان ارشد، منزہ فرحان، ''نسلِ نو سے گفتگو'' مشمولہ ''ادب سرائے'' سہ ماہی، (ندیم نمبر)، لاہور، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷ء، ص۱۴

۴۷۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی نظمیں''، ص۷۸۹

۴۸۔ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، ''احمد ندیم قاسمی، ایک لیجنڈ''، لاہور، اساطیر، ۲۰۰۳ء، ص۱۳

۴۹۔ مقصود الٰہی شیخ، ''دریا کا سمندر ہونا'' مشمولہ ''معاصر'' سہ ماہی، لاہور، جلد ۷، ۸، شمارہ ۲، ۳، ۴، اپریل ۲۰۰۷ء تا مارچ ۲۰۰۸ء، ص۱۴۲

۵۰۔ احمد ندیم قاسمی، ''تہذیب و فن''، لاہور، پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، ۱۹۹۱ء، ص۳۴

۵۱۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی نظمیں''، ص۶۶۱۔۶۶۲

۵۲۔ ایضاً، ص۴۸۶۔۴۸۷

۵۳۔ احمد ندیم قاسمی، انٹرویو، حسن رضوی، مشمولہ ''گفت و شنید''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء، ص۱۳

۵۴۔ علامہ اقبال، ''کلیاتِ اقبال''، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ پبلشرز، ۲۰۰۴ء، ص۹۴

۵۵۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی نظمیں''، ص۵۲۶۔۵۲۷

۵۶۔ جیلانی کامران، ''ہمارا ادبی اور فکری سفر''، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، طبع اوّل، ۱۹۸۷ء، ص۱۴۹

۵۷۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی نظمیں''، ص ۸۸۷

۵۸۔ فتح محمد ملک، ''ندیم کا تصورِ انسان'' مشمولہ ''ادبیات'' سہ ماہی، شمارہ ۱۷، ص ۴۴۵

۵۹۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی نظمیں''، ص ۴۳۱۔۴۳۲

۶۰۔ خورشید بیگ میلسوی، ''مینارۂ روشنی، احمد ندیم قاسمی''، روزنامہ ''خبریں''، لاہور، ۱۶ر جولائی ۲۰۰۶ء

۶۱۔ اصغر ندیم سید، روزنامہ ''جنگ''، لاہور، ۱۴ر جولائی ۲۰۰۶ء

۶۲۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی نظمیں''، ص ۳۶۳

۶۳۔ انٹرویو از احمد ندیم قاسمی، مشمولہ ''مجلسِ سخن'' لاہور، شعبہ اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی، ۲۰۰۴ء، ص ۲۵۷

۶۴۔ فتح محمد ملک، ''احمد ندیم قاسمی کا آدم نو'' مشمولہ ''افکار'' ندیم نمبر، کراچی، شمارہ ۵۹/۵۸، جنوری رفروری ۱۹۷۵ء، ص ۴۰۳

۶۵۔ فرزانہ سید، ''احمد ندیم قاسمی'' مشمولہ ''نقوشِ ادب''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص ۴۵۶

۶۶۔ عبادت بریلوی، ''احمد ندیم قاسمی۔ شخصیت اور فن (چند تنقیدی تاثرات)'' مشمولہ ''نقوش'' لاہور، ادارہ فروغ اردو، ۳۹، ۴۰، مارچ ۱۹۵۴ء، ص ۱۹۷

۶۷۔ سارترے، ''اخلاقیات''، سی۔اے قادر، لاہور، مجلس ترقی ادب، طبع چہارم، دسمبر ۱۹۸۰ء، ص ۲۶۲

۶۸۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی نظمیں''، ص ۱۰۱۳۔۱۰۱۴

۶۹۔ ایضاً، ص ۹۰، ۹۱

۷۰۔ ایضاً، ص ۳۶۷

۷۱۔ ایضاً، ص ۶۵۰۔۶۵۱

۷۲۔ ایضاً، ص ۴۶۳۔۴۶۴۔۴۶۵

۷۳۔ ایضاً، ص ۳۵۸۔۳۵۹

۷۴۔ ایضاً، ص ۴۱۹۔۴۲۰

۷۵۔ ایضاً، ص ۳۲۸

۷۶۔ ایضاً، ص ۳۷۲

۷۷۔ ایضاً، ص ۴۶۰۔۴۶۱

۷۸۔ احمد ندیم قاسمی، ''بسیط''، لاہور، اساطیر، ۱۹۹۵ء، ص ۶۴

۷۹۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی نظمیں''، ص ۱۶۴

۸۰۔ ایضاً، ص ۵۱۴

۸۱۔ ایضاً، ص ۴۶۸

۸۲۔ ایضاً، ص ۴۶۷

۸۳۔ ڈاکٹر سلیم اختر، ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، چھبیسواں ایڈیشن ۲۰۰۴ء، ص ۵۵۸

۸۴۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی نظمیں''، ص ۶۷۴

۸۵۔ ایضاً، ص ۱۰۶، ۱۰۷

۸۶۔ ایضاً، ص ۱۲۵

۸۷۔ ایضاً، ص ۵۷۹، ۵۸۰

۸۸۔ انیس ناگی، ''مشاہدات''، لاہور، مکتبہ جمالیات، ۱۹۹۳ء، ص ۴۲، ۴۳

۸۹۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی نظمیں''، ص ۵۷۸

۹۰۔ ایضاً، ص ۵۳۵، ۵۳۶

۹۱۔ ڈاکٹر وزیر آغا، "Issues and Problems Faced by South Asian Writers" مشمولہ ''نردبان''، ماہنامہ، سرگودھا، فروری، مارچ ۱۹۹۵ء، ص ۱۳۶

۹۲۔ احمد ندیم قاسمی، انٹرویو، روزنامہ ''جنگ''، لاہور، ۱۱ر جولائی ۲۰۰۶ء، ص ۱

۹۳۔ احمد ندیم قاسمی، ''پس الفاظ''، لاہور، اساطیر، ۲۰۰۳ء، ص ۱۹

۹۴۔ ڈاکٹر کریم الدین احمد، ''ترقی پسند تحریک، ایک جائزہ'' مشمولہ ''سیپ''، سہ ماہی، کراچی، شیر شاہ کالونی، شمارہ ۳۴، ص ۲۱۹

۹۵۔ احمد ندیم قاسمی، ''ندیم کی نظمیں''، ص ۶۰۴

۹۶۔ ایضاً، ص ۲۲۷

۹۷۔ ایضاً، ص ۲۳۱

✿✿✿✿✿

باب پنجم

قطعہ نگاری

قطعہ(ق طُ عَ ہْ) کے لغوی معنی ''ٹکڑا'' یا ''جزو'' کے ہیں۔ اصطلاحی معنوں میں قطعہ اُس نظم کو کہتے ہیں جس میں کوئی واقعہ یا خیال مسلسل بیان کیا گیا ہو۔ قطعہ کے لیے ضروری ہے کہ ہر شعر کے دوسرے مصرع میں قافیہ کی پابندی ہو لیکن اس میں مطلع کا ہونا ضروری نہیں۔ لہٰذا قطعہ اُس صنفِ سخن کو کہا جاتا ہے جس کے اشعار ہم وزن و ہم قافیہ ہوں۔ اِس کو ہر بحر میں کہا جا سکتا ہے۔ اِس کے لیے کم از کم دو اشعار کا ہونا ضروری ہے اور زیادہ سے زیادہ کی کوئی قید نہیں۔

قطعہ کے لیے ضروری ہے کہ معنوی اعتبار سے مکمل اکائی ہو اور اس میں مسلسل واقعہ یا مضمون کو بیان کیا جائے لیکن اس کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں۔ اِس میں ہر طرح کے واقعات، خیالات، نظریات، احساسات و جذبات کو بیان کیا جا سکتا ہے۔ مہدی حسین ناصری ''مخزن الفوائد'' میں قطعہ کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

> ''اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اِس کے مطلع کا پہلا مصرعہ قافیہ سے منقطع ہو گیا ورنہ غزل یا قصیدہ کی طرح مسلسل ہوتا ہے اور دو اشعار سے کم نہیں ہوتا۔'' ۱؎

''علمِ بدیع در زبان فارسی'' میں سید محمد رضادانی جواد رقم طراز ہیں:

> ''(لفظ) قطعہ کسر اوّل کے ساتھ صحیح ہے۔ لغت کے اعتبار سے کسی بھی چیز کے ٹکڑے کو (قطعہ) کہتے ہیں۔ ادبیات کی اصطلاح میں قافیہ کے اوزان میں مستحد ہے۔ اس کی تعداد دو اشعار سے کم نہیں ہوتی۔ اپنے معانی کے اعتبار سے تمام قطعہ ایک ہی مفہوم اور ایک ہی مخصوص فکر کا شارح ہوتا ہے۔'' ۲؎

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

> ''قطعہ کو ہئیت اور معنی کے اعتبار سے قصیدہ یا غزل مسلسل خیال کرنا چاہیے۔ صرف یہ کہ قصیدہ اور غزل میں مطلع کا ہونا ضروری ہے اور قطعہ میں عموماً مطلع نہیں آتا۔'' ۳؎

قطعہ اور رباعی، یہ دونوں اصناف ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن اکثر اوقات اِن میں فرق نہیں کیا جاتا۔ قطعہ میں عموماً دو شعر کہنے کا رواج ہے اور رباعی میں بھی دو شعر ہوتے ہیں جس کی وجہ سے قطعہ اور رُباعی میں حدِ فاصل قائم نہیں رکھا جاتا لیکن ان کو تین اُمور کی بنا پر ایک دوسرے سے الگ کیا جا سکتا ہے۔

رُباعی میں ہمیشہ مطلع ہوتا ہے جب کہ قطعہ میں عموماً مطلع نہیں ہوتا۔ قطعہ کے لیے کوئی وزن مخصوص نہیں جب کہ رُباعی ہمیشہ مخصوص اوزان میں کہی جاتی ہے۔ اِس طرح قطعہ میں اشعار کی تعداد مقرر نہیں۔ جب کہ رباعی ہمیشہ دوشعروں پر مشتمل ہوتی ہے۔

کلاسیکی ادب میں قطعہ کی روایت مضبوط نہ تھی بلکہ بغیر کسی ترتیب کے بکھری ہوئی تھی۔ دکنی ادب میں مثنوی اور مرثیے کے ساتھ ساتھ قطعات کی بھی مثالیں ملتی ہیں۔ دہلی اور لکھنؤ کے شعرا نے قطعہ کی روایت کو سنجیدگی سے آگے نہ بڑھایا کیوں کہ اِن کے نزدیک قطعہ کی کوئی خاص حیثیت نہ تھی بس کبھی کبھار قطعہ کہہ لیا کرتے تھے۔

اُردو میں قطعہ کی روایت فارسی سے آئی ہے۔ اُردو میں قطعہ نگاری کو قبولیت انیسویں صدی کے اواخر میں ملی ہے۔ اکبرالٰہ آبادی نے اِس صنف کی طرف توجہ دی اور اِن کی ظریفانہ شاعری قطعہ کی صورت میں ہے۔ حالؔی، شبلؔی، آزادؔ، اکبؔر اور اقبالؔ نے بھی قطعات کہے ہیں اور اِس میں فلسفیانہ مضامین کو بیان کیا ہے۔ اکبؔر اور اقبالؔ کے زیر اثر بیسویں صدی کے کچھ شعرا نے بھی دو چار قطعات کہے۔

اکبرالٰہ آبادی، اقبالؔ اور شادعظیم آبادی کے دور میں قطعہ اپنی ہیت کے اعتبار سے مضبوط ہو جاتا ہے۔ اکبؔر نے اپنے قطعات میں اِس دور کے سیاسی و سماجی موضوعات کو بیان کیا ہے۔ اقبالؔ نے بھی اکبؔر کے رنگ میں قطعات کہے لیکن شادعظیم آبادی نے قطعات کو ہی ذریعۂ اظہار بنایا۔

جمیل ملک لکھتے ہیں:

> ''شادعظیم آبادی اِس لحاظ سے قابلِ قدر ہیں کہ اُنھوں نے بیشتر قطعات کو ہی اظہار کا وسیلہ بنایا اور قطعہ کی صنف پر اپنے ایمان کو کبھی متزلزل نہیں ہونے دیا مگر فطری طور پر وہ اِن موضوعات سے آگے نہ بڑھ سکے، جو فارسی ادب کے ذریعہ اُردو رباعی اور قطعے پر اثرانداز ہوئے تھے۔'' [۲۴]

احمد ندیؔم قاسمی بڑے باکمال اور بلند پایہ شاعر ہیں۔ انھوں نے شاعری کی کئی اصناف میں لکھا ہے۔ ان کا ایک نہایت اہم کارنامہ اِن کے قطعات کے مجموعے ہیں۔ ندیؔم کے قطعات کا پہلا مجموعہ ''دھڑکنیں'' ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔ اِس میں ۲۵۲ قطعات شامل ہیں۔ اِن قطعات میں دو قطعات کا ایک ہی عنوان ''ماضی کی چٹکی'' ہے جب کہ

قطعات دونوں الگ الگ ہیں:

مجھ سے کل کھیتوں میں اِک مردِ معمر نے کہا
’’چلچلاتی دھوپ میں آوارہ کیوں پھرتا ہے تو؟
آہ لیکن مجھ کو کیا کہنا تھا اور کیا کہہ گیا!
میں بھی اِس سن میں پھرا کرتا تھا اکثر کُوبکُو!‘‘ ۵
(ماضی کی چٹکی)

بالوں میں بُوندیوں نے ستارے سے چُن دیے
وہ اوڑھنی ہوا کے تھپیڑوں میں پھڑپھڑائی
سینے پہ میرے کِس کی تجلّی کے ہیں خطوط
یہ کس نے دِل میں چٹکی سی لی، کس کی یاد آئی ۶
(ماضی کی چٹکی)

اِسی طرح اِس مجموعہ میں ’’عکسِ جمیل‘‘ اور ’’عکسِ لرزاں‘‘ دو قطعات ہیں، جن کے عنوان الگ الگ ہیں، لیکن قطعہ ایک ہے:

یوں میرے ذہن میں لرزاں ہے ترا عکسِ جمیل
دلِ مایوس میں یوں گاہے اُبھرتی ہے آس
ٹمٹماتا ہے وہ نوخیز ستارا جیسے
دُور مسجد کے اُس اُبھرے ہوئے مینار کے پاس ۷

ندیمؔ کے قطعات کا دوسرا مجموعہ ’’رم جھم‘‘ ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔ اِس میں ’’دھڑکنیں‘‘ کے قطعات بھی شامل تھے۔ اِس طرح ’’رم جھم‘‘ میں ۴۲۷ قطعات شامل ہیں۔ ’’دشتِ وفا‘‘ جو کہ ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔ اِس میں ۳۲ قطعات ہیں۔ ’’محیط‘‘ ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔ اس شعری مجموعہ میں ۱۵ قطعات شامل ہیں۔ ’’لوحِ خاک‘‘ ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا، اس میں ۷ قطعات شامل ہیں۔ ’’ارض و سما‘‘ جو کہ ندیمؔ کا آخری شعری مجموعہ ہے، ان کی وفات کے بعد ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا۔ اِس میں ۵ قطعات شامل ہیں۔

ندیمؔ نے جو آخری قطعہ لکھا، وہ غیر مطبوعہ تھا جو کہ درج ذیل ہے:

میں شہر سے تو بظاہر سفر پہ نکلا ہوں
مگر نہ سمت معین، نہ کوئی جادہ ہے
مرے شعور نے وجدان کو یہ مژدہ دیا
ترا خدا سے ملاقات کا ارادہ ہے ۸

ندیمؔ دیہات میں پیدا ہوئے اور اُنھوں نے اپنے بچپن اور جوانی کے ایام بھی گاؤں میں بسر کیے۔ ندیمؔ چوں کہ افسانہ نگار بھی ہیں اور اِس کا مشاہدہ بھی تیز ہے۔ اِن خصوصیات نے ندیمؔ کی صلاحیتوں کو اُبھارا اور اُنھوں نے اپنے ماحول اور گرد و پیش سے بڑے بڑے موضوعات لیے اور انہیں قطعے کی محدود صنف میں سمو دیا۔ ان کے یہ قطعات اپنے موضوعات اور زبان کے حوالے سے مقامیت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ مقامی آب و رنگ سے معاشرتی تصویروں کو اُبھارنے کا رنگ ندیمؔ کے ہاں نظر آتا ہے۔ اِن تصویروں کو ندیمؔ فارسی ترکیبوں اور ثقیل الفاظ کے رنگوں سے گراں بار نہ ہونے دیتے۔

انیسویں صدی کے ربع آخر اور بیسویں صدی کے ربع اوّل میں رومانوی تحریک سے اُردو ادب میں ایک نئے رجحان نے اپنی جگہ بنائی جسے رومانیت سے تعبیر کیا جاتا رہا۔ رومانیت کا لفظ ادب و فن میں بہت سے مفاہیم رکھتا ہے۔

ڈاکٹر محمد عالم خان کہتے ہیں:

> ''رومانیت زندگی کے مخصوص طرزِ احساس کا نام ہے جس کو فن اور ادب میں مختلف مفاہیم میں استعمال کیا گیا ہے، زندگی اور معاملاتِ زندگی کو دیکھنے اور پرکھنے کے بہت سے معیارات ہیں اور رومانیت بھی ان میں سے ایک پیمانہ ہے۔'' ۹

ندیمؔ کے ادبی شعور نے جس دور میں آنکھ کھولی اُس وقت یہ رجحان عروج پر تھا۔ ندیمؔ کے ہاں اس رجحان کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ اِس رجحان کی نمود میں اِن کے بچپن میں فطرت اور فطری زندگی سے قربت، کٹھن حالات کی وجہ سے بے اطمینانی، گاؤں کی لڑکی کی سادہ مگر پرخلوص محبت اور اختر شیرانی کی صحبت، اِن سب

عوامل نے مل کر اِن کے مزاج کی رومانوی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ اپنے ایک قطعہ میں ندیمؔ کہتے ہے:

اثر غم کو مادرِ فطرت
کتنے آہنگ سے سموتی ہے
میں تو کہتا ہوں اوس کے ہمراہ
پھول کی پنکھڑی بھی روتی ہے [۱۰]
(غمِ کائنات)

ندیمؔ کے قطعات میں فنی خصوصیات اور شاعرانہ لوازم موجود ہیں جو اِن کو دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتے ہیں۔ اُنھوں نے قطعہ کی صنف میں اِن تمام موضوعات کو بیان کیا جو اب تک صرف نظم، غزل اور مثنوی کے لیے موزوں سمجھے جاتے تھے۔ اِس طرح ندیمؔ نے حسن و عشق، حیات و کائنات اور عصری مسائل کو اپنے بھرپور اور مخصوص انداز میں قطعات میں سمو دیا اور اِسے اُردو شاعری کی دوسری پسندیدہ اصنافِ سخن کے دوش بدوش لا کھڑا کیا۔ اِن کے قطعات کا بڑا امتیاز یہ بھی ہے کہ اُنھوں نے قطعے کو اپنی شخصیت کے رنگ میں رنگ دیا۔

بقول جمیل ملک:

''اِس نے قطعہ کے چار مصرعوں کو ایک ایسا شعری آہنگ دیا جو اس سے پہلے اُردو قطعے کو نصیب نہ تھا۔ قطعات کی رنگا رنگی سے اس نے ایسے ایسے شگوفے کھلائے ہیں کہ اِن سے اٹھی ہوئی رسیلی خوشبو میں اِس کے دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں جن میں دنوں کی حدت اور راتوں کا سوز و ساز بھی کچھ موجود ہے۔'' [۱۱]

ندیمؔ قطعہ کو بلند مقام پر لے کر گئے ہیں اور اُنھوں نے اِس میں نئی سمت کو تلاش کیا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ، ندیمؔ کی قطعہ نگاری کے متعلق رقم طراز ہیں:

''اُنھوں نے قطعہ نگاری کے آداب و رسوم میں بھی ایک نئی سمت کی نشان دہی کی ہے۔'' [۱۲]

ندیمؔ نے اپنے قطعات میں حسن و عشق اور مسائلِ حیات و کائنات کو سمو دیا ہے۔ قطعہ جو کہ ایجاز و اختصار کا متقاضی ہے۔ ندیمؔ نے اِس فن میں اپنے امتیازی وصف کو قائم رکھا۔

جمیل ملک لکھتے ہیں:

> ''موجودہ دور میں ندیمؔ کو ہی قطعے کا پیش رو کہا جا سکتا ہے۔ ندیمؔ نے قطعے کی صنف کو ایک شاعر کی سی قدرت کے ساتھ برتا ہے اور اِسے ایک مرصع ساز کی طرح اپنی ذات کے ساتھ حیات و کائنات کی بوقلموں صورتوں کی جلوہ گاہ بھی بنا دیا ہے۔'' ۱۳

ندیمؔ کو ایک دیہاتی لڑکی سے عشق تھا۔ اگر چہ اس خوب صورت حادثے کے متعلق اُنھوں نے کبھی کسی سے گفتگو نہیں کی مگر اِن کی آغاز کی تخلیقات خاص طور پر اِن کے قطعات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ندیمؔ نے کسی ایک شخص سے بے پناہ محبت کی ہے اور جسے ندیمؔ پا بھی نہ سکے۔ اِس لڑکی کو پانے کی خاطر ندیمؔ پہاڑوں سے اُتر کر میدانوں میں نوکری کی تلاش کے لیے اُترا، لیکن جب پیسے لے کر گاؤں پہنچے تو اُس لڑکی کی شادی ہو چکی تھی۔ یہ لڑکی نہ صرف اُن کی زندگی پر اثر انداز ہوئی بلکہ اُس نے ندیمؔ کی تخلیقات پر بھی اثر ڈالا۔ یہ لڑکی کبھی صابی کے روپ میں جلوہ گر ہوئی اور کبھی صبوحی کے روپ میں اِن کی ہیروئن بنی۔ اِن کی محبت کے متعلق محمد طفیل رقم طراز ہیں:

> ''اُنھوں نے ایک دیہاتی لڑکی سے محبت کی تھی۔ یہ بات ہے جب کی کہ لکھنے کے میدان میں اُبھرتے چاند کی طرح تیزی سے بڑھ رہے تھے۔۔۔ اس لڑکی کے متعلق جو کچھ میری معلومات ہیں وہ یہ کہ بڑی خوب صورت مگر یتیم، غریب اتنی کہ نوبت فاقوں تک آئے۔ آپ بھی ماشاء اللہ بے کار، مطلب یہ کہ صحیح معنوں میں عاشق، جب دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُنھوں نے اپنے اِس ارادے کا ذکر اپنی والدہ سے کیا تو اُنھوں نے سمجھایا لیکن چوٹ نے کہیں زبان کی حلاوتوں سے تسکین پائی ہے جو اُنھیں تسکین ملتی، جب یہ کسی طرح نہ مانے تو شرط ٹھہری کہ پہلے دو تین سو روپے کماؤ، تب، چناں چہ اُردو کا یہ ادیب اور شاعر پہاڑوں سے اُترا، میدانوں میں آیا، چھوٹی چھوٹی نوکریاں کر کے روپے لے کر اپنے گاؤں پہنچا تو اِس لڑکی کی شادی ہو چکی تھی۔ اِس واقعہ کا بڑا شدید اثر اِن کی شخصیت پر پڑا، انھوں نے اپنی حالت پاگلوں ایسی بنا لی۔۔۔ یہ لڑکی اِن کی تخلیقات پر اثر انداز ہوئی۔ کبھی یہ صبوحی کے روپ میں آ کر اِن سے قطعات کہلواتی رہی اور کبھی یہ صابی کے روپ میں اِن کے افسانوں کی ہیروئن بنی۔'' ۱۴

انھی اثرات کے متعلق خود ندیمؔ کہتے ہیں:

"۔۔۔یہی وہ دور ہے جب مجھے شاعری کی نازک ترین گہرائیوں کا احساس ہوا ہے اور یہی وہ دن ہیں جن سے میرے فن کی ہر رنگینی عبارت ہے۔" [۱۵]

ان کی اس محبت کا عرصہ بہت تھوڑا رہا لیکن یہی وہ زمانہ تھا جس کے اثرات اِن کی ادبی شخصیت پر حاوی رہے۔ ابھی وہ محبت کے ابتدائی مرحلے یعنی جلوۂ حسن کے سامنے متحیر ہی تھے کہ ان کی محبوب جدا ہوگئی۔ شدید جھٹکے نے اِن کی تخلیقی شخصیت پر بڑے تلخ اثرات مرتب کیے۔ محبت کا یہ حادثہ اِن کی ادبی تخلیقات کے بالکل ابتدائی دور میں پیش آیا۔ اِس لیے اِن کی تمام تخلیقات میں اِس جذبے کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اِن کے بیشتر قطعات اِن کی محبت کی کہانی سناتے ہیں۔

محمد طفیل لکھتے ہیں:

"یہ لڑکی ان کی زندگی پر اثرانداز ہوئی۔۔۔ دھڑکنیں (رم جھم) کے بیشتر قطعات اسی محبت کی روداد ہیں یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ دھڑکنیں کے تمام قطعات اُنھوں نے چھپ چھپ کر کوئی ہفتہ بھر میں کہہ ڈالے تھے۔ یہ ایک لگن تھی جس نے ایسے بولتے ہوئے قطعات اتنے مختصر سے وقفہ میں اِن سے کہلوا دیے۔" [۱۶]

ندیمؔ کے قطعات کی طرف رغبت کی اصل وجہ اِن کی محبت تھی۔ اِس محبت کا جذباتی وفور اِس قدر تھا کہ اسے نہ تو نظم کا منضبط مزاج برداشت کر سکتا تھا اور نہ ہی غزل کی بے ربطی، نہ نظم کی طوالت، نہ غزل کے شعر کا اجمال، اسے تو وہ فنی سانچہ درکار تھا جہاں جذبہ کسی زیادہ سخت گیر فنی ضابطے میں دب نہ پائے اور اِس کا اظہار بھی فوری ہو سکے۔ اِس کے ساتھ ساتھ ندیمؔ کو وہ مناسب اختصار بھی درکار تھا، جس کا تقاضا جوش جذبات کا خاصا ہے۔ اِس لیے اِن کے تخلیقی شعور نے قطعے کی طرف توجہ کی جس کی مختصر ہئیت اِن کے جذبات کے اظہار میں معاون ثابت ہوئی اور یوں اُنھوں نے محبت کے متعلق اپنے جذبات کو احسن طریقے سے اپنے فنی اظہار کا حصہ بنایا۔

ستارے ماند پڑتے جا رہے ہیں، صبح آ پہنچی
اندھیرا نور کے سیلاب سے گھبرا کے بہ نکلا

صبوحی مختصر کیوں ہو گئی ہیں آج کل راتیں؟
تجھے میں نے اب تک خُوب جی بھر کے نہ دیکھا تھا ۱۷
(مختصر راتیں)

اے محبت، اے مرے جذبات کی رنگین اڑان
ابتدا کتنی رسیلی تھی تیری، کتنی گداز
اور یہ انجام جیسے خوں شدہ کلیوں کا ڈھیر
اور یہ تیری یاد، جیسے باز کے چنگل میں قاز ۱۸
(اے محبت)

ملگجے پردوں میں چھپ کر چاند کیا سوچا کیا؟
تارے کس کی فکر میں آنکھوں کو جھپکاتے رہے
اِک میرے دل ہی میں تھا، تیرا تصور میرے دوست!
یا زمانے بھر کو تیرے ہی خیال آتے رہے ۱۹
(تصورِ دوست)

قطعات میں ندیم نے محبت کی کیفیات کے ساتھ ساتھ ایسے جذبات کو بھی شاعری کا پیرایہ عطا کر دیا جن پر احساس کی گرفت محض چند لمحوں پر محیط ہوتی ہے۔ ندیم نے اپنے قطعات میں محبت کی کہانی تمام تر جزئیات کے ساتھ بیان کی ہے۔ تسنیم سلیم چھتناری نے اپنے ایک مضمون ''رم جھم'' مشمولہ ''مٹی کا سمندر'' میں ندیم کے قطعات کو مرتب کر کے انہیں کہانی کی شکل دی ہے جس سے اِن کے قطعات میں ایک لڑکے اور ایک لڑکی کی محبت کی داستان بن جاتی ہے جو محبت کے آغاز سے انجام تک پر محیط ہے۔ قطعات کی اِس کہانی اور ندیم کی اپنی کہانی میں بہت حد تک مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔ ندیم کو اپنی زندگی میں محبت کی جن نازک ترین گہرائیوں کا احساس ہوا تھا۔ اُنھوں نے اِن چھوٹی چھوٹی کہانیوں کو قطعات کے اِس مختصر سانچے میں ڈھال دیا تھا جو کہ اِس کے جذبے سے پوری طرح ہم آہنگ تھیں۔

ندیم کے قطعات کا بڑا موضوع رومانیت ہے۔ ندیم محبت میں اپنی ناکامی اور محرومی کا حل زندگی کے

مسائل میں تلاش کرتا ہے۔ غمِ روزگار کے موضوع کو بھی داغِ محبت کی طرح اپنے سینے سے لگا لیتا ہے لیکن محبت میں ناکامی کے باوجود جینے کے دوسرے قرینے بھی سیکھ لیتا ہے۔ ندیمؔ کی ارضی محبت اور رومانیت اسے زندگی کے مسائل اور حقائق سے فرار نہیں سکھاتی بلکہ زندگی کے حقائق سے اپنا رشتہ اور بھی استوار کر لیتی ہے۔ ندیمؔ نے اِن جذبات کا اظہار ''دھڑکنیں'' کے پہلے قطعہ میں یوں کیا ہے:

خوش راتوں میں جو دھڑکنیں بکھرتی رہیں
میں اِن کو ایک لڑی میں پرو کے لایا ہوں
تو اِن کو صرف اچٹتی ہوئی نظر سے نہ دیکھ
کہ میں ستاروں سے اُڑ کر زمیں پہ آیا ہوں ۲۰

ندیمؔ کے قطعات میں حسن کی رعنائیاں اور رومان کی پرچھائیاں جابجا ملتی ہیں۔ اِس کے قطعات کا مرکز و محور غیر مرئی مخلوق نہیں بلکہ اِسی دنیا کی جیتی جاگتی عورت ہے۔ ندیمؔ کی محبوبہ صبوحی کی صورت میں ہمارے اِردگرد اور دیہات کی فضا میں پل کر جوان ہوتی ہے۔ ندیمؔ اور صبوحی کھیتوں اور کھلیانوں کے پروردہ ہیں۔ انھوں نے اس مٹی میں محبت کے خواب دیکھے ہیں اور اِسی فضا میں اِن کی محبت دفن ہے۔ اِسی لیے یہ ساری کی ساری فضا حقیقی اور فطری ہے۔ ندیمؔ کہتا ہے کہ:

شب طویل کٹی، ڈوبنے لگے تارے
وہ لے رہی ہے سحر کی حسینہ انگڑائی
میں اب بھی وادیِ ویراں میں منتظر ہوں تیرا
صبوحی! کیوں تجھے وعدے کی شب نہ یاد آئی ۲۱
(انتظار)

اے میری صبوحی! تجھے اغیار کو سونپا
میں اب ترے اصرار پہ گھر لوٹ تو جاؤں
لیکن تجھے کاٹیں گے یہ ابریشمیں پردے
ڈولی سے نکل آ تجھے آنکھوں پہ بٹھاؤں ۲۲
(عرضِ نیاز آخری)

جا رہی ہیں ٹھنڈ سے سمٹی ہوئی پنہاریاں
گا رہے ہیں چند چرواہے ترانے دُکھ بھرے
اے میری مرحوم محبوبہ ترے کمزور ہاتھ
میں نے لہراتے ہوئے دیکھے دھندلکوں سے پرے ۲۳

(مرحوم محبوبہ)

میری کٹیا میں صبوحی کا یہ دزدانہ ورود
میری آنکھیں فرطِ حیات سے جھپک کر رہ گئیں
میٹھے میٹھے درد کی سوئی ہوئی چنگاریاں
آرزو کی راکھ سے اُبھریں بھڑک کر رہ گئیں ۲۴

(خوابیدہ چنگاریاں)

ندیم کے اِن قطعات کا بنیادی موضوع رومان ہے جس میں صبوحی نمناک آنکھوں اور مسکراتے ہونٹوں کے ساتھ اپنے محبوب کا انتظار کرتی نظر آتی ہے اور اِس کے ہاتھوں کی مہندی اور لبوں کی سُرخی، شاعر کے خانۂ دل میں جگمگ جگمگ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ''رم جھم'' کے قطعات میں ندیم شہر کی غیرمانوس اور پرہجوم فضا میں دیہات کی کھلی فضاؤں سے بچھڑنے اور صبوحی سے جدا ہونے پر غمگین اور افسردہ دکھائی دیتے ہیں۔ ایک طرف گاؤں اور صبوحی کی یادیں ہیں تو دوسری طرف زندگی کے تقاضے اور غمِ روزگار شاعر کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اگرچہ شہر کا پروردہ تصورِ محبت کسی زلیخا کی طرح شاعر کو اپنی طرف کھینچتا ہے مگر ندیم بار بار صبوحی کی طرف لوٹتا ہے اور تخیلاتی طور پر صبوحی کی آغوش میں رہتا ہے۔ قلزم زندگی کے ایک کنارے پر حیا و وفا کی پیکر صبوحی کھڑی ہے تو دوسرے کنارے پر زیب و زینت کی پروردہ دانۂ گندم کے عوض اپنی عصمت کا سودا چکانے کی خاطر شاعر کو دعوتِ نظر دے رہی ہے۔

خزاں کے ساتھ ہی میرے اُداس ذہن میں کیوں
جمالِ یار برنگِ بہار آتا ہے
یہاں سے اب میں کہاں جاؤں اے مرے خوابو
یہی وہ موڑ ہے جو بار بار آتا ہے ۲۵

(یاد کی شیرینی)

ہاتھ میں دف ہے پاؤں میں جھانجن
اور ماتھے پہ سانپ کی تصویر
میری نیندوں میں ناچنے والی
تو نہ ہو میرے خواب کی تعبیر ۲۶
(تعبیر)

اگر چہ یہ جنسی محرکات شاعر کو اپنے حصار میں لینے کے لیے کوشاں ہیں مگر روحانی محبت کی یاد ایک جھلملاتے ستارے کی نرم روشنی بن کر سکون و اطمینان کا سامان میسر کرتی ہے۔

جب کسی کا خیال آتا ہے
اک دھندلکا سا پھیل جاتا ہے
اور اس بے کراں دھندلکے میں
اک ستارہ سا جھلملاتا ہے ۲۷
(یاد)

یاد کے ستارے کی جھلملاہٹ صبوحی کا پرتو ہے تو کہیں کہیں حوا کی بیٹی کی لمسی کروٹ کا اظہار بھی ہوا ہے:

ضوفشاں ہے میرے خیالوں میں
اُجلے اُجلے تبسموں کی دھار
جیسے بدمست آنکھ میں ڈورے
جیسے بجلی کے قمقمے میں تار ۲۸
(نقرئی یاد)

بجلی کے قمقمے شہری انداز اور رنگ ڈھنگ کا واضح اشارہ ہیں جو آہستہ آہستہ صبوحی اور شاعر کی زبان سے واضح تر صورت میں سامنے آتے ہیں۔

اُلٹی سیدھی باتیں کر کے تم مجھ کو بہلاتے ہو
میرے پروں کو نوچ کے اب تاروں کی سمت اُڑاتے ہو
تم نے شاید رس پینے کو اور بھی کلیاں چن لی ہیں
آتے ہو بھنورے کی طرح منڈلاتے ہوئے اُڑ جاتے ہو ۲۹
(رس کا لوبھی)

کہیں کہیں تو ہمیں ایسا لگتا ہے کہ بجلی کے قمقموں کے مقابلے میں ندیم کے چراغِ تخیل کی لو بھی ماند پڑ جاتی ہے اور اُس پر ملائم اور رنگین پردے پڑ جاتے ہیں۔ اگر چہ وہ جسمانی طور پر پیکر محبوب سے پیاس بجھاتا ہے مگر روحانی طور پر صبوحی کی پرستش میں بھی مگن دکھائی دیتا ہے۔ روح اور جسم کی یہ کش مکش محبت کی ٹریجڈی کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور شاعر کو فرطِ غم میں اپنی محبت کے ساتھ ساتھ اپنا پیرہن بھی چاک چاک دِکھائی دیتا ہے۔

تیری بے لوث مسکراہٹ بھی
تند شعلوں کی لہر بن کے رہی
میں نے جس چیز سے محبت کی
وہ میرے حق میں زہر بن کے رہی ۳۰

(دوسرا رُخ)

''رم جھم'' کے قطعات میں ندیم کی شخصیت اور اِن کی محبت شہر و دیہات میں تقسیم ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے لیکن اُنھوں نے انسانی کمزوریوں کو چھپانے کی نہ تو کبھی کوشش کی اور نہ ہی کبھی اپنی شخصیت پر پاک بازی کا مصنوعی خول چڑھایا۔

صبوحی اور بنتِ حوا، ندیم کے احساس وشعور کے دریچے وا کر جاتے ہیں اور یوں ''دشتِ وفا'' تک پہنچتے پہنچتے ندیم کا نظریہ عشق پیکرِ محبوب کے آفاقی تصور میں ڈھل جاتا ہے۔ جس میں ماضی و حال کے جگنو ایک روشن مستقبل کی بنیاد بن جاتے ہیں۔

تو میرا شعور، میرا وجدان
تو میرا یقین، میرا ایمان
میں تیری سپردگی کا معیار
تو میری پرستشوں کی پہچان ۳۱

(دشتِ وفا)

ندیم کی محبت اِن کی شعری رفعتوں میں اِن کی معاون رہتی ہے، وہ خود سمجھتے ہیں کہ عشق کا، مجازی عشق کا تجربہ کسی شخص کو بھرپور شعری تجربے کے قابل بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ندیم اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

''میں نے اس مسئلے پر خاص طور پر غور کیا ہے کہ جن شاعروں کی شاعری خشک، بے رنگ اور بے اثر ہوتی ہے وہ دراصل عشق کے حیات بخش اور حسن افروز تجربے سے محروم

> ہوتے ہیں۔۔۔ اور یاد رکھیے کہ میں جب عشق کہتا ہوں تو اِس سے میں کسی فلسفیانہ یا متصوفانہ اصطلاح کی طرف اشارہ نہیں کرتا، اس عشق سے میرا مطلب مرد کا عورت کے ساتھ، عورت کا مرد کے ساتھ عشق ہے۔'' ۳۲

جو لوگ اِس طرح عشق کرتے ہیں جیسے سودا کر رہے ہوں، ایسے شاعروں کی شاعری کو پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے بڑھئی تصویریں بنا رہا ہو، اِن کا موضوع چاہے عشق ہو یا فلسفیانہ نظریات۔ ایسے شاعر عشق سے دُور بھاگتے ہیں۔ اگر شاعر کو عشق کا تجربہ ہو تو اِس سے زندگی میں نہ صرف گداز، حسن، نرمی اور توازن پیدا ہوتا ہے بلکہ اِن کے عشقیہ موضوع میں بھی روانی پیدا ہوتی ہے۔

ندیمؔ کو محبت کی اِس تلخی کا سامنا کرنا پڑا اور اِسی جذبے کو اُنھوں نے اپنی شخصیت کی تکمیل کا ذریعہ بنا لیا۔ ندیمؔ نے محبت کے اِس زخم کو تو جھیل لیا مگر اِس محبت کو عمر بھر کے لیے اپنے ساتھ رکھ لیا اور کبھی اِس کا تجربہ اور کبھی اِس کا تجزیہ کر کے ایک ایسا تصورِ محبت تشکیل دینے کی کوشش کی جس کے ہالے میں پوری انسانی برادری آنے لگتی ہے۔

فتح محمد ملک رقم طراز ہیں:

> ''یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ندیمؔ محبوب کے حسن اور عاشق کے جذبات کی ترجمانی کے دوران اپنی داخلی زندگی اور آفاق کی وسعتوں کے درمیان ایک مشترک رشتہ استوار کر لیتے ہیں اور اِن کے دل کی دھڑکن کائنات سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔'' ۳۳

ندیمؔ کے قطعات میں اپنی انفرادیت کو اِس طرح بھی قائم رکھا ہے کہ اُردو شاعری میں پہلی بار پنجاب کی دیہاتی ثقافت اور اِس سے اخذ کی گئی روایات اور علامات نظر آتی ہیں۔ اِن کے قطعات میں یہ رنگ اِن کے مشاہدات اور تجربات کی صورت میں جلوہ گر ہوا ہے۔ کوئل، پپیہا، گڈریا، چرواہا، کسان، درانتی، چوپال اور پگڈنڈی وغیرہ جیسی علامات اِن کی شاعری میں اُبھر کر مقامی رنگ آمیز کرتی ہیں، جس سے احساس ہوتا ہے کہ یہ ہمارے دیکھے بھالے مناظر سے لی گئی ہیں۔ ان کے قطعات میں مقامیت کا رنگ خاصا گہرا ہے۔ اِن کے قطعات پر عربی و فارسی کی غیر مانوس تراکیب و تلمیحات کا رنگ نظر نہیں آتا اور نہ ہی ہندی الفاظ کو بلاضرورت استعمال کیا گیا

ہے، ندیم تراکیب، تشبیہات و استعارات اور ان کے برجستہ استعمال میں محتاط ہیں۔ ندیم کی سادگی اور سہل پسندی کی طرف بھیڑیں، کنکر، ملاح، کھنڈر، پنگھٹ، گاگریں، نیم، ساون، ندی، بوندیں، بادل، چڑیا، چرواہیاں، کونجیں، مرغے، مرغیاں، گائیں، میلہ، کجاوہ، ملہار، عید، بیری، سبز کھیت، گنگا، دریا کا کنارہ، پہاڑی راہ، چکی کی صدا، خشک ٹہنیوں کی آگ، مڑتی راہیں، سرسوں کے کھیت، چھاج، چیت کی چاندنی راتیں، گیہوں کی بالیاں، یہ چند الفاظ تراکیب اشارہ کرتی ہیں اور ندیم کے مقامی موضوعات کے اظہار و ابلاغ کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ندیم کہتے ہیں:

کچی دیواروں پہ رقصاں ہے دیئے کی روشنی
چھت کے اک سوراخ سے اُٹھتا ہے رہ رہ کر دھواں
کس کی آمد ہے کہ دروازے پر ہیں بیٹھے ہوئے
بھولے بچے مست دوشیزائیں اور بانکے جواں ۳۴
(استقبال)

وہ رات آئی وہ عالم پہ خاموشی چھائی
وہ اِک چٹان پہ اک بھیڑ چڑھ کے ممیائی
تو کس خیال میں گم تھا خموش چرواہے
کہ ایک ننھی سی جاں کی تجھے نہ یاد آئی ۳۵
(بےخبری)

ندیم نے قطعات میں جو کہانیاں بیان کی ہیں اُن کہانیوں کے تار و پود دیہات کی فضا میں بُنے ہیں۔ دیہات کی عوامی زندگی سے چنی گئی اِن کہانیوں میں حسن و رومان کی چھاؤں بھی ہے اور حرکت و عمل کی دھوپ بھی۔ ندیم کیوں کہ باریک بین نظر رکھتے ہیں، اس لیے انہیں کہیں بھی الفاظ اور علامات کے چناؤ میں دقت پیش نہیں آتی بلکہ وہ علامتوں اور لفظوں کا رنگا رنگ ذخیرہ لے کر آتے ہیں۔ اِن کے پاس خیالات و افکار اور الفاظ کا جو سرمایہ ہے وہ اُنھوں نے اپنے گردوپیش اور ماحول سے اکٹھا کیا ہے۔ اِن کے تجربات اور مشاہدات کی دنیا وسیع ہے۔ ندیم کے خیالات کہیں بھی الفاظ کی تلاش میں ٹھوکر نہیں کھاتے۔

کل گاؤں سے کچھ دور اِک افسردہ گڈریا
ایک پیڑ کی شاخوں کو کھڑا چوم رہا تھا

میں بولا یہ کیا کھیل ہے کہنے لگا ہنس کر
کچھ بوجھ سا تھا جی پہ یوں ہی گھوم رہا تھا ۳۶
(ایک کھیل)

باجرے کی فصل سے چڑیاں اڑانے کے لیے
ایک دوشیزہ کھڑی ہے کنکروں کے ڈھیر پر
وہ جھکی، وہ ایک پتھر سنسنایا وہ گرا
کٹ گئے ہیں اس کے جھٹکے سے میرے قلب و جگر ۳۷
(لچک)

ندیم چوں کہ خود ان مراحل سے گزرا ہے۔ انھوں نے اپنے جذبات کو زبان دے کر ہیتی سانچوں میں ڈھالا ہے۔ یہ تمام واقعات شاعر کی اپنی زندگی پر بیت چکے ہیں اور اِس کے احساس و ادراک کا جزو بن چکے ہیں۔

شام کو کل اِک مسافر نے کیا مجھ سے سوال
''ختم ہو جاتی ہے اِس وادی کی پگڈنڈی کہاں؟''
اُن دھندلکوں کی طرف میں نے اشارہ کر دیا
اور بھری ہوئی آواز میں بولا۔ ''وہاں!'' ۳۸
(دھندلی پگڈنڈی)

ندیم کے قطعات میں دیہاتی زندگی کی جس خوب صورتی سے عکاسی کی گئی ہے۔ جس طرح وہاں رہنے والوں کے طرزِ رہن سہن اور جذبات و محسوسات کو پیش کیا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

اِس حوالے سے کشمیری لال ذاکر (چندی گڑھ) رقم طراز ہیں:

''احمد ندیم قاسمی کے قطعات کی ایک خصوصیت دیہاتی زندگی کی خوب صورت عکاسی ہے۔ میرے ذہن میں کوئی اور دوسرا شاعر نہیں جس نے پنجاب کی دیہاتی زندگی کو اور اِس کے رہنے والوں کی دھڑکنوں، احساسات اور جذبات کی اِس خوب صورتی سے ترجمانی کی ہو۔'' ۳۹

ندیم کو طبقاتی تضاد کا بھی شدید احساس ہے۔ اِن کے قطعات میں کسانوں اور مزدوروں کے دلوں میں بغاوت کی جو چنگاریاں جنم لیتی ہیں۔ زمین دار اپنی عیش وعشرت کی وجہ سے اُن کا استحصال کرتے ہیں۔ اِن سب کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ندیم صرف بلندی اور پستی کا شکوہ خدا سے کر کے خاموش نہیں ہو جاتے بلکہ وہ زمین داروں کی اِس عیاشی اور استحصال کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند کرتے ہیں۔ اِس طرح اِن کے قطعات میں بغاوت کی چنگاریاں اُبھرتی ہیں کیوں کہ ندیم پیداواری رشتوں اور اِن کے باہمی تعلق کو اچھی طرح جانتے ہیں۔

ہے رقص طوائف کا زمیندار کے گھر پر
پردیس سے آئے ہیں کئی یار پرانے
وہ چند غریبوں کو گریباں سے پکڑ کر
بھیجا ہے زمیندار نے بیگار پر تھانے [۴۰]

(محروم عیش)

محتاج کسی کی بھی نہیں میری جوانی
مزدور ہوں کھاتا ہوں پسینے کی کمائی
اے ریشم و کمخواب میں لپٹے ہوئے کوڑھی
کیوں تو نے مجھے دیکھ کے یوں ناک چڑھائی [۴۱]

(مزدور کی جوانی)

ندیم، ملک میں تیزی سے بڑھتی ہوئی سرمایہ داری کے رجحان سے بھی بے خبر نہیں۔ کسان جب روزگار کی تلاش میں دیہاتوں کو چھوڑ کر شہروں کا رُخ کرتے ہیں تو سرمایہ دار اُن کا استحصال کرتا ہے۔ اپنے کارخانوں اور فیکٹریوں میں اِن سے کام لیتا ہے۔ اِس طرح اُن کی محنت نچوڑ کر نئے نئے محل تعمیر کرتا ہے۔

بلک رہی ہے دما دم مشین آٹے کی
گرج رہا ہے وہ پٹڑی پہ شعلہ بار انجن
وہ تنگ باڑوں پہ بھیڑیں پکارتی ہیں مجھے
کہ آج پیٹ کے کہنے پہ تج رہا ہوں وطن [۴۲]

(پیٹ، پیٹ)

ندیم کی جاگیرداری نظام اور طبقاتی استحصال کے خلاف انقلابی سوچ اُن کے قطعات میں جا بجا نظر آتی ہے۔ انسان جس کو فرشتوں نے سجدہ کیا اور جو خدا کا محبوب اور نائب ہے، اُس پر جاگیردار، جو کہ دیہات کا خدا بنا ہوا ہے، وہ جس طرح اُن کا استحصال کرتا ہے اور اُن کی محنت کو خریدتا ہے۔ ندیم نے اُس کی حقیقت آفریں تصویریں اپنے فنی آئینے میں منعکس کی ہیں۔

افسوس لگان آج ادا کر نہیں سکتا
لیکن میری بیٹی کا یہ جھومر نہ اُتارو
کس طرح منائے گی یہ کل عید کا تہوار
اے ابلقِ ایام کے بے رحم سوارو ۴۳

(بے رحم)

کسانوں کی محنت سے کھیتوں سے اُگتا ہوا سونا زمین دار کے گھر جاتا ہے جب کہ کسان اپنی بیٹی کے زیور بیچ کر بھی حکومتِ وقت کو لگان ادا نہیں کر سکتا۔ ندیم کہتے ہیں:

گندم کی بالیوں میں جڑے ہیں لہو کے رنگ
فصلیں اُگی ہوئی ہیں کہ لاشوں کے شہر ہیں
رنگوں کی یہ بہار ہے یا حشرِ رنگ ہے
اوپر سے کھیت سبز ہیں، اندر سے زہر ہیں ۴۴

نظامِ آزادی اور جمہوریت کے کھوٹے سکوں کو بھی ندیم کی تیز نگاہ خوب جانتی ہے۔ نام نہاد عوامی نمائندے ووٹ لینے کے لیے تو آتے ہیں لیکن منتخب ہونے کے بعد وہ اِن مظلوم و محکوم لوگوں کے مسائل سے بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ ندیم اُس آزادی کا خواہاں ہے جس سے یہ طبقاتی تضاد اور سامراج کی غلامی ختم ہو سکے۔ کسان اپنی محنت کا پھل خود اُٹھا سکے۔ آزادی اور جمہوریت کے واضح اشارے ان قطعات میں نظر آتے ہیں۔

وہ کسی بے خوف دیہاتی نے موٹر روک لی
اِک رئیس اترا ہے برساتا ہُوا نخوت کی بھاپ
''کیا شکایت ہے''؟ وہ غرّایا وہ دیہاتی بڑھا
''ووٹ لے لیتے ہیں اور روٹی نہیں دیتے ہیں آپ!'' ۴۵

(ووٹ)

ندیمؔ نے شفیق فطرت کی گود میں پرورش پائی۔ محبت کی نرماہٹ کو محسوس کیا۔ اِس لیے وہ مزدور اور کسان کے استحصال پر آنسو بہاتا ہے۔ ندیمؔ جانتا ہے کہ سامراجی طاقتیں حصولِ زر و دولت اور ہوس ملک گیری میں ہمیشہ امن کو تباہ کرتی ہیں اور اپنی نو آبادیوں سے سپاہیوں کو میدانِ جنگ کی نظر کر دیتی ہیں۔ اس لیے ندیمؔ کے نزدیک انسان کی تخلیقی صلاحیتیں کشادہ فضا اور پر امن ماحول میں ہی بہتر نشو ونما پاتی ہیں۔

بقول عزیز حامد مدنی:

''ندیمؔ صاحب کے یہاں بھی ایک تازہ فکر نوجواں شاعر کا پہلا تخلیقی استعجاب ملتا ہے جو سماج کے نشیب و فراز کی بے اعتدالیوں میں چھپا ہوا، اِن کے قطعات میں آتا ہے۔ یہ ذہن ابھی شہری فضا سے آلودہ نہیں ہے۔ یہ اِس کی بے اعتدالیوں میں فکر کی کھلتی ہوئی تہوں میں نفاستیں نہیں ڈھونڈ رہا ہے۔ یہ تازہ دم ہے۔ ابھی یہ مسموم نہیں ہے۔ ابھی اِس کی تلاش اپنی ہے۔'' [۴۶]

ندیمؔ کی محبت کی کہانی کا تانا بانا بھی گاؤں کی فضا میں بُنا گیا اور یوں نظر آتا ہے کہ شاعر کی محبوبہ صبوحی اِسی خوف ناک ذات پات کی تمیز، پرانی رسومات، معاشرتی اور طبقاتی کش مکش کا شکار ہوگئی جو اِس معاشرے کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ ندیمؔ کی نظر تمام طبقاتی تضاد پر ہے اور وہ مکمل طور پر نسلی تفریق اور جبر و اختیار کے محرکات کو بھی سمجھتا ہے مگر اپنے تمام تر شعور و خلوص کے باوجود اپنی محبوبہ صبوحی کی پکار سُن کر بھی اُس کے درد کا مداوا نہیں کر سکتا۔ ندیمؔ کہتا ہے:

آندھیوں کے تند رو جھونکوں سے گھبرائی ہوئی
دیر تک گلیوں کی شمعوں نے جب اپنا سر دھنا
خلوتِ دل میں اُٹھی بے بس صبوحی کی صدا
کس نے مجھ دُکھیا کا اِس سنسار میں دکھڑا سُنا [۴۷]

(حسنِ مایوس)

ندیم کی کسانوں اور مزدوروں کے ساتھ محبت دراصل اُس کی اپنی مٹی کے ساتھ لگاؤ کی عکاسی ہے اور یہی محبت اُسے فطرت کی آغوش میں لے جاتی ہے۔ جہاں وہ ایک معصوم بچے کی طرح وادیوں اور پگڈنڈیوں پر حیرت کی نگاہ ڈالتا ہے اور کبھی کبھار اُس کی رومان پسند طبیعت میں تڑپ پیدا ہو جاتی ہے۔ شاعرانہ تخلیق کے ایسے لمحات میں اُس کا پُرسکون مزاج ایک ندی کی طرح کا بہاؤ اختیار کر لیتا ہے اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر فطرت کی آغوش میں گم ہو جاتا ہے اور مظاہرِ فطرت کے تلازمات سے اپنا رشتہ مضبوط کر لیتا ہے۔

ادھر آؤ نہائیں جھیل کے شفاف پانی میں
چلو موجوں سے کھیلیں مست ہو کر گیت گائیں ہم
ادہر آؤ بلاتی ہیں یہ بل کھاتی ہوئی راہیں
چلو پربت کی چوٹی پر ستارے توڑ لائیں ہم ۴۸

(دعوت)

حسنِ فطرت کے بارے میں ندیم کا نظریہ کشادہ ہوتا جاتا ہے اور وہ حسنِ فطرت کو طفلِ ناداں کی طرح حیرت سے دیکھتے دیکھتے اُس کی پنہائیوں میں گم ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی مظاہرِ فطرت کی ہمراہ ایک طویل سفر پر گامزن ہوتا ہے مگر محکومیت اور غربت کی وجہ سے شاعر کے اندر ایک ایسا جذبہ بھی بیدار ہو جاتا ہے جو اُسے فطرت کے مقابل کھڑا کر دیتا ہے اور وہ محبوبِ فطرت ہی نہیں بلکہ رقیبِ فطرت اور حریفِ فطرت بھی دکھائی دیتا ہے اور یہ سوچ شاعر کے اندر غریبوں اور لاچاروں کی آہوں اور سسکیوں کی وجہ سے پیدا ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

محکوم بھی ہوں، غریب بھی ہوں
آوارہ و بدنصیب بھی ہوں
باوصف تمام خامیوں کے
فطرت میں ترا رقیب بھی ہوں ۴۹

(رقیب)

شاعر کی نظر میں اس مرحلے پر مظاہرِ فطرت کے مفہوم میں بھی وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ علاماتِ فطرت میں وفا و جفا

کے تصورات کو بغور دیکھتا ہے تو اُس کے ذہن میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ شبنم کی بے وفائی ہی دراصل اُسے محبت کی لافانی خوشبو سے محروم کرتی ہے۔ فطرت میں محبت و وفا کے منفی پہلو کو دیکھنے کے بعد ندیم ''دشتِ وفا'' کی منزل تک عشق و محبت کے مثبت پہلو بھی ڈھونڈ لیتا ہے۔ جس کے تناظر میں فن کار طبعی موت تو مر جاتا ہے، وہ اپنے چاہنے والوں کو بھی بھلا سکتا ہے مگر اُس کی محبت مظاہرِ فطرت میں ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔

میری خاموشی پیہم پہ نہ جا
تو مجھے اب بھی نہیں بھولا ہے
چاندنی رات کی آواز تو سُن
ابھی خورشید کہاں ڈوبا ہے ۵۰
(دشتِ وفا)

ندیم مظاہرِ فطرت کے ساتھ اپنا رشتہ استوار کرتا ہے اور اپنے مخصوص انداز کے ساتھ اپنے فن کا رشتہ عدم کے وجود کے ساتھ جوڑتے ہیں۔

بقول جمیل ملک:

''کرۂ ارض پر مثبت و منفی اور حق و باطل کی اس آویزش میں عملی شرکت کی وجہ سے شاعر کے عزم و ہمت میں اتنی استقامت اور اِس کی شخصیت میں اتنا کس بل آ جاتا ہے کہ وہ زندگی کی اِس دھوپ چھاؤں اور اضداد کے اِس حسن میں کھو کر جب نظام سیارگاں میں لطف تصادم کی عدم موجودگی اور ماورائے کائنات، قدرت کی یک رنگی دیکھتا ہے تو ارضیت میں اس کی فکر کی جڑیں اور دُور تک پھیل جاتی ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مظاہر فطرت کے جن تلازمات سے شاعر اپنا رشتہ استوار کرتا ہے۔ وہ اپنے آغاز و انجام اور طلوع و غروب کے مخصوص انداز کے ساتھ پھر شاعر کے اسلوب و فن کا ناطہ وجود و عدم سے منسلک کر دیتے ہیں۔'' ۵۱

اگرچہ ''رم جھم'' اور ''دشتِ وفا'' کے قطعات میں ندیم کا فن رشتۂ زمین سے منسوب ہے مگر آہستہ آہستہ اُس کا

اسلوب و اظہار کا ناطہ مظاہرِ فطرت اور ارضی علائم و رموز سے کمزور ہوتا جاتا ہے۔ اُس کی وجہ ندیمؔ کے بدلتے ہوئے ماحول اور ارتقاء پذیر شخصیت میں تلاش کی جا سکتی ہے۔ شاعر دیہات سے شہر کی طرف منتقل ہوتا ہے اور غیر محسوس طریقے سے اُس کے احساسات و جذبات پر فطری مظاہر اور گاؤں کے نقوش و علامات کا عکس مدھم پڑتا جاتا ہے۔ شہر کے تقاضوں، تحریکوں اور روشنیوں کا ساتھ دینے کے لیے شاعر کا احساس و شعور اپنے اظہار و ابلاغ کے نئے اسالیب دریافت کر لیتا ہے۔ ''دھڑکنیں'' سے ''رم جھم'' تک شاعر فکری و فنی طور پر دیہات سے شہر اور شہر سے دیہات کی طرف جاتا اور پلٹتا نظر آتا ہے مگر ''دشتِ وفا'' کے قطعات کو اُس کی قطعہ نگاری کا حاصل یا نقطۂ عروج کہا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ وہ اِس تصادم سے سلامت گزر کر ایک سطح اپنا لیتا ہے۔ جس میں فکر و فن کی مہارت، مردانہ آہنگ کے ساتھ ساتھ ندیمؔ کے الفاظ و انداز میں بھی دھرتی کے خدوخال کا عکس ہی نہیں ملتا بلکہ اُس کی تلمیحات و علامات علمی و فکری طور پر آفاقیت پسند اور خیال انگیز ہوتی چلی جاتی ہیں۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ بے شمار سرچشموں کی صورت میں جنم لینے والا ندیمؔ کا فن ایک پھیلتے اور بڑھتے ہوئے دریا کی صورت میں سمندر میں ڈھلنے کے لیے بے تاب ہے۔ شاعر کے سامنے فکر و فن کے نئے نئے دریچے وا ہو جاتے ہیں۔

چمن میں دیکھ کر نورس کلی کو
مرا وجدان سمٹا جا رہا ہے
تجھے تخلیق کے اسرار کی دھن
مجھے اِک حادثہ یاد آ رہا ہے [۵۲]
(نورس کلی)

''رم جھم'' اور ''دشتِ وفا'' کے قطعات کا طرۂ امتیاز ندیمؔ کے حواسِ خمسہ کی بیداری ہے۔ دیہات کی کھلی فضاؤں سے شہر کی گنجان آبادیوں میں سوچ و فکر کے نئے نئے زاویے دکھائی دیتے ہیں۔ زیادہ تر حسِ لامسہ، حسِ باصرہ اور حسِ سامعہ بیدار اور متحرک نظر آتی ہے۔ ایسا اس لیے ہوا کہ گاؤں کے کشادہ کھیت اور کشادہ راہیں قوتِ بصارت کو اُبھارتی ہیں مگر جب شاعر محبوب سے دُور اور زندگی کی کشاکشِ پیہم سے لاتعلق احساسِ تنہائی میں ہوتا ہے تو اُس کی حسِ شامہ اور حسِ ذائقہ ایسی بیدار ہوتی ہیں کہ وہ ہجر و وصال، خلوت و جلوت کی کیفیات کو اکٹھا کر کے خواہشات و حسیات کا ایسا جادو

جگاتا ہے کہ تخیل کے بل بوتے پر حیات و کائنات کے فاصلے پل بھر میں طے کر کے تمام دُوریاں ختم کر لیتا ہے۔

تمتماتے ہیں سلگتے ہوئے رخسار ترے
آنکھ بھر کر کوئی دیکھے گا تو جل جائے گا
اتنا سیال ہے یہ پل کہ گماں ہوتا ہے
میں ترے جسم کو چھو لوں تو پگھل جائے گا ۵۳

یہ ہجر و وصال کے معمے
اک تیرے سوا کوئی نہ جانے
صدیوں میں بس ایک رات گزری
اک پل میں کٹے کئی زمانے ۵۴

ندیم نے اپنے قطعات میں مظاہرِ فطرت، رومانیت، کسانوں کی زندگی کے مسائل، اُن کے آنسوؤں اور مسکراہٹوں کو اس طرح یک جا کیا ہے کہ ندیم کے اپنے گاؤں کے آئینہ میں پورے ملک کی معاشرت کی تصویر نظر آتی ہے۔ ندیم کے شاعرانہ قلم نے ایک مصور کے قلم کا کام کیا ہے۔ اُس کی شاعری کے رنگوں سے جو تصویر اُبھرتی ہے، ہم اسے ایک ہی نظر میں پہچان لیتے ہیں کہ یہ ہماری اپنی سرزمین کے خیالات و جذبات کا عکس اور خون پسینے کی گرمی ہے۔ ندیم کی آپ بیتی، مقامی سچائیوں سے ہم کنار ہو کر جگ بیتی نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں جابجا مصوری، منظر نگاری اور واقعہ نگاری کی مثالیں ملتی ہیں۔

دھیمے دھیمے چل رہی ہیں کیوں ہوائیں آج رات
محو ہیں کسی کے تصور میں فضائیں آج رات
تم بھی اے تارو! اتر آؤ فرازِ کوہ سے
عام کر دوں گا، صبوحی کی ادائیں آج رات ۵۵

(دیدارِ عام)

کل یہاں پنگھٹ پہ اک لڑکی کا ٹخنہ ٹل گیا
سر پہ اِک مٹی کی گاگر تھی شکستہ ہو گئی

اس کی آنکھوں میں چمک سی آئی پھر اِک دھند سی
جیسے اِک مشعل بھڑک کر آندھیوں میں کھو گئی ۵۶؎
(طوفان زدہ مشعل)

ندیم کا قلم فطرت و رومان، نقوش و علامات اور تشبیہات و استعارات کے ذریعے رنگ رنگ کی تصویریں کھینچتا ہے۔ اِس کی رومانیت اور فطرت نگاری اِس کی مصوری کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ ندیم کے تخیل کی سرزمین اس قدر زرخیز ہے کہ وہ اپنے تجربات اور مشاہدات کو اِسی مٹی میں جذب کر کے اپنے جذبات کے آئینے میں اِس سے رنگا رنگ شکلیں بناتا ہے۔ جن سے فن کار کے قلب و روح میں موجود صورتوں اور یادوں کی نقش گری ہوتی ہے جسے وہ مصوری کے ذریعے ہم تک پہنچاتا ہے۔ جب ندیم قیاس اور قوتِ متخیلہ سے کام لیتا ہے تو اپنے تجربوں کو تشبیہات، استعارات میں سمو کر اِس طرح بیان کرتا ہے کہ ہماری نظروں کے سامنے ایک ایک کر کے تصویریں گزرتی رہتی ہیں۔

گلی کے موڑ پہ بچوں کے ایک جمگھٹ میں
کسی نے درد بھری لے میں 'ماہیا' گایا
مجھے کسی سے محبت نہیں مگر اے دل!
یہ کیا ہوا کہ تو بے اختیار بھر آیا ۵۷؎
(دردِ بے سبب)

آج چوراہے پہ گاؤں کے ہے جمگھٹ کس لیے
رن سے شاید واپس آیا ہے کوئی بانکا جواں
جھونپڑی سے ہولے ہولے وہ کسی کا سر اُٹھا
خشک لب، زلفیں پریشاں، چہرہ فق، آنسو رواں ۵۸؎
(ورود)

ندیم نے دیہات کی عوامی زندگی سے چنی ہوئی کہانیوں میں ڈرامے کے اجزا شامل کر کے اُسے ایک مصورانہ شکل دی ہے اور ان تصویروں میں ندیم کا احساسِ جمال، مصورانہ نگاہ اور حقیقت پسند قلم نقش نگار بنا کر اُن

کے نین نقش سنوارتا اور اُبھارتا ہے۔ شاعر اپنے تجربات کو زبان و بیان اور الفاظ و اوزان کے تانے بانے میں علامات، تلمیحات، تشبیہات اور استعارات کو استعمال کر کے اِس طرح سمو دیتا ہے کہ اِن مرکبات کو علیحدہ کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اِس بُنت سے جو آہنگ پیدا ہوتا ہے، شاعر اُسی خاص رنگ میں اپنا اسلوب بنا لیتا ہے۔ اُس کا یہ مخصوص انداز اُسے ہر لحظہ بے چین رکھتا ہے اور وہ کولمبس کی طرح تجربات کی نئی دنیا دریافت کرنے میں کوشاں رہتا ہے۔ ندیم کے قطعات میں کچھ اِسی طرح کی تڑپ اور اُمنگ کی جولانیاں نظر آتی ہیں۔ وہ نئے نئے الفاظ و اوزان اور تشبیہات و استعارات کا استعمال کر کے قطعے کے چار مصرعوں میں شعری بلاغت پیدا کر دیتا ہے۔

عابد علی عابد کے مطابق:

''استعارہ فن کار کا محرمِ راز ہے جس کی ضو سے شعر پیرہن جگمگاتا ہے اور جو الفاظ سے بے طرح جادو جگاتا ہے۔'' ۵۹

طارق سعید، استعارہ کے متعلق لکھتے ہیں:

''استعارہ اپنے اندر اتنی استعداد رکھتا ہے کہ وہ بیک وقت لفظی جمال و جلال کا مظہر بھی ہے اور معنوی حسن کا آتشیں پیکر بھی۔'' ۶۰

''دھڑکنیں'' کے قطعات میں استعارات، علامات، تشبیہات کچھ اِس طرح استعمال کیے گئے ہیں کہ قاری کی زینہ بہ زینہ رہنمائی ہوتی چلی جاتی ہے اور وہ تفہیم کی اُس منزل تک پہنچ جاتا ہے جہاں سے اُسے ہر چیز صاف دکھائی دیتی ہے۔ ندیم کے ہاں سادہ تشبیہات کا پُر اثر اظہار بھی ملتا ہے اور استعارات و تمثیلات کے پیچ دار راستوں پر کمالِ فن سے چلنا بھی دکھائی دیتا ہے۔ اُس کے موضوعات کے تنوع نے اُسے تشبیہات و استعارات کا وافر سرمایہ دیا ہے، جس کو وہ مختلف زاویوں سے اپنی شاعری میں استعمال کر کے ہماری بصیرتوں کو تیز کر دیتا ہے۔ استعارات و تشبیہات کے استعمال کا یہ عمل ہمیں ابہام کی دلدل میں نہیں لے جاتا بلکہ ہماری نظروں کے سامنے ایک ایسا شعری پیکر اُبھار دیتا ہے جس میں شاعر کے جذبات و احساسات کی ترجمانی ہوتی ہے۔

اُفق پر دُور برفانی پہاڑوں سے اُٹھی بدلی
گزر کر میرے ویران کھیت پر سے دُور جا برسی

کچھ ایسے میں نے دیکھا اِس طرف جیسے کوئی مفلس
امیروں کی نگاہ تند میں ڈھونڈے خدا ترسی ۶۱
(بے پروا بدلی)

تشبیہات و استعارات کے خوب صورت استعمال نے ندیم کے فن میں نئے نئے پیکر اُبھارے ہیں۔ ندیم کے ہاں ایسے تشبیہات و استعارات کی کمی نہیں جو عام چیزوں کا رشتہ انوکھے مظاہر اور غیر معمولی حقائق سے جوڑ دیتے ہیں۔ ایسے تمام استعارات کو ندیم کی مقامیت نے اُس کے آہنگ کی طرح منفرد اور مخصوص حیثیت بخش دی ہے۔

کٹ چکی جب فصل اور دہقان ستانے لگے
اِک کھنڈر کے پاس وہ یوں آئی کتراتی ہوئی
جیسے اک ہلکی سی بدلی ابر چھٹ جانے کے بعد
اودے پربت کی طرف جاتی ہے اٹھلاتی ہوئی ۶۲
(لمحۂ فرصت)

''دھڑکنیں'' کے مقابلے میں ''رم جھم'' اور ''دشتِ وفا'' کے قطعات میں ندیم کے ہاں تشبیہ و استعارہ، علامت و تمثیل، پیکر تراشی اور تخیل کا عمل زیادہ پہلودار اور نوک دار ہو جاتا ہے۔ اِن قطعات میں بھی ندیم کا فن الفاظ و نقوش، تشبیہات و استعارات اور علامات و تمثیلات کے ذریعے سے ارضیت کے ساتھ وابستہ نظر آتا ہے۔ اُس کے قطعے کا ہر مصرع اِکائی کی صورت میں دوسرے مصرعے کا سہارا لے کر تیسرے اور چوتھے مصرعے سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ ندیم نے جو علامتیں اور استعارے استعمال کیے ہیں اُس سے اُن کی فنی جادوگری نظر آتی ہے اور ان کے فنی رموز و علائم میں تشبیہ سبب کو نتیجے سے ملاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

آنکھ کھل جاتی جب رات کو سوتے سوتے
کتنی سونی نظر آتی ہے گزرگاہ حیات
ذہن و وجدان میں یوں فاصلے تن جاتے ہیں
شام کی بات بھی لگتی ہے بہت دُور کی بات ۶۳

''دھڑکنیں'' کے قطعات میں ندیم نے ادھورے تجربات کو شعر کا رنگ نہیں دیا اور نہ ہی اُس کے مشاہدات و تجربات

کی دنیا مصنوعی اور محدود نظر آتی ہے بلکہ اِن قطعات میں آغاز، وسط اور انجام کا منطقی تسلسل نظر آتا ہے۔ اگر شاعر کے تجربات و مشاہدات کی دنیا مصنوعی اور محدود ہوتی تو اِس طرح وثوق کے ساتھ آغاز، وسط اور انجام کے مدارج طے نہ ہو پاتے۔ اگر شاعر کے تجربات و مشاہدات میں گہرائی و وسعت نہ ہو تو شدتِ احساس کچھ دیر بعد شاعر کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور وہ شاعرانہ علامتوں سے کوئی بڑا کام نہیں لے سکتا۔ اِس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ندیمؔ کے احساسات و جذبات کہیں بھی الفاظ کی جستجو میں نہیں بھٹکتے بلکہ رنگا رنگ موضوعات کے ساتھ ساتھ لفظوں اور علامتوں کا ایک ذخیرہ اپنے ساتھ لے کر قطعے میں کہانی کی خصوصیات اور ڈرامے کے اجزا شامل کر کے ایک مصورانہ شکل دے دیتے ہیں۔ دیہات کی زندگی سے چنی گئی اِن کہانیوں میں حرکت و عمل کی دھوپ بھی نظر آتی ہے اور حسن و رومان کی چھاؤں بھی۔ اِسی افسانوی فضا میں ندیمؔ کے قطعات میں ڈرامے کے اجزا شامل دکھائی دیتے ہیں۔ مکالمہ، کش مکش، ارتقا، نقطۂ عروج اور اختتام ڈرامے کے وہ لوازمات ہیں جنھوں نے ندیمؔ کے ہاں ندرت اور جدت پیدا کر دی ہے اور شاعر کو منفرد اسلوب کا موجد بنا دیا ہے۔ ''دھڑکنیں'' میں افسانے اور ڈرامے کا آہنگ شامل کر کے اُسے نیا انداز دیا۔ جو بلاشبہ ندیمؔ کا کارنامہ ہے۔ اُس کا قطعہ آغاز، وسط اور انجام کے مراحل سے گزرتا ہوا نقطۂ عروج یا حسنِ تکمیل کی منزل تک پہنچتا ہے اور جس میں وحدت فی کثرت کی شان دکھائی دیتی ہے۔

اے محبت، اے مرے جذبات کی رنگین اڑان
ابتدا کتنی رسیلی تھی تیری، کتنی گداز
اور یہ انجام جیسے خوں شدہ کلیوں کا ڈھیر
اور یہ تیری یاد، جیسے باز کے چنگل میں قاز [۶۴]

(اے محبت)

بوندوں کی یہ رم جھم، یہ کلیجے میں کسک سی
برسات کی یہ رات، یہ حالات ہمارے
اس وقت بھلا کون گھٹاؤں سے اُتر کر
پرہول خلاؤں میں ستاروں کو اُبھارے [۶۵]

(صورت حالات)

بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

''ندیم کے قطعے اور رُباعیاں ___ مختصر کہانی کے شاعرانہ سانچے ہیں۔'' ۶۶

ندیم مذہب کے معاملے میں تنگ نظر نہیں ہے بلکہ وہ مذہبی رہنماؤں کی محدود سوچ کے خلاف ہے اور اُس پر طنز بھی کرتا ہے۔ جس کی روشنی میں یہ غلط فہمی دُور ہو جاتی ہے کہ اُس پر مذہب کی دھند چھائی ہوئی ہے۔

جمیل ملک لکھتے ہیں:

''مذہب کے سلسلے میں ندیم کا رویہ کٹر نہیں بلکہ وہ کٹ ملائیت کے سخت خلاف ہے اور شدید طنز سے اس کی روح فنا کر دینے پر آمادہ ہے۔'' ۶۷

انسان کو سیدھی راہ پہ لانے کے واسطے
انسانیت کا خون پئے جا رہا ہے تو
یوں سجدے کر رہا ہے رعونت سے دم بدم
جیسے کسی کو بھیک دیئے جا رہا ہے تو ۶۸

(سجدوں کی بھیک)

ندیم مسلمانوں کے سیاسی و مذہبی زوال پر بھی نظر رکھتے ہیں اور اس کے متعلق واضح نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ اِن کے خیال میں ہمارے زوال اور پستی کی وجہ جہاں ہمارے مذہبی رہنماؤں کا طرزِ عمل ہے وہاں بحیثیت مسلمان ہمارا اجتماعی طرزِ عمل بھی اِس کا بڑا سبب ہے۔ ندیم اِن دونوں زاویوں سے مذہبی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں۔

ادھر بارود کے گولوں کے انبار
ادھر تسبیح کے دانوں کی جھنکار
ادھر آفاق گیری کے ارادے
ادھر دل میں سکوں چہروں پہ انوار ۶۹

(وہاں اور یہاں)

ندیم نے اہلِ مذہب کی انسانیت دشمنی اور ریاکاری کو بچشم خود دیکھا تھا۔ اس لیے جب اُنھوں نے محسوس کیا کہ مذہب کو انسان دشمنی کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے تو اُنھوں نے اِس پر تنقید کی۔ ندیم گہرا مذہبی احساس

رکھنے کے باوجود مذہب کے نام پر اختیار کیے جانے والے دھوکے اور فریب کو بہتر سمجھتے ہیں اور اُس کی مذمت بھی کرتے ہیں۔ وہ مذہب کو اپنی غور وفکر اور مذہبی شعور کی بنیاد پر سمجھتے ہیں۔ ندیم کسی بھی مذہبی پہلو کو جانچ پرکھ کے بغیر قبول نہیں کرتے۔ ندیم کو خانقاہی نظام ورثے میں ملا تھا۔ اُن کے والد غلام نبی دنیاوی جاہ وحشمت سے بے نیاز ایک باقاعدہ پیر تھے۔ پیروں کے خانوادوں میں بچوں کو ایسی تربیت دی جاتی ہے کہ وہ آگے چل کر پیر پرستی کی دنیا میں نام کمائیں اور اِسی اندازِ فکر کا پرچار کریں۔ ندیم کے والد حقیقی معنوں میں مجذوب تھے اور انہیں دنیاوی جاہ ومنصب سے کوئی غرض نہ تھی مگر اُن کے مفاد پرست عزیزوں نے اُن کی اِس کیفیت کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے سادہ لوح عقیدت مندوں کو گمراہ کیا اور اُن سے مادی مفادات حاصل کیے۔ اِس منافقانہ رویے نے ندیم کے قلب ونظر میں اِس نظام کے خلاف شکوک وشبہات پیدا کر دیے۔ انہی شکوک وشبہات نے اُن کی ادبی زندگی کو بھی متاثر کیا۔

اُردو شاعری میں تصوف کی روایت بھی قدیم ہے اور ندیم بھی اس روایت سے بے خبر نہیں رہے۔ اِس لیے ندیم کے ہاں تصوف کے آثار ملتے ہیں۔ اُس نے اُردو شاعری کی اِس جان دار روایت سے اپنا رشتہ قائم رکھا۔ اگرچہ صنعتی اور سائنسی دور میں تصوف کو نظرانداز کرنے کی کوشش کی گئی مگر ندیم کے ہاں اپنے منفرد انداز میں خدا کی ذات سے استفسار اور دست وگریباں ہونا بھی دکھائی دیتا ہے۔

اتنی نیچی وادیاں اور اتنی اونچی چوٹیاں
اِس بلندی اور پستی سے ہے کیا مقصد ترا
مضحکہ انگیز ہے یہ امتیاز خوب و زشت
کیا یہ دھوکا ہے مری نظروں کا اے میرے خدا ؎۳

(فریبِ نظر)

تصوف میں ندیم فقیہہ شہر اور زہد خشک کو خانقاہوں سے نکل کر زندگی کے حقائق کا احساس دِلاتا ہے۔ چوں کہ اُس کے نزدیک حقیقت کی پہچان ہی اصل سچائی ہے اور ایسی سچائی کو پا کر انسان نصف رات کی تاریکیوں میں بھی نورِ سحر کو محسوس کر سکتا ہے اور یہ ایسی دولت ہے جو مُلا و درویش کو عمر بھر کی ریاضت کے باوجود بھی نصیب نہیں ہوتی۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں کا ادراک ہی خدا کی حقیقت کا ذریعہ بنتا ہے۔ ندیم روحانی وفکری سطح پر زندگی کی تلخیوں اور

حقائق سے آگاہ ہے۔ اِس لیے کائنات کے اسرار و رموز بھی اُس پر کھلتے دِکھائی دیتے ہیں اور اُس کا عرفان ایک فرد کا نہیں بلکہ پوری انسانیت کا عرفان محسوس ہوتا ہے۔

خدا کی یاد میں صدیاں گزار دیں لیکن
خدا سے صرف تحیر کی دھند لایا ہے
عجب نہیں کہ خدا عرش سے اُتر آئے
اب آدمی کو خود اپنا خیال آیا ہے [۱]
(خودنگری)

ارزاں نہ کرو کفر کے فتوؤں کو، کہ میں نے
عرفانِ حقیقت کو خدا مان لیا ہے
اب کیا ہے، فرشتوں کے تعارف کی ضرورت
انسان نے انسان کو پہچان لیا ہے [۲]
(پہچان)

ترقی پسند شاعر ہونے کے ناطے ندیم نے ماضی کی بہترین روایات اور مستقبل کی اُبھرتی ہوئی طاقتوں سے رشتہ استوار رکھا۔ انسان دوستی، سامراج دشمنی، حب الوطنی اور جذبۂ آزادی کو آگے لے کر بڑھے۔ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم میں انسانیت کا جو استحصال ہوا اور اقتصادی طور پر مجبور و بے بس نوجوان محض پیسوں کی خاطر اپنی جانیں تک جنگ کے الاؤ میں جھونکنے پر مجبور ہو گئے۔ فوج کی تنخواہ اور مصنوعی خوش حالی نے دیہاتوں کو نوجوانوں سے خالی کر دیا۔ جس کی وجہ سے عصمت و پاکیزگی اور ایثار و وفا کی اقدار تباہ ہونے لگیں اور اخلاقی بحران پیدا ہو گیا۔ اخلاقی ابتری کی اِس صورتِ حال میں جب بوڑھے والدین کی مجروح انا پر اولاد کی موت اور گم شدگی کی چوٹ پڑی تو نفسیاتی بحران میں مبتلا ہونے لگے۔

ندیم کے ذہن پر پہلی جنگِ عظیم نے دور رس اثرات مرتب کیے۔ پہلی جنگِ عظیم میں ہندوستانیوں کی شمولیت کے متعلق ندیم واضح نظریہ رکھتے تھے کہ یہ جنگ اِن کی اپنی جنگ نہ تھی۔ انہیں تو صرف چند ٹکوں کے عوض

مرنے یا مارنے کے لیے اِس خونی کارزار میں اُتار دیا گیا جہاں اُنھوں نے کسی بڑے مقصد کے لیے محض چند ٹکوں کی خاطر استعمار پسندوں کے عزائم کی تکمیل وتوسیع کے لیے موت کے خونی کھیل میں حصہ لیا جس کے نتیجے میں عمر بھر کا پچھتاوا اِن کا مقدر بن گیا۔

جنگِ عظیم اوّل کے متعلق کچھ تاثرات اِن کے قطعات میں بھی جھلکتے ہیں۔ یہ قطعات لکھے تو دوسری جنگِ عظیم کے آغاز میں گئے مگر کیوں کہ جنگ کے بالکل آغاز میں ابھی اِس طرح کے حالات پیدا نہ ہو سکے تھے جو اِن قطعات کا موضوع ہیں۔ پنجاب تک تو جنگ کے یہ شعلے ۱۹۶۰ء کے آخر تک پہنچے تھے، ایسے میں اگر ندیم جنگ سے واپس آنے والے نوجوانوں کو قطعات کا موضوع بنا رہے ہیں تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ اُنھوں نے پہلی جنگ کے بعد لوٹنے والے نوجوانوں کے متعلق اپنے مشاہدات کو اِن قطعات میں استعمال کیا ہے۔ ایسے نوجوان جو جنگ ختم ہونے کے سالوں بعد تک گھر لوٹتے رہے اور بچپن میں ندیم کے مشاہدات کی تصویریں تشکیل دیتے رہے۔ ندیم نے زمانۂ جنگ کے اِس اخلاقی و اقتصادی بدحالی کی صورتِ حال کو اپنے افسانوی مجموعہ ''آبلے'' کی دوسری اشاعت پر یوں بیان کیا ہے:

> ''نوجوان جذبۂ ملی یا حُبِّ وطن سے سرشار ہونے کے بجائے محض تیس چالیس روپوں کی خاطر لاکھوں کی تعداد میں انگریز جرنیلوں کے پیچھے پیچھے اِدھر ملایا اور جاوا اور جاپان تک اور اُدھر لیبیا اور بلجیم اور انگلستان تک چلے جاتے تھے اور جب انگریز جرنیل محاذوں پر پہنچ کر پیچھے ہٹ آتے تھے تو یہ لوگ بڑھ کر اللہ اکبر، ہرتر مہادیو اور ست سری اکال کے نعرے لگا کر برطانوی اور امریکی قیصریت کی بھینٹ چڑھ جاتے تھے۔'' ۳؎

ندیم نے اپنی زندگی کے بالکل ابتدائی برس اپنے اردگرد جنگ کے اثرات کو واضح اور نمایاں طور پر دیکھا۔ جنگی مقتولین، زخمیوں، معذور اور لا پتہ افراد کی بہت بڑی تعداد اِس جنگ کی ہولناکی کو بیان کرتی تھی۔

> میری چٹھی کو بہت طول نہ دینا بھیّا
> اِس طرح راہ میں کھو جاتی ہے، سب کہتے ہیں
> کون سی فوج میں شامل ہیں؟ مجھے یاد نہیں
> بس یہ معلوم ہے، ایران میں وہ رہتے ہیں ۴؎
>
> (بیوی کا خط)

جنگ کے دوران میں پنجاب کے دیہات کی رونق اُجڑ جانے سے ندیم خاصے متاثر ہوئے۔ اِس جنگ کے اثرات سے گاؤں کی مجموعی فضا سوگوار ہو جاتی ہے اور یہاں ویرانی، تباہی اور اُجاڑپن کے تاثرات اُبھرتے ہیں۔ اِس طرح اِن کے قطعات پڑھتے ہوئے گاؤں کی مجموعی زندگی پر اُترتے ہوئے جنگ کے آسیبی اثرات اور سائے محسوس ہونے لگتے ہیں۔

فتح محمد ملک رقم طراز ہیں:

''پہلی اور دوسری عالمی جنگ کے درمیانی وقفۂ زماں میں پنجاب کے مارشل ایریا میں فاقوں کی فصل کو اِس زور شور سے پروان چڑھایا گیا اور مہاجن کے پنجۂ استبداد کو اِس اہتمام کے ساتھ مضبوط اور موثر بنایا گیا کہ دوسری عالم گیر جنگ کا اعلان ہوتے ہی کوہستانِ نمک کے آس پاس کے گاؤں نوجوانوں سے خالی ہو گئے۔'' ۵۷

ندیم نے اِس صورتِ حال اور حالات کو تخلیق کار کی نظر سے دیکھا اور اِسے ہر پہلو سے پیش کرنے کی کوشش کی۔ اِن کے ہاں جنگ کے متعلق قطعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُنھوں نے جنگ کی تباہ کاریوں کو خاص شدت سے محسوس کیا اور اُنھیں یہ تباہی و بربادی اپنے گاؤں کی بجائے اپنے دل پر اُترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس لیے وہ جنگ کے شدید مخالف رہے۔ ندیم جانتے تھے کہ استعماری قوت اپنے استعماری وسائل کی حفاظت کے لیے دوسری اُبھرتی ہوئی استعماری قوت سے برسرِ پیکار ہے۔ اِس سے انسانیت شکنجوں میں جکڑی جاتی ہے۔ لہٰذا جنگ کے اِن واقعات سے اِن کے ذہن پر واضح اثرات مرتب ہوئے۔ پہلی جنگِ عظیم میں ہندوستانیوں کی شمولیت کے متعلق ندیم واضح مؤقف رکھتے تھے کہ اُنہیں صرف چند ٹکوں کی خاطر مرنے یا مارنے کے لیے اِس خونی عمل میں اُتارا گیا کیوں کہ یہ اُن کی اپنی جنگ نہ تھی۔ محض چند پیسوں کی خاطر استعمار پسند انگریزوں کے عزائم کی تکمیل کے لیے اِس خونی عمل میں شامل ہوئے جس کے نتیجہ میں زندہ بچ جانے والے ہندوستانیوں کے لیے عمر بھر کا پچھتاوا مقدر بن گیا۔ ندیم نے اپنے ان مشاہدات کو اپنے قطعات کا موضوع بنایا ہے اور یہ وہ تاثرات ہیں جو اُن پر جنگِ عظیم اوّل نے مرتب کیے۔

دُور وہ چھوٹے سے اسٹیشن پہ اک گاڑی رُکی
سینہ تانے اِک جواں اُترا ہے کس انداز سے

پاس ہی بوڑھی سی بیری کے تلے اک خوب رُو
جھینپتی، ڈرتی، سمٹتی اُٹھ رہی ہے ناز سے ۶ے
(خوش آمدید)

ندیم جنگ کو انسان کا بدترین دشمن تصور کرتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ آئندہ کرہ ارض پر کوئی ایسی جنگ شروع ہو۔

ندیم کے بعض قطعات میں ایک مانوس لہجے کی دردمندی اور مٹھاس ہندی، پنجابی شاعری کی روایت کے طور پر بھی ملتا ہے جن میں دردمندی کے عناصر اور شیرینی شامل کر کے اپنے لب ولہجہ کو زیادہ پُر اثر بنا دیا۔

کل صبح کو سبز کھیتوں پر
اک گیت تھرکتا جا رہا تھا
میں جھینپ گئی میرا سپاہی
پردیس سے گاؤں آ رہا تھا ۷ے
(وقت کی واپسی)

"دھڑکنیں" کے بعض قطعات میں مزاح وظرافت کی شیرینی بھی پائی جاتی ہے جو ندیم کے اسلوب کی طرح اچھوتے رنگ میں ہے اور جس میں ندیم کے اندازِ بیان کو خشک اور بے ذائقہ ہونے سے بچا لیا ہے اور جسے ہم پڑھ کر لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ مزاح وظرافت کے ساتھ ساتھ بعض جگہوں پر طنزیہ انداز بھی ملتا ہے۔ ایسا طنزیہ انداز جو ایک طرف تو ظالم کی گردن میں خم ڈالتا ہے اور دوسری طرف قاری کی ہمدردیاں مظلوم کی طرف مائل کر دیتا ہے اور اِس طرح اپنی شاعری میں ندیم نے ظلم کے خلاف اور مظلوم کے حق میں آواز اُٹھائی ہے۔

کل مجھے پنگھٹ پہ اک بڑھیا نے ہولے سے کہا
رنگ کیوں پیلا ہے تیرا سست کیوں ہے تیری چال
وہ صبوحی گاگریں بھر کر کھڑی ہے دم بخود
گاگر اِس کے سر پر رکھ آنچل ذرا سا کھینچ ڈال ۸ے
(ناصح مشفق)

دو بیگہ زمیں کاشت کی خاطر مجھے دے کر
تم کرتے ہو چھپ کر مری لڑکی کا اشارہ

محنت تو بکا کرتی ہے غیرت نہیں بکتی
افلاس کا مارا ہوا دہقان پکارا ۹ے
(تن اور من)

ندیمؔ قطعہ کہتے وقت کہانی کے سے انداز میں شاعرانہ آہنگ اختیار کرتا ہے تو اِس میں جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ ندیمؔ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ افسانہ نگار بھی ہیں۔ اس لیے ندیمؔ گرد و پیش سے کہانی لے کر اِن کو اشعار کا جامہ پہنا دیتا ہے۔ اِس دور میں ندیمؔ کو ہی قطعہ کا پیش رو قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ اُنھوں نے اِس صنف میں نئی سمت کی نشان دہی بھی کی ہے۔

حواشی

۱۔ مہدی حسین ناصری، ''مخزن الفوائد''، مشن پریس الہ آباد، ۱۹۲۲ء، ص ۱۵۶

۲۔ سید محمد رضادانی جواد، ''علمِ بدیع در زبان فاری''، چاپ تہران، س۔ن، ص ۳۱۸

۳۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، ''اردو شاعری کا فنی ارتقاء''، الوقار پبلی کیشنز، ۵۰۔لوئر مال، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۴۱۰

۴۔ جمیل ملک، ''ندیم کی شاعری''، نوید پبلی کیشنز، راول پنڈی، ۱۹۷۲ء، ص ۲۱

۵۔ احمد ندیم قاسمی، ''دھڑکنیں''، اُردو اکیڈمی لاہور، بار اوّل ۱۹۴۲ء، ص ۶۹

۶۔ ایضاً، ص ۱۰۷

۷۔ ایضاً، ص ۲۱

۸۔ احمد ندیم قاسمی، مشمولہ ''فنون'' سہ ماہی، خاص شمارہ، ندیم نمبر، لاہور، شمارہ: ۱۲۸، دسمبر ۲۰۰۸ء تا دسمبر ۲۰۰۹ء، ص ۱۷

۹۔ محمد عالم خان، ڈاکٹر، ''اُردو افسانے میں رومانی رجحانات''، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، س۔ن، ص ۲۳

۱۰۔ احمد ندیم قاسمی، ''رم جھم''، اساطیر، میاں چیمبرز، ۳۔ٹیمپل روڈ، لاہور، ۱۹۴۴ء، ص ۵۰

۱۱۔ جمیل ملک، ''ندیم کی شاعری''، ص ۱۹

۱۲۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، ''احمد ندیم قاسمی۔ انسانیت کا نمائندہ''، مشمولہ ''ادب و فن''، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۸۰

۱۳۔ جمیل ملک، ''ندیم کی شاعری''، ص ۳۷

۱۴۔ محمد طفیل، ''صاحب''، ادارۂ فروغِ اُردو، لاہور، بار دوم، ۱۹۶۴ء، ص ۷۳۔۷۲

۱۵۔ احمد ندیم قاسمی، دیباچہ بہ عنوان ''تمہید''، ''جلال و جمال''، اساطیر، لاہور، جون ۲۰۰۰ء، ص ۱۶

۱۶۔ محمد طفیل، ''صاحب''، ص ۷۳

۱۷۔ احمد ندیم قاسمی، ''رم جھم''، ص ۳۸

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۸

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۴

۲۰۔ احمد ندیم قاسمی، ''دھڑکنیں''، ص ۱۶

۲۱۔ احمد ندیم قاسمی، ''رم جھم''، ص ۴۹

۲۲۔ ایضاً، ص ۲۹

۲۳۔ ایضاً، ص ۳۸

۲۴۔ احمد ندیم قاسمی، ''دھڑکنیں''، ص ۱۸

۲۵۔ احمد ندیم قاسمی، ''رم جھم''، ص ۱۶

۲۶۔ ایضاً، ص ۵۴

۲۷۔ ایضاً، ص ۵۵

۲۸۔ ایضاً، ص ۵۴

۲۹۔ ایضاً، ص ۴۲

۳۰۔ ایضاً، ص ۵۵

۳۱۔ احمد ندیم قاسمی، ''دشت وفا''، اساطیر، لاہور، مارچ ۲۰۰۰ء، ص ۱۰۳

۳۲۔ مصاحبہ بہ عنوان ''یادگار انٹرویو''، خلیق احمد خلیق، مشمولہ ''افکار''، ماہ نامہ، کراچی، ندیم نمبر، شمارہ: ۵۹/۵۸، جنوری/فروری، ۱۹۷۵ء، ص ۲۶۹

۳۳۔ فتح محمد ملک، ''احمد ندیم قاسمی، شاعر اور افسانہ نگار''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۲۰۹

۳۴۔ احمد ندیم قاسمی، ''رم جھم''، ص ۳۰

۳۵۔ احمد ندیم قاسمی، ''دھڑکنیں''، ص ۴۷

۳۶۔ احمد ندیم قاسمی، ''رم جھم''، ص ۲۹

۳۷۔ ایضاً، ص ۲۵

۳۸۔ ایضاً، ص ۲۹

۳۹۔ ''کشمیری لال ذاکر: میرا آخری ساتھی۔ شجر سایہ دار''۔ ''ہماری زبان''، نئی دہلی، ۲۰۰۸ء، ص ۵

۴۰۔ احمد ندیم قاسمی، ''دھڑکنیں''، ص ۳۱

۴۱۔ احمد ندیم قاسمی، ''دھڑکنیں''، ص ۳۱

۴۲۔ ایضاً، ص ۵۱

۴۳۔ احمد ندیم قاسمی، ''رم جھم''، ص ۴۵

۴۴۔ احمد ندیم قاسمی از فتح محمد ملک، ''احمد ندیم قاسمی، شاعر اور افسانہ نگار''، ص ۲۱۹

۴۵۔ احمد ندیم قاسمی، ''رم جھم''، ص ۴۹

۴۶۔ عزیز حامد مدنی، ''جدید اردو شاعری (حصہ دوم)''، انجمن ترقی اردو، پاکستان، طبع اوّل، ۱۹۹۴ء، ص ۴۷

۴۷۔ احمد ندیم قاسمی، ''دھڑکنیں''، ص ۴۷

۴۸۔ احمد ندیم قاسمی، ''رم جھم''، ص ۳۷

۴۹۔ ایضاً، ص ۴۴

۵۰۔ احمد ندیم قاسمی، ''دشتِ وفا''، ص ۲۲۵

۵۱۔ جمیل ملک، ''ندیم کی شاعری''، ص ۱۷

۵۲۔ احمد ندیم قاسمی، ''رم جھم''، ص ۵۴

۵۳۔ احمد ندیم قاسمی، ''دشتِ وفا''، ص ۶۱

۵۴۔ ایضاً، ص ۱۳۸

۵۵۔ احمد ندیم قاسمی، ''رم جھم''، ص ۲۷

۵۶۔ ایضاً، ص ۲۵

۵۷۔ ایضاً، ص ۱۴

۵۸۔ ایضاً، ص ۳۰

۵۹۔ عابد علی عابد، سید، ''اسلوب''، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع دوم، جون ۱۹۹۶ء، ص ۱۹۴

۶۰۔ طارق سعید، ''اسلوب اور اسلوبیات''، نگارشات، میاں چیمبرز، ۳۔ٹیمپل روڈ، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۱۴۷

۶۱۔ احمد ندیم قاسمی، ''دھڑکنیں''، ص ۵۰

۶۲۔ احمد ندیم قاسمی، ''رم جھم''، ص ۲۷

۶۳۔ احمد ندیم قاسمی، ''دشتِ وفا''، ص۶۹

۶۴۔ احمد ندیم قاسمی، ''رِم جھم''، ص۲۸

۶۵۔ ایضاً، ص۵۵

۶۶۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، ''وہ کہ شاعر بھی ہے انسان بھی ہے''، مشمولہ ''ندیم نامہ''، محمد طفیل، مجلس اربابِ فن، لاہور، بار اوّل ۱۹۷۶ء، ص۲۲۱

۶۷۔ جمیل ملک، ''ندیم کی شاعری''، ص۳۲

۶۸۔ احمد ندیم قاسمی، ''دھڑکنیں''، ص۱۴

۶۹۔ ایضاً، ص۵۷

۷۰۔ احمد ندیم قاسمی، ''دھڑکنیں''، ص۴۶

۷۱۔ احمد ندیم قاسمی، ''رِم جھم''، ص۵۲

۷۲۔ ایضاً، ص۵۵

۷۳۔ احمد ندیم قاسمی، ''آبلے''، ادارۂ فروغ اُردو، لاہور، ۱۹۴۶ء، ص۵

۷۴۔ احمد ندیم قاسمی، ''رِم جھم''، ص۲۰

۷۵۔ فتح محمد ملک، ''احمد ندیم قاسمی، شاعر اور افسانہ نگار''، ص۱۳۴

۷۶۔ احمد ندیم قاسمی، ''رِم جھم''، ص۳۱

۷۷۔ احمد ندیم قاسمی، ''دھڑکنیں''، ص۲۸

۷۸۔ احمد ندیم قاسمی، ''رِم جھم''، ص۲۹

۷۹۔ ایضاً، ص۴۵

✿✿✿✿✿

باب ششم

دیگر اصنافِ شعر

(رباعیات، حمد، نعتیہ کلام، سلام)

رُباعی:

رُباعی عربی کا لفظ ہے اور یہ ''رُبع'' سے بنا ہے۔ اس کے لغوی معنی ''چار والے'' یا ''چار چار'' کے ہیں۔ شاعرانہ اصطلاح میں رباعی اُس صنفِ سخن کو کہتے ہیں جس میں مخصوص وزن کے چار مصرعوں میں ایک مکمل خیال ادا کیا جاتا ہے۔

فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

> ''رباعی اُردو کی وہ مختصر ترین صنفِ سخن ہے جس میں مقررہ اوزان، وحدتِ خیال اور تسلسل بیان کی پابندی ازبس ضروری ہے۔'' [۱]

رباعی میں خیال کے ارتقا اور تسلسل کے لیے اِس کے چاروں مصرعوں کا ایک دوسرے سے زنجیر کی کڑیوں کی طرح مربوط ہونا ضروری ہے۔ رباعی میں خیال میں اگر تسلسل منقطع ہو جائے تو رباعی میں ڈھیلا پن آ جاتا ہے۔ رُباعی کے پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرع میں قافیہ لانا ضروری ہے۔ تیسرے مصرع میں بھی قافیہ لایا جا سکتا ہے۔

بقول فرمان فتح پوری:

> ''رباعی میں الفاظ و تراکیب کا انتخاب، موضوع کی مطابقت سے ایسا برمحل ہو کہ اِس سے بہتر کا تصور ہی نہ ہو سکے۔ پہلے مصرعہ میں مناسب الفاظ کے ساتھ خیال کو روشناس کرایا جائے۔ دوسرے اور تیسرے مصرع میں اِس کے خط و خیال کچھ اور نمایاں کیے جائیں اور چوتھے مصرع میں مکمل خیال کو ایسی برجستگی اور شدت کے ساتھ سامنے لایا جائے کہ سننے والا مسحور و متحیر ہو کر رہ جائے۔'' [۲]

رُباعی کو ترانہ، دو بیتی اور چہار بیتی بھی کہتے ہیں اور یہ بحر ہزج مثمن میں لکھی جاتی ہے اور اِس کے چوبیس (۲۴) اوزان مقرر ہیں۔

رُباعی کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں۔ موضوع کے اعتبار سے اِس کا دامن بے حد وسیع ہے۔ حمد، نعت، منقبت، دُنیا کی بے ثباتی، عشق، اخلاقیات، سیاست، فلسفہ اور منظر نگاری، غرض ہر موضوع پر رُباعی کہی جا سکتی ہے۔

رُباعی کے لیے ضروری ہے کہ یہ مقررہ اوزان کے مطابق ہونی چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ رُباعی نہیں بلکہ قطعہ ہو گا۔ رُباعی ہمیشہ مخصوص اوزان میں کہی جاتی ہے، جب کہ قطعہ کے لیے کوئی وزن مخصوص نہیں۔ رُباعی ہمیشہ دو شعروں پر مشتمل ہوتی ہے، جب کہ قطعہ کے اشعار کی تعداد مقرر نہیں اور رُباعی میں ہمیشہ مطلع موجود ہوتا ہے جب کہ قطعہ میں عموماً مطلع نہیں ہوتا۔ رباعی کی بنیادی خصوصیت ایجاز و اختصار ہے کیوں کہ اِس میں وسیع مضمون کو سمیٹ کر بیان کیا جاتا ہے۔

رباعی فارسی شعرا کی ایجاد ہے۔ علمائے عروض و قواعد کے مطابق رباعی کا ہر مصرع چار رُکنی ہوتا ہے۔ رُباعی کے چار رُکنی مصرع کی تخصیص کے سلسلے میں ''امیر العروض'' میں درج ہے کہ:

''رباعی کے ہر مصرعے میں چار ارکان ہوتے ہیں۔ نہ تین ہو سکتے ہیں نہ پانچ۔'' ؎

رُباعی ایرانی الاصل ہے اور اِس کو خاص ایرانیوں کی ایجاد سمجھا جاتا ہے۔ اِس حوالے سے نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

''رباعی کا وزن خالص عجمی اختراع ہے۔'' ؎

فارسی رُباعی کو ابتدا میں صوفیا اور پھر مفکرین و مصلحین نے اپنایا اور بعد میں رباعی شعرا کے ہاں بھی اظہارِ خیال کا ذریعہ بن گئی۔ رباعی کو شہرت کی بلندیوں تک پہنچانے میں سلجوقی دور مبارک ثابت ہوا۔ رباعی کے لیے یہ دور خاص طور پر اہمیت کا حامل ہے۔ اِس عہد کے معروف رباعی گو میں عمر خیام، ابو سعید ابوالخیر، فریدالدین عطار، سعدی اور بابا طاہر عریاں شامل ہیں۔ اِن کی حکیمانہ اور صوفیانہ رباعیوں نے انہیں عظمت و شہرت بخشی۔ دوسرے اصنافِ سخن قصیدہ، غزل اور مثنوی کی طرح اُردو زبان میں رباعی بھی فارسی سے آئی ہے۔ اُردو کے قدیم دکنی شعرا کے ہاں اگرچہ ابتدائی طور پر رباعی کی طرف خاص توجہ نہیں دی گئی مگر قلی قطب شاہ، ولی اور سراج اورنگ آبادی رباعی نگار کی حیثیت سے خاصی شہرت رکھتے ہیں۔

دبستانِ دلی کے باکمال شعرا دردؔ، سوداؔ، میر حسن اور میر تقی میرؔ وغیرہ نے دوسرے اصنافِ سخن کے ساتھ ساتھ اُردو رباعی پر بھی توجہ دی۔ اِس عہد میں رباعی کا زیادہ ذخیرہ تو نہیں لیکن رباعی کی تاریخ میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔

بقول فرمان فتح پوری:

> ''دردؔ، سوداؔ اور میرؔ نے اگر چہ ضمنی طور پر رباعیاں کہی تھی۔ پھر بھی ان میں ایسے شعری محاسن جمع ہو گئے تھے کہ رباعی کے امکانات کو وسیع کرنے میں ضرور مدد ملی ہوگی۔'' ۵

دبستانِ لکھنؤ کے شعرا نے اپنی رنگین مزاجی کی وجہ سے رباعی کی طرف وہ دل چسپی نہ لی کیوں کہ یہ ایک سنجیدہ صنفِ سخن ہے اور لکھنؤ کی عیش کوش فضا میں تصوف کے مسائل اور سنجیدہ خیالات کے اظہار کی گنجائش نہ تھی لیکن انیسؔ و دبیرؔ نے رُباعی میں وہ کمال دکھایا کہ اہلِ لکھنؤ رباعی کے باب میں دہلوی شعرا سے پیچھے نہ رہے۔ اِس دور میں عاشقانہ مضامین اور صوفیانہ خیالات کے ساتھ رباعی میں واقعاتِ کربلا کا ذکر بھی آنے لگا۔

رُباعی نے اُردو شاعری کو سنجیدہ لب و لہجہ عطا کیا۔ اُردو رباعیات میں مقصدیت اور اصلاحی پہلو ہر زمانہ میں نظر آتا ہے۔ اِس صنف میں مسلسل مضمون کو چار مصرعوں میں ختم کرنے کی وجہ سے بے کار الفاظ و غیر ضروری بات نہیں کر سکتے۔

بقول ڈاکٹر اعجاز حسین:

> ''رُباعی کی وجہ سے جتنا اُردو ادب کا لب و لہجہ متین و باوقار ہوا، غالبًا کسی ایک صنف سے اتنا نہیں ہوا۔ اخلاق و معرفت کے عشقیہ مضامین بھی زیادہ تر خلوص اور سادگی کا پہلو لیے ہوئے ہیں جس کا ایک اثر یہ ہے کہ رُباعی کی تمام فضا سنجیدہ معلوم ہوتی ہے۔'' ۶

انیسویں صدی میں جوشؔ، اقبالؔ، یگانہؔ، فانیؔ، فراقؔ، اثر صہبائیؔ، احمد ندیمؔ قاسمی اور دیگر بہت سے شاعروں نے رباعی کی طرف توجہ دی۔ احمد ندیمؔ قاسمی کی رباعیات کا پہلا مجموعہ ''رم جھم'' ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔ جس میں ساٹھ (۶۰) رباعیات شامل ہیں۔ ''محیط'' میں پانچ (۵) رباعیات اور ''انوارِ جمال'' میں دو (۲) رباعیات شامل ہیں۔

ندیمؔ کی رباعی میں انفرادی سطح پر رومان ومحبت کی داستانیں اپنا آہنگ بدل کر قومیت، بین الاقوامیت اور انسانیت سے محبت کو اپنے فن کی معراج بنا لیتی ہیں۔ ندیمؔ کا مزاج قطعہ سے مطابقت رکھتا ہے۔ اِس لیے اِن کی

رباعی کا لب ولہجہ بلند سے بلند تر ہو جاتا ہے۔

ندیمؔ نے رُباعی میں پیکر تراشی کے ذریعے طبقاتی تضاد اور معاشی فرق کو اِس انداز سے اُجاگر کیا ہے کہ شاعر کی شاعرانہ مہارت سے ایک طبقے کے ساتھ ہمدردی اور دوسرے کے ساتھ نفرت کے احساسات و جذبات بیدار ہو جاتے ہیں۔

آثار سحر چمن کو چونکائے رہے
سائے سے مگر چار طرف چھائے رہے
دو چار نے بڑھ کے اپنی جھولی بھر لی
لاکھوں کے ہجوم ہاتھ پھیلائے رہے ۷

ندیمؔ نے رُباعی میں رموز و علائم کا استعمال کر کے مفلس و فاقہ زدہ لوگوں کی نمائندگی بھی کی ہے جو المیہ کی صورت میں اُبھر کر قاری کے احساس وشعور کو متاثر کرتا ہے اور اُس کی ہمدردیاں مفلس و بے بس انسان کی خاطر جاگ اُٹھتی ہیں۔

یوں بھی کبھی حسن مسکراتا ہے ندیمؔ
تربت پہ چراغ ٹمٹماتا ہے ندیمؔ
محبوبۂ مفلس کے تھکے بوسوں میں
فاقوں کا غبار کرکراتا ہے ندیمؔ ۸

ندیمؔ انسان کی عظمت اور برتری کے قائل ہیں۔ اِن کی اِس انسانی دوستی کی جڑیں اُن کی رُباعی میں نظر آتی ہیں۔ انسانیت سے ندیمؔ کی وابستگی جذباتی نہیں بلکہ اُن کی روح اور وجدان کا حصہ ہے۔ انسان کا خیال کرتے ہی ندیمؔ کی روح وجد میں آجاتی ہے۔

اِس حوالے سے فتح محمد ملک رقم طراز ہیں:

''اِس پراسرار کائنات کا سرِ اکبر انسان ہے جو مسلسل ارتقا ہے جسے ندیمؔ نے حسنِ یزداں سے لے کر حسنِ بتاں تک دیکھنے کے بعد خدا کے ذہن کا پارۂ عظیم قرار دیا ہے۔'' ۹

ندیمؔ کو انسان اور اِس کے جوہر پر زبردست اعتماد ہے۔ وہ انسان کو خدا کا عظیم شہ پارہ گردانتے ہیں۔

اِن کا یہ شہ پارہ تخلیق تصورِ انسانیت کی وجہ سے متحرک اندازِ نظر کا حامل ہے۔ ندیمؔ کہتے ہیں:

دعویٰ ہے اسے عرش بریں میرا ہے
وہ سوچتا ہے عرش نشیں میرا ہے
دھرتی پہ اُترنا، نہ خدا کے بندو
انسان کو کہنا نہ کہیں میرا ہے ۱۰؎

ندیمؔ کے اِسی تصورِ انسانیت کی وجہ سے وہ انسان کو باوقار دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ندیمؔ خیر کی قوتوں کا ساتھ دیتے ہیں اور خیر کے مقابلے میں شر کی قوتوں کے خلاف حق و صداقت کی شمع روشن کرتے ہیں۔ ندیمؔ ماضی کے مقابلے میں حال کی مثبت قوتوں کا ساتھ دیتا ہے۔

اِن کی رباعی میں بیک وقت ازل کے فن کار اور اپنی ذات میں چھپے ہوئے فن کار سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اِس رباعی میں ندیمؔ کہتے ہیں:

تخلیق ہوئی ہیں کائناتیں کتنی
انوار میں ڈھل چکی ہیں راتیں کتنی
سب راز اگرچہ ہیں برافگندہ نقاب
تجھ سے ابھی پوچھنی ہیں باتیں کتنی ۱۱؎

ندیمؔ کی رباعی میں مسائلِ حیات نئے نئے انداز سے اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ زندگی کے اِن مسائل کی حد، مروجہ غلط نظام اقدار، کھوکھلی تعمیر، معاشی تفاوت، مصنوعی تمدن سے لے کر وطن دوستی، سامراج دشمنی، کسان مزدور انقلاب، جمہوریت پسندی اور بین الاقوامیت تک پھیلی ہوئی ہے۔

بقول جمیل ملک:

"ندیمؔ کی رباعی میں موضوعات کی رنگا رنگی نے ایک قوی رجحان کی صورت میں اُبھر کر ایک طرف اُس کی نظریاتی جدوجہد کی نقاب کشائی کر دی ہے اور دوسری طرف اُس کی رُباعی کو ایک ایسا زوردار توانا آہنگ بخش دیا ہے جو ___ ندیمؔ سے پہلے زیادہ تر درباروں، خانقاہوں اور مدرسوں تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔" ۱۲؎

ندیمؔ کہتے ہیں:

روئی کی طرح اپنا کلیجہ دھن ڈوں
ریشم کی مثال سرخ شالیں بُن ڈوں
نادار عروس! آ! ترے ماتھے پر
میں قوم کے آنسوؤں کی افشاں چُن ڈوں ۱۳؎

اس حال پہ ماضی کے سب آثار نثار
اس غدر پہ سلطان کا دربار نثار
انسان نے شنگھائی سے واشنگٹن تک
وہ آگ جلائی ہے کہ گلزار نثار ۱۴؎

شہروں کی طرف سے اِک غبار اُٹھے گا
طوفان نہیں، محشرِ بہار اُٹھے گا
کھلیان کی دُھول چھانتے دہقانو
دانہ دانہ کبھی پکار اُٹھے گا ۱۵؎

ندیمؔ کی رباعی میں ایک طرف اگر ماضی کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے تو دوسری طرف ہر چیز وقت کی گزران میں تحلیل ہوکر ابدیت سے ملتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ندیمؔ ماضی اور مستقبل پر بھی نظر ڈالتے ہیں لیکن حال پر اِن کے قدم اتنی مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں کہ یہ عصرِ حاضر بار بار ان کے فن میں اُبھرتا ہے:

انسان سرافیل کا ثانی نکلا
اِک ذرہ قیامتوں کا بانی نکلا
جب ہونٹ ہلے، گلوں کی بارش سی ہوئی
جب جسم کٹا تو خون پانی نکلا ۱۶؎

ندیمؔ کی رُباعی عصری تقاضوں کی آئینہ دار ہونے کے باوجود ماضی، حال اور زمان و مکان کے فاصلوں

کو سمیٹ کر اپنی روح میں ضم کر لیتی ہے۔ ندیمؔ ابدیت کی حدود کو بھی چھوتا ہے اور حال کے نقطے کی طرف بھی بار بار لوٹتا ہے، جس سے وہ اپنی ہی ذات سے ٹکرا جاتا ہے۔

برسوں کی شکایتیں نہ دُہراؤں گا
بس ایک نگاہ خود پہ دوڑاؤں گا
تم میری طرف قدم بڑھاؤ تو سہی
تم آئے تو میں دُور چلا جاؤں گا ۱۷؎

رُکتی ہوئی سانسوں میں ترانے جاگے
بجھتی ہوئی آنکھوں میں فسانے جاگے
حاصل تھا حیات کا یہی آخری پل
یہ لمحہ جب آیا تو زمانے جاگے ۱۸؎

انجام تلاش کیا کہوں کیا نکلا
ہر راز کا حل راز سراپا نکلا
آئینہ در آئینہ ہیں اسرارِ حیات
ہر پردے کی اوٹ میں ندیمؔ آ نکلا ۱۹؎

وہ ٹوٹ کے بجھ گئے شرار آخرِ کار
وہ چہرۂ گُل ہے پُرغبار آخرِ کار
ہر چیز ابد کا ورد کرتی اُٹھی
ہر چیز کو مل گیا قرار آخرِ کار ۲۰؎

آفاق کو ایوان بنایا اپنا
تقدیر میں کردار رچایا اپنا
مجرے کو فرشتے بھی زمیں پر اُترے
انسان نے جب سراغ پایا اپنا ۲۱؎

ندیمؔ کا دل ایک طرف جہاں معمولی سی خوشی سے کھل اُٹھتا ہے تو دوسری طرف انسان کی فریاد بھی اس کے دل میں طوفان اُٹھا دیتی ہے۔ ندیمؔ اگرچہ حسن کو زندگی میں سمو کر اُسے ابدیت سے ملانے کا قائل تو ہے لیکن اِس حقیقت سے بھی آگاہ ہے کہ انسان کے بغیر کائنات کو خوب صورت دیکھنے کا خواب پورا نہیں ہو سکتا۔ ندیمؔ کبھی بھی نا اُمید نہیں ہوتے جب اِن کو زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا ہے تو بھی یقین و عزم کے ساتھ اِن منفی قوتوں کی کوششوں کو ناکام کرتے ہیں۔ رباعی کے ذریعے اِس انداز میں آواز بلند کرتے ہیں۔ اِن کی صدا عصر حاضر کی صدائے بازگشت بن جاتی ہے۔

آفاق کا سیاح ہے زنداں میں اسیر
ہے پہنے ہوئے شہابِ ثاقب زنجیر
اے آگ کو پھونکوں سے بجھانے والو
شعلوں کے لیے یہی ہوا ہے اکسیر ۲۲

ندیمؔ نے رباعی میں زنداں میں ہونے والے ظلم و جبر کو بھی بیان کیا ہے اور اُن بے درد لمحات اور کیفیات کا اظہار کیا ہے جس کی وجہ سے شاعر کی صلاحیتیں بھی شل ہو کر رہ جاتی ہیں۔

زنداں کی سحر پہ ہیں سلاخوں کے داغ
کٹتی ہیں شعاعیں تو سنتا ہے دماغ
یہ صبح ہے یا نزع میں بچے کی ہنسی
یہ مہر ہے یا تُربتِ شاعر کا چراغ ۲۳

حمد:

حمد کے معنی اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے ہیں۔ اصطلاح میں حمد اُس نظم کو کہتے ہیں جس میں اُن صفات اور عظمت و قدرت کا ذکر کیا جاتا ہے، جن کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہو۔ حمد کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں، یہ اتنا وسیع موضوع ہے، جس قدر خدا اور کائنات۔

حمد کے لیے کوئی ایک وزن، بحر یا ہیئت متعین نہیں۔ اِس کو مختلف ہیئتوں میں لکھا گیا ہے۔ حمد کے لیے

ضروری ہے کہ زبان پاکیزہ اور بلیغ ہو اور شاعر کا لہجہ مودب ہو اور اس کو لکھتے ہوئے ذاتِ باری تعالیٰ میں ڈوب جائے۔

حمد اُردو شاعری کی قدیم ترین صنف ہے۔ اِس کا آغاز قرآن مجید کی پہلی سورۃ سے ہی ہوتا ہے۔ عربی اور فارسی کے بعد اُردو شاعری کے آغاز میں ہی حمد کا آغاز ہو گیا تھا۔ قدیم شعرا کے ہاں مثنوی، دیوان اور قصائد کا آغاز حمد سے ہوتا ہے۔

حمد کے بارے میں آتکہ رقم طراز ہیں:

''دنیا کے اکثر شعرا نے تبرکاً اور عقیدتاً اپنے کلام کے آغاز میں حمدیہ اشعار کہے ہیں اور اِس قسم کے کلام کو اپنے لیے برکت اور فیض کا موجب مانا ہے۔'' ۲۴

حمد کہنے کی روایت نہ صرف مسلمان شعرا میں تھی بلکہ ہندو شعرا اور مثنوی نگاروں نے بھی اِس سے انحراف نہیں کیا اور ہر دیوان کی پہلی غزل اور ہر مثنوی میں قصہ کے آغاز سے قبل مثنوی نگار حمد کہتا ہے۔

احمد ندیؔم قاسمی جو کہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ اس تحریک سے وابستہ لوگوں نے مذہبی اور روحانی روایات کے خاتمے کی کوششیں کیں لیکن ندیؔم نے اس روایت سے انحراف کیا اور خدا سے محبت و عشق کا اظہار حمد لکھ کر کیا۔ ندیؔم خدا کو اپنا دوست اور ہمدرد مانتے ہیں اور وہ خدا کے جلال و جمال اور علیم و خبیر جیسی صفات کے بڑے قدردان ہیں اور خدا کو جمیل اور خبیر کہہ کر یوں مخاطب ہوتے ہیں:

تُو حبیب بھی، تُو حفیظ بھی، تُو رحیم بھی، تُو کریم ہے
تُو بصیر بھی، تُو نصیر بھی، تُو کبیر ہے، تُو حلیم ہے
مجھے رنگ دے
مجھے اپنے رنگ میں رنگ دے
تُو جمال بھی، تُو جمیل بھی، تُو خبیر ہے، تُو علیم ہے
یہ حروف تیری امانتیں، یہ ندیؔم تیرا ندیم ہے
مجھے رنگ دے
مجھے اپنے رنگ میں رنگ دے ۲۵

خاور نقوی، ندیمؔ کی اِس حمد کے متعلق لکھتے ہیں:

''احمد ندیمؔ قاسمی کی خوب صورت حمد (مجھے رنگ دے۔ مجھے اپنے رنگ میں رنگ دے)
گیت کے لحن کے ساتھ قاری کو اپنے بہاؤ میں لے کر چلتی ہے۔'' ۲۶

ندیمؔ نے منفرد لہجہ میں حمد کہی ہے۔ اُن کی خوب صورت حمد یہ نظم کا ایک بند ملاحظہ کریں:

اے خدا!
میری دُعا ہے کہ گجردم کی پراسرار فضاؤں میں ترا نطق!
کسی شاخِ برہنہ پہ اُترتی ہوئی چڑیا کی طرح
میرے دِل میں کسی بے نام سے احساسِ مسرت سے مسلسل۔۔۔ چہکے! ۲۷

نعت:

نعت، وہ صنفِ نظم ہے جس میں آنحضور ﷺ کی ذات وصفات اور اُن کے شخصی حالات کو بیان کیا جاتا ہے۔ بقول فرمان فتح پوری:

''نعت عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے لغوی معنی تعریف یا وصف بیان کرنے کے ہیں۔'' ۲۸

اصطلاحی معنوں میں نعت کا لفظ صرف آنحضرت ﷺ کی تعریف اور مدح کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق نعت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''نعت وصف محمود کو کہیں گے۔۔۔ وصف کے معنی ہیں کشف اور اظہار۔ شاعرانہ اصطلاح میں وصف کسی چیز کے عوارض اور اِس کی خصوصیات کو نمایاں کرنے کو کہتے ہیں۔'' ۲۹

نعت کا لفظ آنحضور ﷺ کے وصف کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس میں آنحضور ﷺ کی عبدیت، رسالت، بنی آدمؑ سے آپ ﷺ کی رافت و رحمت اور دیگر انبیائے کرام کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ درحقیقت نعت اظہار کا ایسا ذریعہ ہے، جس کے ذریعے ایک مسلمان آنحضور ﷺ سے اپنی عقیدت اور احترام کا اظہار کرتا ہے۔ نعت وسعت کی حامل ہے

اور اس میں ایک مضمون کو کئی طریقوں سے بیان کیا جاتا ہے۔

بقول رفیع الدین ہاشمی:

''موضوع کی وسعت اور تنوع کے پیش نظر نعت کی کوئی مخصوص ہیئت نہیں۔ نعت ''اِک رنگ کا مضمون ہو تو سو ڈھنگ سے باندھوں'' کے مصداق ہر ہیئت میں لکھی گئی ہے۔'' ۳۰؎

نعت شاعری کی مختلف ہیئتوں مثلاً قصیدہ، مثنوی، غزل، رباعی، قطعہ یا مسدس یا مخمس وغیرہ میں سے کسی بھی ہیئت میں کہہ سکتے ہیں۔

نعت کا موضوع اِس قدر وسعت کا حامل ہے کہ اس میں آنحضورﷺ کے فضائل کے ساتھ ساتھ معمولاتِ نبوی، غزواتِ نبوی، آدابِ مجالس نبوی، عباداتِ نبوی اور اخلاقِ نبوی کے بے شمار پہلو شامل ہیں۔ حسن سلوک، حسن بیان، عدل و انصاف، سادگی و بے تکلفی، حسن خیال، عزم و استقلال، مساوات، مہمان نوازی، قناعت، شفقت و محبت، انسانی ہمدردی سب نعت کا موضوع ہیں۔ حمد کی طرح نعت بھی قدیم صنفِ شعر ہے۔ نعت گوئی کا آغاز خود اللہ تعالٰی نے قرآن پاک میں کیا ہے۔ کہیں آنحضورﷺ کی تعریف کی گئی ہے کہیں طرح طرح کے القاب دیے گئے ہیں اور کہیں دشمنوں اور کافروں کے اعتراضات کے جواب دیے گئے ہیں۔

اسلام کے ابتدائی دور سے ہی نعت کہی جاتی تھی۔ عرب کے نعت گویوں میں حسان بن ثابت، ابن ہشام شامل ہیں۔

فارسی زبان میں نعت گو شعرا میں شیخ سعدی، حافظ شیرازی نے جو نعتیں کہی ہیں وہ شاہ کار کی حیثیت رکھتی ہیں۔

دیوان یا مثنوی میں حمد کے بعد نعت کا التزام کیا جاتا تھا۔ مسلم شعرا کے ساتھ ساتھ ہندو شعرا نے بھی بکثرت نعتیں کہی ہیں۔ ان میں دیا شنکر نسیم، کالیکا پرشاد اور کشن پرشاد شاد وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

مسلمانوں نے دنیا کی جس زبان میں بھی شاعری کی ہے، اُس زبان میں نعت ضرور لکھی ہے۔ نعت

کے لیے شاعر کا فنی اعتبار سے ماہر ہونا ازحد ضروری ہے کیوں کہ آنحضورﷺ کی صفات اور باری تعالیٰ کی صفات میں حدِ فاصل قائم رکھنا بے حد ضروری ہے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی ایسی صفت کو آپﷺ سے منسوب کر دیا جائے جو کہ اللہ تعالیٰ کی ہو۔ اس لیے نعت کے لیے الفاظ اور زبان ایسی استعمال کرنی چاہیے جو کہ آنحضورﷺ کے مرتبے اور حیثیت کے مطابق ہو اور اِس میں سوز اور تاثیر کا ہونا بھی ضروری ہے۔

بقول پروفیسر شفقت رضوی:

> ''نعت گوئی کے لیے شاعری کے فن سے واقفیت اور زبان پر کامل عبور بھی ضروری ہے۔۔۔
> لفظ محاوروں اور روزمرہ کے استعمال میں بھی حد درجہ احتیاط کی ضرورت ہے۔'' ۳۱

نعت ایسا موضوع نہیں جس پر ہر کس و ناکس تخیل اندازی اور خامہ فرسائی کر سکے۔ نعت کا تعلق دینی احساس، صدق، اخلاص اور محبتِ رسولﷺ سے ہے۔ اُردو کے شعرا میں امیر مینائی، محسن کاکوروی، بیدم وارثی، ظفر علی خان، علامہ اقبال، احسان دانش، حفیظ جالندھری، ماہر القادری، مظفر وارثی، نعیم صدیقی، حافظ لدھیانوی، حفیظ تائب اور احمد ندیم قاسمی کا شمار نعت گو شعرا میں ہوتا ہے۔

نعت گوئی ایک الگ فن ہے لیکن ندیم نے جب اِس کی طرف توجہ کی تو اسے بھی اِس طرح اپنے مزاج کا حصہ بنا لیا جسے ان کی تمام تر قدرتی صلاحیت صرف مدحِ رسولﷺ ہی کے لیے ہو۔ ۱۹۸۰ء کے بعد ندیم نعت کی طرف راغب ہوئے اور پھر نعت کہنے کی طرف اتنی توجہ برتی کہ نعتیہ مجموعہ ''جمال'' کے نام سے لکھا جس میں بائیس (۲۲) نعتیں شامل ہیں۔ ندیم نے کل اکتیس (۳۱) نعتیں کہی ہیں۔

ندیم کی حضورﷺ سے والہانہ محبت کے حوالے سے جلیل عالی رقم طراز ہیں:

> ''حضورِ اکرمﷺ سے ندیم کی محبت و عقیدت کا یہ عالم ہے کہ اس نے نہ صرف باقاعدہ نعتیں لکھیں بلکہ نعت کے ایسے ایسے اشعار کہے جو اُردو کی نعتیہ شاعری میں وقیع اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس نے بڑی خوب صورتی سے انسانوں کے درمیان آپﷺ کی مثالی سیرت کے پہلو اُجاگر کیے ہیں۔'' ۳۲

ندیمؔ کہتے ہیں:

ے ---- اے مرے شاہِ شرق و غرب نانِ جویں غذا تری
اے مرے بوریا نشیں! سارا جہاں گدا ترا ---- ۳۳

ے ---- ہر آدمی کو تشخص ملا ترے دم سے
جو بے شمار تھے ، اِن کو شمار تُو نے کیا ---- ۳۴

ے ---- ترے کمالِ مساوات کی قسم ہے مجھے
کہ تیرے دیں سے بڑا کوئی انقلاب نہیں ---- ۳۵

ندیمؔ، آنحضورﷺ کے اخلاق و کردار سے بے حد متاثر تھے۔ حضورِ پاکﷺ نے محبت و اخوت اور خیر و خوبی کا جو پیغام دیا، ندیمؔ نے ہمیشہ اُس کو دھیان میں رکھا۔

بقول ندیمؔ:

شانِ خدا بھی آپؐ ، محبوبِ خدا بھی آپؐ ہیں
تجسیمِ حق بھی آپؐ ہیں اور حق نما بھی آپؐ ہیں
روزِ ابد تک آپؐ ہیں سالارِ جیشِ انبیاء
روزِ ازل سے مرشدِ اہلِ صفا بھی آپؐ ہیں
قدرت کی ہر تخلیق کا، ہیں آپؐ واحد مدعا
حسنِ زمیں بھی آپؐ ہیں، نورِ سما بھی آپؐ ہیں
اپنے رفیقوں کے لیے پتھر بھی ڈھوئے آپؐ نے
اور دشمنوں کے حق میں مصروفِ دعا بھی آپؐ ہیں
اسلام کے حلقے میں جو اوہام کا بیمار ہو
اس کی دوا بھی آپؐ ہیں، اس کی شفا بھی آپؐ ہیں ---- ۳۶

تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی کبھی کوئی مشکل وقت پڑتا ہے یا کوئی بحرانی صورتِ حال درپیش ہوتی ہے تو ہم اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنے کے ساتھ ساتھ آنحضور ﷺ کی ذات کی طرف بھی رجوع کرتے ہیں۔ ندیم نے بھی ایسے اشعار کہے ہیں جن میں عصری بحرانوں کے حوالے سے آپ ﷺ سے مدد کی التجا کی گئی ہے۔ اُنھوں نے مسلمانوں کی تنزلی اور بدحالی کو بھی اپنی شاعری میں بیان کیا اور فلسطین پر یہودیوں کے غاصبانہ قبضے کی مذمت کی ہے۔

ے ایک بار اور بھی بطحا سے فلسطین میں آ
راستہ دیکھتی ہے مسجدِ اقصیٰ تیرا ۳۷

ندیم خود کو آنحضور ﷺ سے نسبت دے کر تاریکیوں اور مشکلات کے سامنے ڈٹ جانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ تاریکیوں میں چراغ روشن کرنا اور دین و دنیا میں کامیابی حاصل کرنا نعت کا اہم موضوع ہے۔ ندیم نے بھی اِس موضوع پر اِس طرح قلم اُٹھایا ہے کہ یہ موضوع پھولوں کی طرح شگفتہ دکھائی دیتا ہے۔

جب اُترتی ہے مری روح میں عظمت اِس کی
مجھ کو مسجود ملائک کا بنا دیتا ہے
رہنمائی کے یہ تیور ہیں کہ مجھ میں بس کر
وہ مجھے میرے ہی جوہر کا پتہ دیتا ہے
وہی نمٹے گا مری فکر کے سناٹوں سے
بت کدوں کو جو اذانوں سے بسا دیتا ہے ۳۸

ندیم نے جو نعتیں لکھی ہیں۔ اُن میں اِس قدر اثر پذیری ہے کہ ان نعتوں کا لفظ لفظ کانوں میں رس گھولتا ہے اور دل و جاں کو روشن کرتا ہے۔ ندیم نے آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی کے حضور نعت کی صورت میں عقیدت کے نذرانے پیش کیے ہیں۔ ظلمتِ دہر اور آندھیوں میں آنحضور ﷺ کو پکارا ہے۔ ندیم کہتے ہیں:

ظلمتِ دہر میں جب بھی میں پکاروں اُس کو
وہ مرے قلب کی قندیل جلا دیتا ہے

اُس کی رحمت کی بھلا آخری حد کیا ہو گی
دوست کی طرح جو دشمن کو دعا دیتا ہے
وہی سرسبز کرے گا مرے ویرانوں کو
آندھیوں کو بھی جو کردارِ صبا دیتا ہے ۳۹

آنحضور ﷺ جو کہ انبیا کے امام ہیں اور آپ ﷺ کی زندگی ہمارے لیے بہترین عملی نمونہ ہے۔ اِس موضوع کو ندیم نے سادگی اور پُرکاری سے بیان کیا ہے اور جس طرح متنوع پیرایہ میں اِس کو بیان کیا ہے، اِس سے اِن کی فن کارانہ مہارت اور تخلیقی گہرائی کا علم ہوتا ہے۔

آنحضور ﷺ کی تعریف اور نعت بہت سی احادیث میں ملتی ہے۔ جیسا کہ اِس حدیث میں ہے:

''حضور اکرم ﷺ سے روایت ہے کہ جب قیامت کا روز ہو گا تو میں انبیا کا امام اور ان کا خطیب اور شفاعت کرنے والا ہوں گا لیکن اِس پر مجھے فخر نہیں ہے۔'' ۴۰

ندیم نے بھی آنحضور ﷺ کے بارے میں اِن خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:

آپؐ نویدِ عیسیٰ بھی ہیں، مژدۂ موسیٰ بھی
آپؐ ایثار و وفا کے وارث، سبطِ خلیل ہیں آپؐ
آپؐ کے ذکر سے کھلتے جائیں، راز جہانوں کے
قدم قدم پہ وجود و عدم میں سب کے کفیل ہیں آپؐ
روزِ ازل، انساں کو خدا نے اِک منشور دیا
اور اِسی منشورِ ہدایت کی تکمیل ہیں آپؐ ۴۱

آنحضور ﷺ کی ذات وصفات کی تعریف حضرت خدیجہؓ نے اِن الفاظ میں کی ہے:

''حضرت خدیجہؓ نے کہا: ہرگز نہیں۔ اللہ کی قسم آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کبھی رسوا نہیں کرے گا۔ آپ ﷺ صلہ رحمی کرتے اور بوجھ اُٹھاتے اور محتاج کی مدد فرماتے اور مہمان نوازی فرماتے ہیں۔'' ۴۲

اور حضرت عائشہؓ نے فرمایا:

''آپ ﷺ کا خلق قرآن ہے۔'' ۴۳

ندیم نے بھی آنحضور ﷺ کی ذات وصفات کے بارے میں انہی خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:

آپ کی اِک اِک بات کلامِ الٰہی کی تفسیر
قرآں تو اجمالِ بلیغ ہے اور تفصیل ہیں آپؐ ۴۴

رنگ کی قید، نہ قدغن کوئی نسلوں کی یہاں
جس کے دَر سب پر کُھلے ہیں وہ دبستان تُو ہے ۴۵

کوئی نہ جن کی سُنے، اُن کی بات تُو نے سنی
ملا نہ پیار جنہیں، اُن سے پیار تُو نے کیا ۴۶

ندیم نے ترقی پسند تحریک میں فعال کردار ادا کیا۔ ترقی پسندی اور مذہب بیزاری لازم وملزوم سمجھی جاتی تھی۔ اس وجہ سے اِن پر مذہب بیزاری اور کافر ہونے کے الزامات بھی لگے لیکن ندیم خدا اور رسول ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے کئی مرتبہ اپنے انٹرویو میں اِس بات کی تردید کی اور کہا کہ وہ آنحضور ﷺ کو خاتم النبیین مانتے ہیں اور مذہب کو قوت اور محبت کی روشنی سمجھتے ہیں۔ ندیم ترقی پسند ہونے کے باوجود اپنے مذہبی اور معاشرتی اقدار سے دست بردار نہ ہوئے۔

بقول الطاف حسین قریشی:

''قاسمی کے ہاں مولویوں کے خلاف تو نفرت کا اظہار پایا جاتا ہے مگر اپنے دین اور اپنی اخلاقی اور تہذیبی قدروں سے گہرا لگاؤ بہت نمایاں ہے۔'' ۴۷

ندیم کو اپنی اخلاقی اور تہذیبی قدروں سے گہرا لگاؤ تھا۔ اِس وجہ سے ہی ندیم نے ایسی روح پرور اور خوب صورت نعتیں لکھیں جو دل و ذہن کو تازگی اور سرمستی عطا کرتی ہیں۔ ندیم کی نعت گوئی اِن کی عمیق مذہبیت کا

سراغ دیتی ہے۔ اُن کی مشہور نعت، نعت گوئی میں مینارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔

ے تجھ سے پہلے کا جو ماضی تھا، ہزاروں کا سہی
اب جو تا حشر کا فردا ہے وہ تنہا تیرا ۴۸؎

ندیمؔ سچے اور کھرے مسلمان تھے۔ ان کا اظہار اُنھوں نے خود بھی کیا۔ اپنے ایک انٹرویو میں مذہبی مزاج اور دوسری طرف ترقی پسندی میں توازن کے حوالے سے جواب دیا:

''میرا مزاج یقیناً مذہبی ہے۔۔۔ اور حضرت محمد ﷺ کو انسانیت کا فخر قرار دیتا ہوں۔۔۔ رہی میری ترقی پسندی، تو میرا مذہب، میری ترقی پسندی میں نہ صرف یہ کہ حائل نہیں ہوا بلکہ وہ تو میری ترقی پسندی میں میرا مددگار ثابت ہوا ہے۔ آخر رسول مقبول ﷺ سے بڑا ترقی پسند کون ہوگا۔ یہ کوئی میرا کمال نہیں ہے کہ مذہبی ذہن رکھنے کے باوجود ترقی پسند ہوں۔ یہ سب میرے رسول ﷺ کی دین ہے۔'' ۴۹؎

ندیمؔ کی آنحضور ﷺ سے گہری وابستگی کے بارے میں ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی رقم طراز ہیں:

''اسلام اور ہادی اسلام سے ندیمؔ کی محبت کا اندازہ ان کی بلند پایہ نعتوں سے ہوتا ہے جن میں صمیم قلب کے ساتھ اظہار عقیدت کیا گیا ہے۔ دنیا طلبی اور ریاکاری کی بنیاد پر ایسے شاہکار وجود میں نہیں آیا کرتے۔'' ۵۰؎

ندیمؔ نے اپنے قلم سے جس طرح آنحضور ﷺ کی مدح کے پھول بکھیرے وہ خود کامل اور لازوال ہیں۔ آپ ﷺ کی ذات رب کائنات کے بعد سب سے بلند ہے اور عالمِ انسانیت میں آپ ﷺ کی مثال کوئی نہیں۔ ندیمؔ نے منفرد رنگ و آہنگ سے اِس مضمون کو شعر میں پرو دیا ہے۔

ے قصر و ایواں سے گزر جاتا ہے چپ چاپ ندیمؔ
درِ محمدؐ کا جب آئے تو صدا دیتا ہے ۵۱؎

ے اس خدا سے مجھے کیسے ہو مجالِ انکار
جس کے شہ پارۂ تخلیق کا عنواں تُو ہے ۵۲؎

ے وہ بشر ہے، کہ یہی اِس کا ہے ارشاد، مگر
اس جہانِ بشریت میں ہے یکتا بھی وہی ۵۳

آنحضورﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ایسا کامل اور جامع نظامِ حیات ملتا ہے جو معاشرے کے کسی بھی شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے فرد کے لیے رشد و ہدایت کا سرچشمہ ہے۔

قرآن مجید میں ارشادِ رب العزت ہے:

''بے شک! تمہارے لیے رسول ﷺ کی زندگی بہترین نمونۂ عمل ہے۔'' ۵۴

ندیمؔ نے بھی اِس مضمون کی سادگی اور پُرکاری سے بیان کیا ہے۔ ندیمؔ لکھتے ہیں:

ے پتھروں میں بھی لہو دوڑ گیا
اس قدر عام تھی رحمت اُنؐ کی
آج ہم فلسفہ کہتے ہیں جسے
وہ مساوات تھی عادت اُنؐ کی ۵۵

ے مجھے قسم ہے تری سیرتِ منزہ کی
کہ تاج و تخت پہ اک طنز تھی چٹائی تری ۵۶

ایسا دور جس میں امن و آشتی کے نام پر ظلم و ستم اور قتل و غارت ہو، جمہوریت کی آڑ میں آمریت نے جال پھیلا رکھا ہو اور خود غرضی اور ناانصافی کا دور دورہ ہو تو آپ ﷺ کی عدل کی بارگاہ ہی اُمید کی کرن دکھاتی ہے۔ ندیمؔ آنحضور ﷺ کے در پہ کھڑے ہو کر آواز بلند کرتے ہیں اور نہ صرف اپنے لیے بلکہ پوری انسانیت کے لیے دعا کرتے ہیں۔ آپ ﷺ کے در پر کھڑے ہو کر نہایت عاجزی سے کہتے ہیں:

ے مرے حضورؐ! سلام و درود کے ہمراہ
کئی گلے بھی کروں گا کہ دردمند ہوں میں

جدید تر ہے تمہارا نظامِ زیست مگر
قدیم آنچ پہ اِک دانۂ سپند ہوں میں ۵۷

؎ مرے حضورؐ! میں سچ بولتا ہوں، لیکن
مری زبان پہ رکھتے ہیں لوگ انگارے
میں ظلمتوں میں تجلّی کی جب دہائی دوں
تو میرے سر پہ برستے ہیں آہنی تارے
تمہارے نام کا تنہا جنہیں سہارا تھا
تمہارے نام پہ لُٹنے لگے ہیں بے چارے ۵۸

بعض لوگوں نے ندیمؔ کی نعت گوئی پر الزامات لگائے اور کہا کہ ضیاالحق کے دور میں جس طرح مفاد پرست لوگوں نے اسلام کے نام پر نعتیں کہہ کر ضیاء الحق کے قریب ہونے کی کوشش کی، اسی طرح ندیمؔ نے بھی محض حکومت کے قریب ہونے اور انعام و اکرام حاصل کرنے کے لیے نعت گوئی کو اپنایا۔ جیسا کہ مظفر وارثی نے کہا:

> ''ندیمؔ صاحب ضیاالحق کے عہد میں مشرف بہ نعت ہوئے۔۔۔ ضیاالحق کا عہد فروغِ نعت کا عہد ہے۔ ان کے عہد میں ریڈیو، ٹی۔وی، پبلک مشاعرے غرض ہر میڈیا پر پچانوے فی صد نعتیہ مشاعرے ہوئے۔ آپ کی جتنی قابلِ ذکر نعتیں ہیں اِن کا تعلق اِسی عہد سے ہے۔ اگر آپ نعت نہ لکھتے تو دس گیارہ سال تمام ذرائع ابلاغ سے غائب رہتے۔'' ۵۹

مظفر وارثی کی اِس بات کو درست تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ ندیمؔ شروع سے مذہبی ذہن رکھتے تھے اور اُنھوں نے پیروں کے خاندان میں آنکھ کھولی۔ مذہبی احساس کے مالک ہونے کی وجہ سے اِن کے ہاں نعت گوئی کا رجحان پیدا ہوا جو کہ اِن کے مذہبی احساس کا ارتقا تھا۔

ندیمؔ کی نعت خود بتاتی ہے کہ نعت کسی مفاد کے لیے نہیں بلکہ اندرونی جذبے سے متاثر ہو کر لکھی گئی۔

ندیمؔ کہتے ہیں:

؎ کچھ نہیں مانگتا شاہوں سے یہ شیدا تیرا
اس کی دولت ہے فقط نقشِ کفِ پا تیرا

پورے قد سے کھڑا ہوں تو یہ تیرا ہے کرم
مجھ کو جھکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیرا ۶۰

محمد اظہار الحق، ندیم کے مذہبی رجحان اور نعت گوئی کے متعلق رقم طراز ہیں:

''احمد ندیم قاسمی نے اپنے اوپر کوئی خول نہیں چڑھایا۔ ''مجھ کو جھکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیرا'' جیسی نعت کہنے والا شاعر مذہب کو بھی استعمال کر سکتا تھا، لیکن وہ سچا، کھرا مسلمان تھا۔ سچائی میں تلوار کی طرح برہنہ اور باطن اور ظاہر کو ایک رکھنے والا۔'' ۶۱

ندیم نے آنحضور ﷺ کی بارگاہ میں جو نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے وہ تا قیامت نعت خواں پڑھتے رہیں گے۔

نعیم قاسم رقم طراز ہیں:

''احمد ندیم قاسمی پر بعض تنگ نظر، مذہبی رہنما سنگ زنی کرتے رہے۔ آنحضرت ﷺ کی بارگاہِ اقدس میں اُنھوں نے جو نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے وہ تا قیامت نعت خواں حضرات پڑھتے رہیں گے اور خاک پائے رسول، قاسمی کی شفاعت حضور اکرم ﷺ کریں گے۔'' ۶۲

ندیم کی نعت میں تغزل کا رچاؤ اور زبان و بیان کا بہاؤ ملتا ہے۔ اُنھوں نے رواں اور سادہ زبان و بیان میں نعت کو اِس طرح لکھا ہے کہ اِس سے قاری سرشاری سے دوچار ہو جاتا ہے۔

ہر دائرہ آواز کا ، لفظِ محمدؐ بن گیا
میرے لیے تو قبلۂ صوت و صدا بھی آپ ہیں ۶۳

اِس نعت کی پوری فضا تغزل میں رچی ہوئی ہے اور آنحضور ﷺ سے والہانہ محبت کی عکاس ہے۔ اِن کی نعت سادگی، دل کشی اور تغزل کی خصوصیات کی بنا پر قاری کے حافظے کا جز بن جاتی ہے۔

قرآن پاک اُن پہ اُتارا گیا ندیم
اور میں نے اپنے دل میں اُتارا ہے اُن کا نام ۶۴

عبدالحفیظ ارشد، ندیمؔ کی نعت گوئی کے متعلق رقم طراز ہیں:

''ندیمؔ نے نعت گوئی کو بھی نئی طرز دی اور آپ کے یہ اشعار ہر عام و خاص کی زبان پر موجود ہیں اور پڑھتے وقت انسان پر وجد طاری ہو جاتا ہے۔'' ۶۵

سلام:

سلام اُردو شاعری کی ایک صنف ہے جسے مرثیہ گو شعرا نے ترقی دی۔ سلام میں غزل کا انداز پایا جاتا ہے۔ اِس میں قوافی کی ترتیب بھی غزل کی ہیئت کے مطابق ہوتی ہے۔ اِس کا ہر شعر غزل کی طرح اپنی جگہ مکمل وحدت کی حیثیت رکھتا ہے جس کا دوسرے شعروں کے ساتھ منطقی اعتبار سے مربوط ہونا ضروری ہے لیکن سلام میں غزل کا رنگ پیدا نہیں ہونا چاہیے۔ اِس میں وارداتِ قلبی کا اظہار تو کیا جاتا ہے لیکن اِس انداز سے کہ اِس میں تقدس اور متانت کا رنگ غالب ہو۔

منیر احمد لکھتے ہیں:

''سلام کی فضا، غزل کی فضا سے اِس وجہ سے مختلف ہو جاتی ہے کہ غزل کے وہ مضامین جن کا تعلق عشق سے ہے، سلام سے خارج ہیں۔ سلام نے مرثیہ کے بطن سے جنم لیا ہے۔ مرثیہ کے تمام مضامین اِس میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔ مناقب علیؓ، مناقب حسینؓ، مناقب شہدائے کربلا، مصائب آلِ رسولؐ اور شہدائے کربلا کے واقعات، شجاعت و شہادت جیسے مضامین کے علاوہ عام اخلاقی اور تمدنی امور سے بھی اعتنا کیا جاتا ہے۔'' ۶۶

سلام کے لیے بحر کی کوئی قید نہیں لیکن بحر عموماً ایسی منتخب کی جاتی ہے جو سلام کی مقدس روح کے لیے موزوں ہوتی ہے۔ سلام کے لیے الفاظ و محاورات، سادہ اور عام فہم استعمال کیے جاتے ہیں۔

مولانا شبلی نعمانی سلام کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''غزل کی لے اِس قدر کانوں میں رچ چکی تھی کہ ان لوگوں (مرثیہ گو شعرا) کو بھی اِس انداز میں کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑا تھا۔ اِس بنا پر اُنھوں نے غزل کی طرز پر سلام ایجاد کیا۔ سلام میں مضمون کے لحاظ سے ہر شعر الگ الگ ہوتا ہے۔ سلام کی خوبی یہ ہے کہ طرح شگفتہ اور نئی بندش سادہ اور صاف، مضمون درد انگیز اور پرتاثیر ہو۔'' ۶۷

احمد ندیم قاسمی نے بھی سلام لکھا ہے جن کی تعداد چھے(۶) ہے جو کہ ''انوارِ جمال'' میں شائع ہوئے۔

ندیم نے شہیدانِ کربلا اور خصوصاً امام حسینؓ کی جناب میں عقیدت مندانہ سلام و نیاز کا تحفہ بھیجا ہے۔

ندیم لکھتے ہیں:

سبھی عکس تیریؓ شبیہ کے — مرے دل میں ہیں، مرے پاس ہیں
ترا صدق تیرا وجود ہے — ترےؓ زخم تیرا لباس ہیں
وہ ہیں لفظ کتنے گراں بہا — جو نبھا سکیں ترا تذکرہ
مرے آنسوؤں کو قبول کر — یہی میرے حرفِ سپاس ہیں
یہ خیال ہے نہ قیاس ہے — ترا غم ہی میری اساس ہے
جنہیں لو لگی ہو حسینؓ کی — وہی میرے درد شناس ہیں
جسے صرف حق ہی قبول ہو — یہی جس کا اصل اُصول ہو
جو نہ بک سکے، جو نہ جھک سکے — اُسے کربلائیں ہی راس ہیں
وہ جو نورِ چشمِ بتولؓ تھا — جو گُلِ ریاضِ رسول تھا
اُسی ایک شخص کے قتل سے — مری کتنی صدیاں اُداس ہیں ۶۸

ندیم نے جو سلام لکھے ہیں اُس سے دردمندی کے جذبات اُبھرتے ہیں اور اُن کے لکھے ہوئے سلام پرتاثیر اور دردانگیز ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ندیم لکھتے ہیں:

قطرہ جونہی گرا علی اصغر کے خون کا
قعرِ ابد کے طاق میں اِک شمع جل گئی
جب تجھ سے مس ہوئے شہہ تشنہ دہن کے لب
اے ارضِ کربلا، تری قسمت بدل گئی
صدیاں گواہ ہیں کہ جلالِ حسینؓ میں
وہ آنچ تھی، کہ ظلم کی برچھی پگھل گئی
اُس کے سوا جہاں میں ہوئی ہے کسے نصیب
وہ موت جو حیات کے سانچے میں ڈھل گئی ۶۹

حواشی

۱۔ فرمان فتح پوری، ''اُردو رباعی (فنی و تاریخی ارتقا)''، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۲۰

۲۔ ایضاً، ص ۲۱-۲۰

۳۔ بزمی انصاری، ''امیر العروض''، لاہور، مطبع ۱۹۳۹ء، ص ۵۵

۴۔ نیاز فتح پوری، ''نگار''، اکتوبر ۱۹۵۶ء، ص ۵۲

۵۔ فرمان فتح پوری، ''اُردو شاعری کا فنی ارتقا''، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۵۰۔ لوئر مال، ۱۹۹۷ء، ص ۳۱۵

۶۔ اعجاز حسین، ڈاکٹر، ''مذہب و شاعری''، اُردو اکیڈمی، س۔ن، ص ۲۴۳

۷۔ احمد ندیم قاسمی، ''رم جھم''، لاہور، میاں چیمبرز، ۳۔ ٹیمپل روڈ، ۲۰۰۰ء، ص ۱۶۳

۸۔ ایضاً، ص ۱۷۵

۹۔ فتح محمد ملک، ''احمد ندیم قاسمی، شاعر اور افسانہ نگار''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۲۹

۱۰۔ احمد ندیم قاسمی، ''رم جھم''، ص ۱۵۷

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۶۷

۱۲۔ جمیل ملک، ''ندیم کی شاعری''، راول پنڈی، نوید پبلشرز، این ۲۲۲/ر پراچہ سٹریٹ، ۱۹۷۲ء، ص ۸۷

۱۳۔ احمد ندیم قاسمی، ''رم جھم''، ص ۱۶۳

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۶۱

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۶۳

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۵۸

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۷۶

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۶۵

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۶۹

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۶۸

۲۱۔ احمد ندیم قاسمی، ''رم جھم''، ص۱۷۱

۲۲۔ ایضاً، ص۱۷۶

۲۳۔ ایضاً، ص۱۷۶

۲۴۔ آنکہ، ''اُردو شاعری میں نعت گوئی'' (مقالہ برائے ایم۔اے اُردو)، مملوکہ اورینٹل کالج لائبریری، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص۳

۲۵۔ احمد ندیم قاسمی، ''انوارِ جمال''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص۲۱،۲۲

۲۶۔ خاور نقوی، ''رائے'' سہ ماہی ''فنون''، لاہور، دسمبر ۱۹۹۶ء، ص۳۱۲

۲۷۔ احمد ندیم قاسمی، ''انوارِ جمال''، ص۲۷،۲۸

۲۸۔ فرمان فتح پوری، ''اُردو کی نعتیہ شاعری''، کراچی، حلقہ نیاز و نگار، طبع دوم ۱۹۹۸ء، ص۲۱

۲۹۔ رفیع الدین اشفاق، ڈاکٹر سید، ''اُردو میں نعتیہ شاعری''، کراچی، اُردو اکیڈمی سندھ، اکتوبر ۱۹۷۶ء، ص۲۹

۳۰۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، ''اصنافِ ادب''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص۲۶

۳۱۔ شفقت رضوی، پروفیسر، ''اُردو میں نعت گوئی''، کراچی، جہانِ حمد پبلی کیشنز، ۳۸/۲۶ بی ون ایریا لیاقت آباد، ۲۰۰۲ء، ص۱۱۸

۳۲۔ جلیل عالی، ''ندیم کی شعری واردات کی معنوی جہتیں'' مشمولہ ''ادبیات'' (سہ ماہی)، اسلام آباد، اکادمی ادبیات، خصوصی شمارہ، جلد ۱۷، شمارہ ۷۳، اکتوبر ردسمبر ۲۰۰۶ء، ص۱۲۰

۳۳۔ احمد ندیم قاسمی، ''انوارِ جمال''، ص۳۷

۳۴۔ ایضاً، ص۶۵

۳۵۔ ایضاً، ص۷۶

۳۶۔ ایضاً، ص۴۳،۴۴

۳۷۔ ایضاً، ص۵۰

۳۸۔ ایضاً، ص۵۳،۵۴

۳۹۔ ایضاً، ص۵۴

۴۰۔ ترمذی، ''جامع ترمذی''، لکھنؤ، مطبوعہ اصح المطابع، جلد۲، سنہ ۱۳۱۶ھ، ص۵۲۰

۴۱۔ احمد ندیم قاسمی، ''انوارِ جمال''، ص۶۱،۶۲

۴۲۔ حضرت خدیجہ، ''الجامع الصحیح'' بخاری باب بدٔ الوحی، عثمانیہ مصری، جلد۱، سنہ۱۹۳۲ء، ص۳

۴۳۔ حضرت عائشہ، ''الجامع الصحیح'' مسند، امام مسلم، حدیث نمبر۸، مطبوعہ عثمانیہ مصری، س۔ن، ص۱۲

۴۴۔ احمد ندیم قاسمی، ''انوارِ جمال''، ص۶۱

۴۵۔ ایضاً، ص۶۰

۴۶۔ ایضاً، ص۶۵

۴۷۔ الطاف حسن قریشی، روزنامہ ''جناح''، لاہور، ۱۴؍جولائی ۲۰۰۶ء

۴۸۔ احمد ندیم قاسمی، ''انوارِ جمال''، ص۵۰

۴۹۔ منور علی ملک، ''پسِ تحریر''، لاہور، بک مارک (پرائیویٹ) لمیٹڈ، پاک چیمبرز، ۵۔ٹیمپل روڈ، باراوّل ۱۹۹۳ء، ص۱۰۲۔۱۰۱

۵۰۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، ''سانجھ بھئی چودیس'' مشمولہ ''مخزن ۱۵'' (شش ماہی)، لاہور، قائداعظم لائبریری، شاہراہ قائداعظم، باغ جناح، شمارہ ۱، جلد۸، ۲۰۰۸ء، ص۱۵

۵۱۔ احمد ندیم قاسمی، ''انوارِ جمال''، ص۵۵

۵۲۔ ایضاً، ص۵۸

۵۳۔ ایضاً، ص۶۸

۵۴۔ ''القرآن''، سپارہ نمبر۲۱، اتل ما اوحی، سورۃ نمبر۳۳، ''الاحزاب''، آیت نمبر۲۱

۵۵۔ احمد ندیم قاسمی، ''انوارِ جمال''، ص۴۵

۵۶۔ ایضاً، ص۷۵

۵۷۔ ایضاً، ص۸۶

۵۸۔ ایضاً، ص۸۷

۵۹۔ مظفر وارثی، ''گئے دنوں کا سراغ''، لاہور، خزینہ علم و ادب پبلشرز، ۲۰۰۰ء، ص۹۹

۶۰۔ احمد ندیم قاسمی، ''انوارِ جمال''، ص۴۸

۶۱۔ محمد اظہار الحق، روزنامہ ''جنگ''، لاہور، ۱۴رجولائی ۲۰۰۶ء

۶۲۔ نعیم قاسم، پروفیسر، ''نوائے وقت''، راول پنڈی، ۵راگست ۲۰۰۶ء

۶۳۔ احمد ندیم قاسمی، ''انوارِ جمال''، ص۴۴

۶۴۔ ایضاً، ص۴۷

۶۵۔ عبدالحفیظ ارشد، روزنامہ ''اوصاف''، ۹راگست ۲۰۰۶ء

۶۶۔ منیر احمد، ''قیام پاکستان کے بعد بہاول پور میں اُردو مرثیہ'' (مقالہ برائے ایم۔فل اُردو)، بہاول پور، اسلامیہ یونیورسٹی، نگران مقالہ ڈاکٹر نجیب جمال، ۲۰۰۵ء۔۲۰۰۳ء، ص۵۹

۶۷۔ مولانا شبلی نعمانی، ''کشاف تنقیدی اصطلاحات''، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ستمبر ۱۹۸۵ء، ص۱۰۳

۶۸۔ احمد ندیم قاسمی، ''انوارِ جمال''، ص۱۰۷

۶۹۔ ایضاً، ص۱۱۳، ۱۱۴

بابِ ہفتم

محاکمہ

احمد ندیم قاسمی، اپنے زمانے کے معروف شاعر اور ممتاز افسانہ نگار تھے۔ اِس کے سوا، مقبول تنقید نگار، باکمال صحافی اور فلموں کے اعلیٰ مکالمہ نگار اور گیت نگار بھی تھے۔ اُنھوں نے سوانحی خاکے بھی لکھے، بچوں کا ادب بھی تخلیق کیا، کتابوں کی ترتیب و تدوین بھی کی اور صحافت پر اَن مٹ نقوش چھوڑے۔

بیسویں صدی کا آغاز تھا، جب ندیم نے انگہ کے ایک مذہبی اور علمی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ اُن کے والد، پیر غلام نبی، بلند پایہ صاحبِ کرامت بزرگ تھے۔ اُن کی شہرت دُور دُور تک پھیل چکی تھی۔ سیالکوٹ، کشمیر اور گجرات کے لوگ اُن کے مرید تھے لیکن اُنہیں صلے سے سروکار نہ تھا۔ اِن کو لوگ احترام اور پیار سے پیر نبی چن کہتے تھے۔ ندیم کی والدہ غلام بیوی، پُر مزاح، صابر و شاکر، حوصلہ مند، مہذب اور سلجھی ہوئی خاتون تھیں۔ اُنھوں نے غربت اور تنگی میں بھی پُر وقار زندگی بسر کی اور اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت اچھے انداز میں کی۔ اُنھوں نے زندگی کی دشوار اور کٹھن راہوں کو دیکھ کر ہمت نہ ہاری بلکہ ایسے راستے تلاش کیے جن پر چل کر اپنے بچوں کی خوشیاں ڈھونڈ لائیں۔ ندیم اِس گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ اُنھوں نے کیمبل پور (اٹک)، شیخوپورہ اور بہاول پور سے تعلیم حاصل کی۔ پروفیسر پیرزادہ عبدالرشید جیسے وسیع المطالعہ اُستاد سے تعلیم پائی۔ عبدالمجید سالکؔ، اختر شیرانی، حامد علی خان اور سعادت حسن منٹو جیسے مخلص دوستوں کی رفاقتیں پائیں۔

ندیم اچھے انسان تھے؛ مزاج میں ٹھہراؤ تھا اور نرم لہجے میں بات کرتے؛ دوسروں کی عزتِ نفس کا خیال رکھتے، رکھ رکھاؤ سے پیش آتے، معاملے کو خوش تدبیری سے نمٹاتے، طبیعت میں درویشی و انکسار، تحمل و بردباری تھی، لالچ سے کوسوں دُور تھے، جرأت و بے باکی کا نمونہ تھے، اپنے کام خود کرتے، دفتری قواعد میں ذاتی تعلقات کا خیال نہ کرتے، دوسروں کے دُکھ سکھ میں شریک ہوتے، ماتحتوں سے محبت سے پیش آتے اور نوجوان ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرتے اور دوستوں میں خوش کلامی اور حاضر جوابی کا مظاہرہ کرتے۔ ندیم میں پاک و ہند کی ثقافت کے تمام محاسن جمع ہو گئے تھے۔

ندیم جس کی گھٹی میں شعر و شاعری تھی۔ اِس وجہ سے اُنھوں نے وقت سے پہلے لکھنا شروع کر دیا۔

آٹھ برس کی عمر میں ندیم ماہیے اور ٹپے لکھنے لگے۔ گیارہ برس کی عمر میں نظم کہی۔ بارہ برس کی عمر میں ناول لکھا۔ ۱۴ برس کی عمر میں شاعری کرنے لگے۔ ۱۸ برس کی عمر میں افسانے لکھنے لگے اور اسی عمر میں صادق ایجرٹن کالج بہاول پور کے میگزین ''نخلستان'' کی ادارت شروع کر دی۔ ''تہذیبِ نسواں'' کے لیے غیر ملکی کہانیوں کے تراجم کیے۔ ''پھول'' اور ''تہذیبِ نسواں'' کے مدیر رہے۔ ''ادبِ لطیف''، ''سویرا''، ''نقوش''، ''سحر''، ''امروز''، ''اقبال''، ''صحیفہ'' کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ ندیم نے ۱۹۶۳ء میں اپنے ذاتی رسالے ''فنون'' کا اجرا بھی کیا اور اِس کے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھا۔ اِن کی نگرانی میں یہ رسالہ پابندی سے شائع ہوتا رہا۔

ندیم نے بیس برس کی عمر میں ملازمت شروع کر دی۔ پہلی ملازمت ۱۹۳۷ء۔۱۹۳۶ء میں ریفارمز کمشنر لاہور میں بطورِ محرر کی۔ نو دِن ٹیلی فون آپریٹر کی ملازمت کی۔ ۱۹۴۰ء۔۱۹۳۹ء میں بطور ایکسائز سب انسپکٹر ملتان تقرری ہوئی۔ ۴۸۔۱۹۴۶ء ریڈیو پاکستان پشاور میں بحیثیت مسودہ نویس (سکرپٹ رائٹر) کام کیا۔ ۸۷۔۱۹۷۷ء بزمِ اقبال کے اعزازی سیکرٹری مقرر ہوئے اور ۲۰۰۶ء۔۱۹۷۴ء ڈائریکٹر مجلس ترقی ادب لاہور میں ملازمت کی۔

ندیم کے قلم نے ''پھول'' کی تربیت گاہ میں آنکھ کھولی۔ سالک اور اختر شیرانی کی رہنمائی اور رفاقت نے اُن کی شعر و نثر کو پروان چڑھایا۔ اِن کے کہنے پر ندیم نے ''پھول'' میں اپنی نظمیں لکھیں اور افسانوں کی پہلی کتاب ''چوپال'' شائع کرائی۔

ندیم نے کئی اخباروں میں ''حرف و حکایت''، ''پنج دریا''، ''عنقا''، ''مطائبات''، ''موج در موج''، ''لاہوریات''، ''لاہور لاہور ہے'' اور ''رواں دواں'' کے عنوان سے کالم لکھے۔ ندیم نے یہ کالم شگفتہ پیرائے میں لکھے ہیں اور اِس شگفتگی کے پردے میں معاشرے کی برائیوں کی اصلاح کی ہے۔ اِس کے علاوہ ندیم نے کئی اخبارات و رسائل میں مختلف عنوانات کے تحت کالم لکھے۔

ندیم نے شاعروں اور ادیبوں پر تنقیدی مضامین بھی لکھے۔ اِن کے مجموعے ''ادب اور تعلیم کے رشتے''، ''تہذیب و فن''، ''اقبال۔ایک محاکمہ''، ''پس الفاظ'' اور ''معنی کی تلاش'' شامل ہیں۔ یہ تنقیدی مضامین ندیم کی

تنقیدی بصیرت کا مظہر ہیں۔ تنقید کے ساتھ ندیم نے دل چسپ شخصی و سوانحی خاکے بھی لکھے۔ اِن کے خاکوں کے دو مجموعے ''میرے ہم سفر'' اور ''میرے ہم قدم'' شائع ہوئے۔ ''میرے ہم قدم'' میں مختار صدیقی اور ریاض شاہد کے خاکوں میں ندیم اہم نقاد کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔

ندیم نے ''انگڑائیاں''، ''نقوشِ لطیف''، ''کیسر کیاری''، ''منٹو کے خطوط بنام ندیم''، ''پاکستان کی لوک کہانیاں'' اور ''نذر حمید اللہ خاں'' ترتیب و تدوین کی اور بچوں کا ادب ''آسمان کے گوشے میں'' (کھیل)، ''دوستوں کی کہانیاں''، ''نئی نویلی کہانیاں''، ''باغ کے گوشے میں'' تخلیق کیا۔

ندیم کی تخلیقی شخصیت متنوع رنگ تھی۔ ندیم اُردو ادب کے ایسے ادیب و شاعر ہیں جنھوں نے افسانہ نگاری اور شاعری دونوں اصنافِ ادب میں نئی سمتوں اور نئی منزلوں کی نشان دہی کی ہے۔ ندیم کے افسانوں کے ۱۸ مجموعے شائع ہوئے ہیں جو اِن کے ذہنی ارتقا اور تخلیقی لگن کو ظاہر کرتے ہیں۔ اُنھوں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا، اُس کی تصویر کھینچی۔ اِن کی شاعری کے ۱۲ مجموعے شائع ہوئے ہیں جن میں ندیم نے (ادب) شاعری کی بہت سی اصناف میں خامہ فرسائی کی ہے۔ ان میں قطعات و رباعیات، نظم و غزل، حمد و نعت اور دُعا و سلام شامل ہیں۔ ندیم وسیع مشاہدہ رکھتے تھے اور احساسات کے مالک تھے۔ اس لیے اِن کی شاعری میں سنجیدگی اور وقار ہے۔

ندیم نے شاعری، افسانہ نگاری، صحافت، کالم، خاکہ نگاری اور تنقید نگاری کے ساتھ ساتھ فلموں کے گیت اور مکالمے بھی لکھے۔ فلم ''لوری'' کے مکالمے لکھے جس پر انہیں بہترین مکالمہ نگار کا ''نگار'' ایوارڈ دیا گیا۔ فلم ''درندہ'' اور ''ہزار سال'' کے گیت لکھے جنھوں نے بڑی شہرت پائی۔

ندیم کی غزلوں میں کلاسیکیت اور خود کلامی کا رنگ گہرا ہے اور اِن کے کلام میں ایسی خود کلامی پائی جاتی ہے جس سے ان کی ذات کے دروازے آہستہ آہستہ وا ہوتے گئے۔ عشق، جو کہ ندیم کی شاعری کا اہم موضوع ہے لیکن اِن کا عشق رسمی اور سطحی نہیں بلکہ اِس کی بنیاد واقفیت اور حقیقت پر ہے۔ ندیم محبوب کے حیا، حسن، وعدے، انتظار کو بیان کرتے ہیں۔ اِن کی غزلوں پر رومانیت کا گہرا اثر ہے۔ اِس میں تخیل کی فراوانی اور خیال انگیزی ہے لیکن تخیل پرستی

اور خیال آرائی نہیں ہے۔ کیوں کہ اِن کی رومانیت کسی فرار کی پیداوار نہیں ہے بلکہ اِس کو تو احساس کی حقیقت نے پیدا کیا ہے۔ غزل میں ندیمؔ کی رومانیت کروٹیں بدلتی رہتی ہے۔ بدلتی کیفیات سے لے کر فلسفیانہ اور معشوقانہ انداز تک رومانیت ہی اِن کے طرزِ احساس کا خاصہ رہی ہے۔ لیکن جب ندیمؔ نے ذات کے حصار سے نکل کر معاشرے کی طرف رُخ کیا اور سماج کے ناآسودہ نظام کے خلاف جو رویہ دیکھا تو ندیمؔ معاشرتی رشتوں کی طرف نکل پڑتے ہیں اور ترقی پسند تحریک کے رجحانات کو فروغ دیتے ہیں اور ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جس سے اِن کی جدتِ فکر اور ندرت کا اظہار ہوتا ہے۔ ندیمؔ کی غزلیں انسانی عظمت اور رواداری کو فروغ دیتی ہیں۔ اِن کی غزل میں خیال اور جذبہ کی ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ اس لیے ان میں تاثیر کی کمی نہیں۔

ندیمؔ کی غزل کا بنیادی مقصد انسان دوستی، انسان کی عظمت کا احساس، انسان کو اُس کا کھویا ہوا وقار دلانا اور اِس کی عظمتِ گم گشتہ سے وابستہ کرنا تھا۔ انسان سے محبت کی وجہ سے ندیمؔ نے کبھی اِن کی بقا کے حوالے سے سمجھوتہ نہ کیا۔ ندیمؔ انسان کی تفریق جغرافیائی اور نسلی تفرقات سے نہیں کرتے بلکہ اُن کو انسانیت کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ اِس لیے ندیمؔ نے کھوکھلے سماجی نظام، سامراج کی جابرانہ پالیسیوں اور طبقاتی نظام کو ختم کرنے کے لیے کوششیں کیں اور تعصبات، ناانصافی، خودغرضی اور دیگر سماجی برائیوں سے پاک معاشرے کے قیام کے لیے کوشاں ہو گئے۔

انسان سے محبت کے اِسی جذبے کی وجہ سے ندیمؔ نے اپنی غزل میں اسے مخلوقات میں بلند تر رتبہ دیا۔ اِس بلند مخلوق کو جاگیرداروں کے چنگل سے نجات دلانے کی کوششیں کیں۔ جاگیردار، آدمیت کی تذلیل کرتے تھے اور انسانی حقوق کو پامال کرتے تھے۔ سیاسی و سماجی بدحالی اور مساوات و جمہوریت کی عدم موجودگی کی وجہ سے ندیمؔ اِس نظام کے خلاف سینہ سپر ہو گئے۔ سماج اور سیاست سے متعلق اِن کی غزل اِن کے تخلیقی شعور کی نشان دہی کرتی ہے۔ انسان، جو خدا کے ذہن کا فن پارہ ہے، اِس کی عظمت پر ناقابلِ شکست یقین ہی تھا جن کی وجہ سے اُنھوں نے ظلم وستم کے خلاف اپنی غزل میں علَم بغاوت بلند کیا۔ انسان کو اِس قدر عزت ومنزلت دی گئی ہے کہ وہ کائنات کا مرکزی نکتہ ہے اور اِسے فرشتے پر برتری حاصل ہے۔

ندیم کی غزل کا بنیادی نظریہ خیر اور نیکی کے فروغ کی خواہش ہے۔ اِس لیے ندیم ایسے انسانوں کی تلاش کرتے ہیں جو خیر کی قوتوں کو فروغ دیں اور شر کے خلاف آواز بلند کریں۔ خیر کی اس قوت کی وجہ سے انسان دوسرے انسانوں کو درپیش مسائل کو حل کرتا ہے۔ خیر کی قوت کی طلب اور شر کی قوت کو رفع کرنا، اِن کی غزل میں مکمل فنی رچاؤ کے ساتھ موجود ہے۔

ندیم کا یہ امتیاز ہے کہ وہ سائنسی ترقی اور ایجادات و انکشافات سے خوف زدہ نہیں بلکہ اِس عہد میں ہر نئے انکشاف کا خیر مقدم کرتے ہیں کہ انسان کے ظہور کا وقت آن پہنچا ہے اور کائنات میں ہونے والی ترقی کو انسان کے ذہن کا کرشمہ قرار دیتے ہیں۔ ندیم انسان کے جذبۂ تسخیر کائنات کو اہم گردانتے ہیں۔ سائنس کی ترقی کے ذریعے جہاں انسان سیاروں تک رسائی کی کوشش کر رہا ہے، وہاں نئی سے نئی کہکشائیں بھی دریافت ہو رہی ہیں لیکن ندیم انسان کی یک رُخی ترقی سے خطرہ بھی محسوس کرتے ہیں اور انسان کی ترقی کے منفی اور تخریبی عناصر کی نشان دہی کرتے ہیں کہ روحانی اور وجدانی فیضان سے محروم انسان جوہری دوڑ میں تو آگے بڑھتا جاتا ہے لیکن محبت اور حسن جیسی قدریں اس ترقی کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔

ندیم سچے اور کھرے محب وطن پاکستانی تھے۔ اِن کی ترقی پسندیت اُن کی حب الوطنی کی ہم نوا تھی۔ اُنھوں نے سچے پاکستانی شاعر کی طرح اپنے وطنِ عزیز پر خوشحالی کے سورج کو تابندہ دیکھنے کی خواہش کی اور اِس معاملے میں کبھی کسی سے سمجھوتہ نہ کیا۔ وطن سے محبت اِن کی غزل میں داخلی کیفیات سے آمیز ہو کر اشعار کی صورت میں ڈھلتی ہے۔ اِن کے اشعار سے وطن کا درد اِس طرح جھلکتا ہے جیسے کسی محبِ وطن کی آنکھوں میں وطن کی حالت زار دیکھ کر آنسو آ جائیں۔ اِس طرح ان کی غزل میں دردِ وطن اور حب وطن ایک قلبی رشتے کے ساتھ اُجاگر ہوتے ہیں۔ ندیم پاکستان میں جمہوریت کو عملی طور پر جلوہ گر دیکھنا چاہتے تھے۔ اِس لیے لیڈروں اور رہنماؤں کے رویوں اور ان کی نااہلی کو بڑے دُکھ اور کرب کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

ندیم زندگی کے تسلسل کا پاس بھی رکھتے ہیں۔ اِن کے نزدیک زندگی قیمتی تحفہ ہے۔ اِس لیے اِس کی قدر

کرنی چاہیے اور اِس کا معیار انصاف، ہمدردی، سچائی اور حوصلہ مندی جیسی اقدار پر ہونا چاہیے۔ ندیم کے نزدیک اگر زندگی بھرپور طریقے سے گزاری جائے اور اپنی ذمہ داریوں کو صحیح طریقے سے نبھایا جائے تو جو موت آئے گی وہ بھی انوکھی ہوگی اور اِس سے ایک اور زندگی میں اُتر جانے کا عمل شروع ہو جائے گا۔ ندیم حیات و ممات کو زندگی کے دو رُخ قرار دیتے ہیں۔

ندیم کی غزل کا اہم موضوع تصوف ہے لیکن اِن کے ہاں تصوف کا رنگ صوفی سے مختلف ہے۔ صوفی دنیا سے دل نہ لگانے کی نصیحت کرتے ہیں تاکہ جو زندگی اُنھیں ملی ہے اُس کو جلد از جلد مکمل کر کے اِس دنیا سے رخصت ہو جائیں۔ ندیم کو زندگی بہت پیاری ہے لیکن یہ محبت اُن کی اچھائی کو ظاہر کرتی ہے، نہ کہ ایسی محبت ہے جو کہ دنیادار کی ہوتی ہے۔

ندیم نے جو غزلیں لکھی ہیں اُن میں سنجیدگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ اُنھوں نے غزل کے لیے جو زبان استعمال کی ہے، اُس میں لہجے کی رعنائی بھی پائی جاتی ہے لیکن اِن کی غزل میں جو آواز سنائی دیتی ہے اُس میں نہ تو جوش حد سے تجاوز کرتا ہے اور نہ وہ ایسی اثرانگیز ہوتی ہے کہ لوری دینے لگے بلکہ اس میں ایسا انداز پایا جاتا ہے کہ جس سے سوچ اور احساس کی مثبت تحریک پیدا ہوتی ہے اور اِن کی یہی آواز اِن کی غزل کو اور نمایاں کرتی ہے۔

ندیم نے اپنی غزلوں میں بامعنی، سادہ اور انوکھے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اِن کی غزل کی آواز، مغلیہ عہد سے لے کر تقسیم برصغیر تک کی قدیم آواز سے بالکل مختلف ہے بلکہ اِس آواز کو بیسویں صدی کے نصف آخر کی نمائندہ آواز کہیں گے۔ غزل میں نئے نئے الفاظ کے ساتھ انوکھی تراکیب بھی استعمال کی ہیں۔ اِن کی غزل کا مطلع انوکھا اور معنی خیز ہے اور مقطع اِن کی فنی پختگی کا ثبوت ہے۔ اِن کا تخلص اِن کے مزاج اور لہجے کا تعین کرتا ہے۔ ندیم نے غزل میں متنوع پیرایہ میں بحروں کا استعمال کیا ہے۔ طویل بحر ہو یا مختصر، اس کو سلیقے سے برتا ہے اور اِن کی غزل میں قافیہ اور ردیف بحر کی روانی اور موسیقیت سے ہم آہنگ ہوتے ہیں اور یہ بحر کی فضا میں گھل مل کر فکری وحدت کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ندیم کا خاص کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے ایجاز و اختصار سے کام لیا ہے اور طویل مضامین کو

سادہ اور رواں انداز میں ایک شعر کے اندر سمیٹ لیا ہے۔ اِن کی غزلوں میں تشبیہ، استعارہ اور کنایہ کا خوب صورت استعمال ہوا ہے اور غزل میں علامت نگاری، رمزیت اور ایمائیت سے کام لیا گیا ہے۔ اِن کے ساتھ ساتھ ندیمؔ نے اپنی غزل میں امیجری سے بھی کام لیا ہے جس سے ابلاغ میں بھی وسعت ہوئی ہے اور شعر کے حسن اور نکھار میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ غزل اور تغزل لازم و ملزوم ہیں۔ ندیمؔ نے مختلف طرز کے تغزل کو اپنے اشعار کے ذریعے بیان کیا ہے۔

ندیمؔ نے نظم کو اِس کے تمام فنی تقاضوں کے ساتھ روشن کیا ہے جس سے اُردو شعر و سخن کی دنیا میں نئے باب کھلتے نظر آتے ہیں۔ اِن کے حساس دل و دماغ کی وجہ سے اِن کے اندازِ فکر اور لہجہ میں گہرائی پیدا ہوگئی ہے۔ اِن کی نظموں میں موضوعات کا بڑا تنوع نظر آتا ہے۔ ابتدائی نظموں پر رومان اور فطرت کا اثر گہرا ہے۔ ''جلال و جمال'' کی ابتدائی ۴۸ نظمیں اِن کی رومانیت کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ندیمؔ دیہات سے تعلق رکھنے کی وجہ سے دیہات کے رومان کو نمایاں کرتے ہیں۔ دیہات میں کم عرصہ زندگی بسر کی اور مستقل نہ رہ پانے کی وجہ سے گاؤں اور اُس کے نظارے اِن کے دل میں بستے تھے اور وہ ہر لحہ اس کو اپنے جلو میں لے کر چلتے رہے۔ اِن کی نظمیں ''گاؤں کی صبح''، ''میرا گاؤں''، ''مادرِ فطرت''، ''اَن دیکھا محبوب''، ''ساون''، ''مرغزار و جوئبار''، ''شہپارہ'' اور ''چرواہے'' میں مقامیت کا رنگ نمایاں ہے۔

ندیمؔ کی نظموں میں دیہات کے تہذیبی نظام کے سبھی پہلو اور مظاہر نظر آتے ہیں، جن میں رسومات، رہن سہن، لباس، خوراک، اجتماعی معاشرتی نظام، روزگار، جغرافیائی، قدرتی مظاہر اور رہائش کے طریقے وغیرہ کی صورت میں اِس تہذیب کے خارجی پہلوؤں کی تصویر ملتی ہے۔ وہاں عقائد، طرزِ فکر، توہمات، محسوسات اور ترجیحات وغیرہ کی شکل میں اِس تہذیب کے داخلی پہلوؤں سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔

ندیمؔ کی نظموں میں رومانیت، حسن کی تصویر کاری، جذبات کی پیش کش، محبت کی اہمیت، کئی پہلوؤں کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ اِس اندازِ نظر نے ندیمؔ کی عشقیہ شاعری میں ندرت پیدا کی اور وہ جذبۂ عشق کا سماجی اور

نفسی ہر دو کیفیات کے حوالے سے خالصتاً محسوساتی سطح پر تجزیہ کرتے ہیں۔ ''یاد کا چاند''، ''توحید''، ''بہار''، ''یہ ستارے''، ''لمحے اور صدیاں''، ''عشق کرو''، ''قریۂ محبت''، ''ماضی و حال'' جیسی نظمیں رومانیت کے جذباتی انداز یا زمانے کی تلخی کی بجائے جذبۂ عشق کا خالص فکری انداز میں تجزیہ پیش کرتی ہیں۔

فطرت اور دیہات سے لگاؤ ابتدائی نظموں میں بہت زیادہ ہے۔ بعد میں نقطہ نظر کی تبدیلی کی وجہ سے دیکھنے اور بیان کرنے کا انداز تبدیل ہو جاتا ہے۔ ندیم کو اب مقامی معاشرت میں طبقاتی تضاد، سماجی بگڑی ہوئی صورتِ حال دکھائی دیتی ہے۔ ندیم سماج کے ناآسودہ نظام کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں اور اِن کے مسائل پر آزادی کے ساتھ رائے دیتے ہیں۔ اپنی نظموں میں انسان دوستی، انسانیت اور محبت کا پیغام دیتے ہیں۔ ندیم فلسفیانہ رنگ و آہنگ اختیار نہیں کرتے بلکہ اِن خیالات کو جذبے میں سمو کر بیان کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود اِن کے خیالات و نظریات فکری گہرائی کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔

انسان، ندیم کی نظموں کا ہیرو ہے۔ جو زندگی کے کھیل میں شدید کرب سے دو چار ہے۔ ندیم نے اپنی نظم ''انسان عظیم ہے'' میں اپنے مخصوص شعریت سے بھرپور انداز میں اِس کا اظہار کیا ہے۔ ''نغمۂ انسان''، ''مجاز'' اور ''انسانیت'' میں اِن تضادات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے جنھوں نے انسان کو مظلومیت کی دلدل میں اُتار دیا ہے۔ ندیم انسان کے عدم مساوات کے خلاف مسلسل جنگ لڑتے ہیں۔ اِس تصور نے انہیں انسان دوست شاعر کا اعلیٰ منصب عطا کیا ہے۔ انسان اِن کے ہاں خیر و برکت کا نمائندہ ہے۔ ندیم نے اپنی شاہکار نظم ''پتھر'' کی صورت میں انسانیت کے عالم گیر اخلاقی و تہذیبی زوال پر آشوب قلم بند کیا ہے۔ انسان فطرت کا شاہکار اور معدنِ کائنات کا سب سے اَن مول ہیرا ہے۔ اِس کو اشرف المخلوقات اور خدا کا نائب تسلیم کیے بغیر اس کی ستائش ممکن نہیں۔ انسان کے اعلیٰ مقام و مرتبہ کے حوالے سے ندیم نے تفاخر اور سرخوشی کا اظہار کیا ہے۔ نظم ''مراجعت'' میں بھی خلائی تسخیر کے حوالے سے انسانی کامیابیوں پر فخر و انبساط کے تاثرات کو بیان کیا ہے۔

انسان جو خیر و شر کا امتزاج ہے اگر شر پر قابو پا لے تو معاشرہ میں امن قائم ہو سکتا ہے۔ اِس لیے

ندیم خیر کا نمائندہ انسانوں کو تلاش کرتا ہے۔ عدل و انصاف اور حسن و خیر آغاز ہی سے ندیم کے فن کی بنیادی قدریں ہیں لیکن سیاسی آزادی کی منزل قریب تر آ جانے کے احساس نے اِن کو عظمتِ انسان کا ممتاز مغنی بنا دیا۔ لیکن اِن کو یہ احساس کرب میں مبتلا کر دیتا ہے کہ انسان ایک دوسرے سے کدورت کا شدید جذبہ رکھنے لگا ہے۔ انسان اِس قدر جذباتی ہو گیا ہے کہ جنگ، ذرا سی بات پر بھی ہو جاتی ہے۔

ندیم جب خدا کے بندوں کو اقتدار کے ہاتھوں ذلت و رسوائی کی پستیوں میں بھٹکتا دیکھتے ہیں تو تڑپ اُٹھتے ہیں اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ وہی انسان ہے جو خدا کے ذہن کا عظیم فن پارہ ہے۔ دُکھی انسانیت کی حمایت میں آواز بلند کر کے نہ صرف ندیم انقلابی شعور کا اظہار کرتے ہیں بلکہ خدا کی عبادت کا حق بھی ادا کرتے ہیں۔

ندیم نے اپنی نظموں، جن میں "جدید انسان"، "صنفیت کا منشور"، "بیسویں صدی کا انسان" اور "بیسویں صدی کے نصف آخر کا انسان" شامل ہیں، اِن میں انسان کی تسخیر اور فطرت کے تباہ کن اثرات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ انسان حسن و محبت سے خالی ہے اور ترقی کی دوڑ میں آگے تو بڑھتا ہے لیکن اِس ترقی کی بھینٹ اِس کے اقدار چڑھ رہے ہیں۔

زندگی کی مسرتوں کا صحیح احساس اور اِس کی دل آویزیوں کا حددرجہ لحاظ، اِن کی نظموں کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ ندیم زندگی کی ناآسودگیوں اور پریشانیوں کا احساس رکھتے ہیں۔ زندگی سے والہانہ وابستگی اِن حقائق کا شعور رکھنے کے باوجود انہیں زندگی سے بے زار نہیں کرتی بلکہ ایسی صورتِ حال میں تو ندیم زندگی کے اور قریب ہو جاتے ہیں۔ ندیم جہاں شرفِ انسانیت اور نوعِ انسان کے نمائندہ ہیں وہاں اُنھوں نے مظلومیِ نسواں پر بھی آواز بلند کی ہے۔ جاگیردارانہ ماحول میں گاؤں کی عورت مشقت کرنے کے باوجود صلہ سے محروم ہوتی ہے۔ ایسی صورتِ حال جبر وظلم کے مروجہ نظام نے پیدا کر رکھی ہے۔ جب تک یہ نظام قائم رہے گا، حسن تاراج اور پامال ہوتا رہے گا۔

ندیم کی نظموں کی اہم جہت پاکستانیت ہے۔ اِن کے نزدیک پاکستان محض زمین کا ٹکڑا نہیں بلکہ یہ تو ان کے خوابوں کی علامت ہے۔ اِس کے ذریعے ندیم نہ صرف اپنے فکری و تہذیبی تشخص کی سلامتی چاہتا ہے بلکہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر حسن و محبت کے سپنوں کی تعبیر اور روشن امکانات کا ولولہ انگیز یقین رکھتا ہے۔ ندیم پر سوزِ وطن کا رنگ اِس قدر گہرا ہے کہ تمام تر رنگ اِسی ایک رنگ کے عکس معلوم ہوتے ہیں اور یہ رنگ اِن کی کچی، گہری اور رچی ہوئی پاکستانیت کا رنگ ہے۔ پاکستان سے اِس گہری اور والہانہ محبت کا اظہار اِن کی نظموں ''جشنِ چراغاں''، ''وطن کے لیے ایک دعا''، ''غمِ وطن'' میں ہوا ہے۔

۶ر ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہونے والی پاک بھارت جنگ کے حوالے سے ندیم نے ہنگامی نوعیت کی شاعری میں اعلیٰ ادبی قدر و قیمت کی حامل نظمیں لکھیں۔ اِس کا دردمندانہ اظہار ''چھ ستمبر'' میں ہوا ہے۔ سوزِ وطن کا رنگ ستمبر ۱۹۶۵ء سے مسلسل گہرا ہوتا گیا اور ۱۹۷۱ء میں سقوطِ ڈھاکہ کے وقت یہ احساس کرب میں تبدیل ہوگیا۔ اِس کرب کی بہترین عکاسی نظم ''میں روتا ہوں'' میں کی گئی ہے۔ اِس المیہ اور کرب کا احساس ''تسلی''، ''ایک ہی رنگ ہے''، ''سقوط کے بعد''، ''اور باقی ہے''، ''دوستو آؤ''، ''اگر ہے جذبۂ تعمیر زندہ''، ''کھنڈر'' اور ''صفر'' جیسی نظموں میں نظر آتا ہے۔

کشمیر ایک ایسا مسئلہ ہے جو مدتوں سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان وجہ تنازع ہے۔ قائداعظم نے کشمیر کو پاکستان کی شہ رگ کہا ہے۔ اِس کی معنوی گہرائی تک پہنچنے کے لیے ندیم نے جس جس طرح تحریکِ آزادیٔ کشمیر کو اپنے فن کا موضوع بنایا ہے، اقوامِ متحدہ کے کردار کو بے نقاب کیا اور پاکستانی مؤقف کو اُبھارا ہے۔ اِس سے ان کی بے مثال پاکستانیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

آزادی کے بعد ندیم کی تخلیقی زندگی میں پابندیٔ اظہار ایک بڑا چیلنج رہا، لیکن اُنھوں نے حکمرانوں سے ڈرنے کی بجائے اِن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی۔ ندیم کو اِس آزادیٔ رائے پر رنج ہوا لیکن اِن کی آزادیٔ رائے کو نہ روکا جا سکا۔ آمر طاقتوں کی طرف سے اظہار و بیان پر پابندیاں لگانے سے عوام میں جو زہر اور نفرت پھیلتی ہے، اِس کا اظہار ندیم نے اپنی کئی نظموں میں کیا ہے جن میں ''ایک بیل سے''، ''جی چاہتا ہے کہ مسکراؤں'' اور

''ایک فرد۔ایک تاریخ'' شامل ہیں۔ ندیم نے جمہوریت کے نظام کو بھی طنز کا نشانہ بنایا اور صاف گوئی اور بے باکی کا اظہار اپنی نظموں ''پابندی''، ''ہم'' اور ''صبح آگہی'' میں کیا۔ ندیم کی نظموں میں خوب صورت تشبیہات، استعارات، تراکیب اور علامات استعمال ہوئی ہیں۔ اِن کی نظموں میں اس کا استعمال فطری ہے۔

ندیم باکمال اور بلند پایہ شاعر ہیں۔ اُنھوں نے شاعری کی کئی اصناف میں لکھا۔ نظم اور غزل کے ساتھ ندیم نے قطعات بھی لکھے۔ اِن کے قطعات میں فنی خصوصیات اور شاعرانہ لوازم موجود ہیں۔ جو اِن کو دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتے ہیں۔ اُنھوں نے قطعہ کی صنف میں اِن تمام موضوعات کو بیان کیا جو اب تک صرف نظم، غزل اور مثنوی کے لیے موزوں سمجھے جاتے تھے۔ ندیم نے حسن و عشق، حیات و کائنات اور عصری مسائل کو اپنے بھرپور اور مخصوص انداز میں قطعات میں سمو دیا ہے اور اسے دوسری اصنافِ سخن کے دوش بدوش لا کھڑا کیا ہے۔

ندیم کے قطعات کا اہم موضوع رومانیت ہے۔ اِن میں حسن کی رعنائیاں اور رومان کی پرچھائیاں جابجا نظر آتی ہیں۔ اِن میں شاعر کی محبوبہ نم ناک آنکھوں اور مسکراتے ہونٹوں کے ساتھ اپنے محبوب کا انتظار کرتی ہے اور اِس کے ہاتھوں کی مہندی اور لبوں کی سرخی، شاعر کے خانۂ دل میں جگمگ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ''رم جھم'' کے قطعات میں ندیم کی شخصیت اور اِن کی محبت شہر و دیہات میں تقسیم ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ صبوحی اور بنتِ حوا ندیم کے احساس وشعور کے دریچے وا کر جاتے ہیں اور یوں ''دشتِ وفا'' تک پہنچتے پہنچتے ندیم کا نظریۂ عشق پیکر محبوب کے آفاقی تصور میں ڈھل جاتا ہے جس میں ماضی و حال کے جگنو ایک روشن مستقبل کی بنیاد بن جاتے ہیں۔

ندیم نے اپنے قطعات میں پنجاب کی دیہاتی ثقافت اور اِس سے اخذ کی گئی روایات اور علامات کو استعمال کیا ہے۔ کوئل، گڈریا، چرواہا، کسان، درانتی اور چوپال جیسی علامات اِن کی شاعری میں اُبھر کر مقامی رنگ آمیز کرتی ہیں۔ ندیم تراکیب، تشبیہات و استعارات اور اِن کے برجستہ استعمال میں محتاط ہیں۔ اِن کی سادگی کی طرف ملاح، کھنڈر، پنگھٹ، گاگریں، نیم، ساون، ندی، بوندیں، بھیڑیں، مرغ، مرغیاں، دریا کا کنارہ، یہ تراکیب اشارہ

کرتی ہیں۔

ندیم کو طبقاتی تضاد کا شدید احساس ہے۔ اِن کے قطعات میں کسانوں اور مزدوروں کے دلوں میں بغاوت کی جو چنگاریاں جنم لیتی ہیں۔ زمین دار اپنی عیش و عشرت کی وجہ سے اُن کا استحصال کرتے ہیں، اِن سب کو موضوع بنایا ہے۔ ندیم صرف بلندی اور پستی کا شکوہ خدا سے کر کے خاموش نہیں ہو جاتے بلکہ وہ زمین داروں کی اِس عیاشی اور استحصال کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند کرتے ہیں۔ ندیم ملک میں بڑھتی ہوئی سرمایہ داری کو بھی موضوع بناتے ہیں۔ کسان جب روزگار کی تلاش میں دیہاتوں کو چھوڑ کر شہروں کا رُخ کرتے ہیں تو سرمایہ دار اُن کا استحصال کرتا ہے۔ اُن کی محنت نچوڑ کر نئے نئے محل تعمیر کرتا ہے۔ انسان، جس کو فرشتوں نے سجدہ کیا اور جو خدا کا محبوب اور نائب ہے، اُس پر جاگیردار، جو کہ دیہات کا خدا بنا ہوا ہے، اُن کی محنت کو خریدتا ہے۔

نظامِ آزادی اور جمہوریت کے کھوٹے سکوں کو بھی ندیم کی تیز نگاہ خوب جانتی ہے۔ ندیم اُس آزادی کا خواہاں ہے جس سے یہ طبقاتی تضاد اور سامراج کی غلامی ختم ہو سکے۔ کسان اپنی محنت کا پھل خود اُٹھا سکے۔

ندیم نے فطرت کی گود میں پرورش پائی۔ اس لیے اسے اِس سے لگاؤ ہے اور وہ وادیوں اور پگڈنڈیوں پر نظر دوڑاتا ہے تو اِس کی رومان پسند طبیعت میں تڑپ پیدا ہو جاتی ہے۔ شاعرانہ تخلیق کے ایسے لمحات میں اُس کا پرسکون مزاج ایک ندی کی طرح بہاؤ اختیار کر لیتا ہے اور وہ دنیا سے بے خبر ہو کر فطرت کی آغوش میں گم ہو جاتا ہے۔

ندیم نے قطعات کی کہانیاں عوامی زندگی سے چُنی ہیں۔ اُن میں ڈرامے کے اجزا شامل کر کے اُسے ایک مصورانہ شکل دی ہے۔ مکالمہ، کش مکش، ارتقا، نقطۂ عروج اور اختتام ڈرامے کے وہ لوازمات ہیں جنھوں نے ندیم کے قطعات میں ندرت اور جدت پیدا کر دی ہے اور اِن تصویروں میں ندیم کا احساسِ جمال، مصورانہ نگاہ اور حقیقت پسند قلم، نقش نگار بنا کر اُن کے نین نقش سنوارتا اور اُبھارتا ہے۔

شاعر اپنے تجربات کو زبان و بیان اور الفاظ و اوزان کے تانے بانے میں علامات، تلمیحات، تشبیہات اور استعارات کو استعمال کر کے اِس طرح سمو دیتا ہے کہ اِن مرکبات کو علیحدہ کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اِن کے قطعات میں الفاظ ونقوش، تشبیہات و استعارات اور علامات وتمثیلات کے ذریعے سے ارضیت کے ساتھ وابستہ نظر آتا ہے۔ اُس کے قطعے کا ہر مصرع اکائی کی صورت میں دوسرے مصرع کا سہارا لے کر تیسرے اور چوتھے مصرع سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔

ندیم گہرا مذہبی احساس رکھنے کے باوجود مذہب کے نام پر اختیار کیے جانے والے دھوکے اور فریب کو بہتر سمجھتے ہیں اور اُس کی مذمت کرتے ہیں۔

جنگِ عظیم اوّل اور اِس کے دُور رس اثرات کو ندیم نے اپنے قطعات کا موضوع بنایا ہے۔ جنگ کو ندیم انسان کا بدترین دشمن تصور کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آئندہ کرۂ ارض پر کوئی جنگ نہ ہو۔

ندیم کی رباعی میں انفرادی سطح پر رومان ومحبت کی داستانیں اپنا آہنگ بدل کر قومیت، بین الاقوامیت اور انسانیت سے محبت کو اپنے فن کی معراج بنا لیتی ہیں۔ ندیم نے رباعی میں پیکر تراشی کے ذریعے طبقاتی تضاد اور معاشی فرق کو اِس انداز سے اُجاگر کیا ہے کہ شاعر کی شاعرانہ مہارت سے ایک طبقے کے ساتھ ہمدردی اور دوسرے کے ساتھ نفرت کے احساسات و جذبات بیدار ہو جاتے ہیں۔

ندیم کیوں کہ روحِ عصر کا نمائندہ ہے، اُن کی رباعی میں بھی مسائلِ حیات نئے نئے انداز سے اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ زندگی کے اِن مسائل کی حد، مروجہ غلط نظامِ اقدار، کھوکھلی تعمیر، معاشی تفاوت، مصنوعی تمدن اور پُرفریب رہنمائی سے لے کر وطن پرستی، سامراج دشمن، کسان مزدور انقلاب، جمہوریت پسندی اور بین الاقوامیت تک پھیلی ہوئی ہے۔

ندیم ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے باوجود خدا سے محبت وعشق کرتے تھے جس کا اظہار اُنھوں نے حمد لکھ کر کیا۔ ندیم خدا کے جلال و جمال اور علیم وخبیر جیسی صفات کے بڑے قدردان تھے۔

ترقی پسند تحریک میں فعال کردار ادا کرنے کی وجہ سے ان پر مذہب بے زاری کے الزامات بھی لگے لیکن ندیم خدا اور رسولؐ پر ایمان رکھتے تھے۔ اِن کی نعت گوئی اِن کی عمیق مذہبیت کا سراغ دیتی ہے۔ اِن کو اپنی

اخلاقی اور تہذیبی قدروں سے گہرا لگاؤ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ندیم نے ایسی خوب صورت اور روح پرور نعتیں تخلیق کیں جو قلوب و اذہان کو ایک نئے انداز کی تازگی اور سرمستی عطا کرتی ہیں۔

ندیم نے حمد، نعت کے ساتھ سلام بھی لکھا۔ اُنھوں نے شہیدانِ کربلا اور خصوصاً امام حسینؓ کی جناب میں عقیدت مندانہ سلام و نیاز کا تحفہ بھیجا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ احمد ندیم قاسمی کی شخصیت ایسے پھول کی سی ہے جس کی خوش بُو چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے اور اُردو ادب کو معطر کرتی ہے۔ اِن کے کلام میں جو ٹھہراؤ، افکار کی شائستگی اور الفاظ و بیان کی جو خوب صورتی ہے، وہ انہیں آج بھی دیگر شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔ اِس لیے ندیم ایک علمی و ادبی وقار کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

کتابیات

ندیمؔ کی کتب

نمبر شمار	مصنف کا نام	کتاب کا نام	پبلشرز اور سنہ اشاعت
۱۔	احمد ندیمؔ قاسمی	’’آبلے‘‘	لاہور، ادارہ فروغِ اُردو، ۱۹۴۶ء
۲۔	ایضاً	’’آس پاس‘‘	لاہور، مکتبہ فسانہ خواں، ۱۹۴۸ء
۳۔	ایضاً	’’آسمان کے گوشے میں‘‘	لاہور، ادارہ فروغِ اُردو، ۱۹۴۳ء
۴۔	ایضاً	’’آنچل‘‘	لاہور، مکتبہ فروغِ اُردو، ۱۹۴۵ء
۵۔	ایضاً	’’احمد ندیمؔ قاسمی کے افسانے‘‘ (جلد اوّل اور جلد دوم)	لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء
۶۔	ایضاً	’’ادب اور تعلیم کے رشتے‘‘	لاہور، اساطیر، ۱۹۷۴ء
۷۔	ایضاً	’’ارض و سما‘‘	لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء
۸۔	ایضاً	’’اقبال۔۔۔ایک محاکمہ‘‘	لاہور، ادارہ فروغِ اُردو، ۱۹۷۷ء
۹۔	ایضاً	’’انگڑائیاں‘‘	لاہور، ادارہ فروغِ اُردو، ۱۹۴۴ء
۱۰۔	ایضاً	’’انوارِ جمال‘‘	لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء
۱۱۔	ایضاً	’’بازارِ حیات‘‘	لاہور، ادارہ فروغِ اُردو، ۱۹۵۵ء
۱۲۔	ایضاً	’’باغ کے گوشے میں‘‘	لاہور، ادارہ فروغِ اُردو، ۱۹۴۴ء
۱۳۔	ایضاً	’’برگِ حنا‘‘	لاہور، ناشرین، ۱۹۵۹ء
۱۴۔	ایضاً	’’بسیط‘‘	لاہور، اساطیر، ۱۹۹۵ء
۱۵۔	ایضاً	’’بگولے‘‘	لاہور، مکتبہ اُردو، ۱۹۴۱ء
۱۶۔	ایضاً	’’پاکستان کی لوک کہانیاں‘‘	لاہور، اساطیر، ۱۹۷۲ء

۱۷۔ ایضاً ''پت جھڑ'' لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء

۱۸۔ ایضاً ''پسِ الفاظ'' لاہور، اساطیر، ۲۰۰۳ء

۱۹۔ ایضاً ''تہذیب وفن'' لاہور، پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، ۱۹۷۵ء

۲۰۔ ایضاً ''جلال و جمال'' لاہور، اساطیر، ۱۹۴۶ء

۲۱۔ ایضاً ''جمال'' لاہور، بیاض، ۱۹۹۲ء

۲۲۔ ایضاً ''چوپال'' لاہور، دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۳۹ء

۲۳۔ ایضاً ''در و دیوار'' لاہور، مکتبہ اُردو، ۱۹۴۹ء

۲۴۔ ایضاً ''دشتِ وفا'' لاہور، اساطیر، ۱۹۶۳ء

۲۵۔ ایضاً ''دوام'' لاہور، مکتبہ اساطیر، ۴۵۔اے، مزنگ روڈ، ۱۹۷۹ء

۲۶۔ ایضاً ''دوستوں کی کہانیاں'' لاہور، دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۴۳ء

۲۷۔ ایضاً ''دھڑکنیں'' لاہور، اُردو اکیڈمی، ۱۹۴۲ء

۲۸۔ ایضاً ''رم جھم'' لاہور، اساطیر، میاں چیمبرز، ۳۔ٹیمپل روڈ، ۱۹۴۴ء

۲۹۔ ایضاً ''سناٹا'' لاہور، نیا ادارہ، ۱۹۵۲ء

۳۰۔ ایضاً ''سیلاب'' حیدرآباد (دکن)، ادارہ اشاعت اُردو، ۱۹۴۴ء

۳۱۔ ایضاً ''سیلاب و گرداب'' لاہور، اساطیر، ۱۹۶۱ء

۳۲۔ ایضاً ''شعلۂ گل'' لاہور، اساطیر، میاں چیمبرز، ۳۔ٹیمپل روڈ، ۱۹۵۳ء

۳۳۔ ایضاً ''طلوع و غروب'' لاہور، نیا ادارہ، ۱۹۴۲ء

۳۴۔ ایضاً ''کپاس کا پھول'' لاہور، مکتبہ فنون، ۱۹۷۳ء

۳۵۔ ایضاً ''کوہ پیما'' لاہور، اساطیر، ۱۹۹۵ء

۳۶۔ ایضاً ''کیسر کیاری'' لاہور، شفیق پبلی کیشنز، ۱۹۴۴ء
(منتخب طبع زاد اور ماخوذ تحریروں کا مجموعہ)

۳۷۔ ایضاً ''کیسر کیاری''(ندیمؔ کے فکاہی کالم) لاہور، شفیق پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء

۳۸۔ ایضاً ''گرداب'' حیدرآباد (دکن)، ادارہ اشاعت اُردو، ۱۹۴۳ء

۳۹۔ ایضاً ''گھر سے گھر تک'' راول پنڈی، راول کتاب گھر، ۱۹۶۳ء

۴۰۔ ایضاً ''لوحِ خاک'' لاہور، مکتبہ اساطیر، فروری ۱۹۸۸ء

۴۱۔ ایضاً ''محیط'' لاہور، التحریر، ۱۹۷۶ء

۴۲۔ ایضاً ''معنی کی تلاش'' لاہور، اساطیر، ۲۰۰۴ء

۴۳۔ ایضاً ''منٹو کے خطوط بنام ندیمؔ'' لاہور، اساطیر، ۲۰۰۴ء

۴۴۔ ایضاً ''میرے ہم سفر'' لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء

۴۵۔ ایضاً ''میرے ہم قدم'' لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء

۴۶۔ ایضاً ''ندیمؔ کی غزلیں'' لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء

۴۷۔ ایضاً ''ندیمؔ کی نظمیں'' لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء

۴۸۔ ایضاً ''ندیمؔ کے افسانے'' (خود منتخب کردہ افسانے) لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء

۴۹۔ ایضاً ''نذر حمید اللہ خان''(مرتب) لاہور، التحریر، ۱۹۷۷ء

۵۰۔ ایضاً ''نقوشِ لطیف'' لاہور، اساطیر، ۱۹۴۴ء

۵۱۔ ایضاً ''نیلا پتھر'' لاہور، غالب پبلشرز، ۱۹۸۰ء

۵۲۔ ایضاً ''نئی نویلی کہانیاں'' لاہور، اساطیر، ۱۹۴۴ء

استفسارات/ مکاتیب

	بنام	از	بہ مقام
۵۳۔	راقم الحروف	''حیات قاسمی''	لاہور، غالب کالونی، ندیم شہید روڈ، سمن آباد، مورخہ: ۱۵/ جولائی ۲۰۱۰ء
۵۴۔	ایضاً	''شاہین نعمان''	لاہور، ۲۱۔ غالب کالونی، ندیم شہید روڈ، سمن آباد، مورخہ: ۳/ جون ۲۰۱۰ء
۵۵۔	ایضاً	''شاہین نعمان''	لاہور، سمن آباد، محررہ: ۱۵/ اگست ۲۰۱۰ء
۵۶۔	ایضاً	''منصورہ احمد''	لاہور، جوہر ٹاؤن، مورخہ: ۱۰/ اگست ۲۰۱۰ء
۵۷۔	ایضاً	''ناہید قاسمی''	لاہور، ۲۱۔ غالب کالونی، ندیم شہید روڈ، سمن آباد، مورخہ: ۱۵/ جولائی ۲۰۱۰ء
۵۸۔	ایضاً	''نعمان قاسمی''	لاہور، ۲۱۔ غالب کالونی، ندیم شہید روڈ، سمن آباد، مورخہ: ۳/ جون ۲۰۱۰ء
۵۹۔	ایضاً	''نعمان قاسمی''	لاہور، از سمن آباد، محررہ: ۱۵/ اگست ۲۰۱۰ء
۶۰۔	ایضاً	''نفیسہ قاسمی''	لاہور، ۲۱۔ غالب کالونی، ندیم شہید روڈ، سمن آباد، مورخہ: ۵/ اگست ۲۰۱۰ء
۶۱۔	ایضاً	''نیر حیات قاسمی''	لاہور، ۲۱۔ غالب کالونی، ندیم شہید روڈ، سمن آباد، مورخہ: ۵/ اگست ۲۰۱۰ء

انگریزی کتب

S.No.	Authour Name	Book Name	Publisher
62-	Aristotle,	"Political thought from Plato to the Present"	New York, San Francisco, Toranto, London.
63-	Coppola, Carlo (ed),	"Marxist Influences and South Asian Literature"	Delhi, Chanakiya Publications, 1988.
64-	David Lodge (ed),	"20th Century Literary Criticism"	London, Longman, 1985.
65-	Karl Marx, F. Engels,	"Collected Work" (Vol 20)	Masco, State Political Literature Publishing House, 1956.
66-	Kathleen Raine,	"What is Man"	IPSWICH, Golgonooza Press, 1979.
67-	P.T.Raju, Radha Krishman (ed),	"The Concept of man"	London, Ruskin House, 2nd Edition, 1966.

اُردو کتب

نمبر شمار	مصنف کا نام	کتاب کا نام	پبلشرز اور سنہ اشاعت
۶۸۔	ابوالاسعید نورالدین، ڈاکٹر	''تاریخ ادبیاتِ اُردو''	لاہور، مغربی پاکستان، اُردو اکیڈمی، ۱۹۹۷ء
۶۹۔	ابوالاعجاز حفیظ صدیقی	''کشاف تنقیدی اصطلاحات''	اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ستمبر ۱۹۸۵ء
۷۰۔	ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا	''تفہیم القرآن'' (جلد چہارم)	لاہور، مکتبہ تعمیر انسانیت، ۱۹۷۲ء
۷۱۔	احمد دہلوی، سیّد	''فرہنگِ آصفیہ''	لاہور، مکتبہ حسن لمیٹڈ، س۔ن
۷۲۔	احمد غزالی	''وادیٔ سون سکیسر''	لاہور، فیروز سنز لمیٹڈ، ۱۹۹۳ء
۷۳۔	اختر حسین رائے پوری	''ادب اور زندگی''	مطبوعہ اُردو، اپریل ۱۹۳۵ء
۷۴۔	ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر	''اُردو غزل کا تکنیکی، ہیئتی اور عروضی سفر''	لاہور، ۲۰۔کلب روڈ، باراول، اگست ۲۰۰۸ء
۷۵۔	اسلم فرخی، ڈاکٹر	''(نیا) ندیم نامہ''	کراچی، وفاقی اُردو یونی ورسٹی، ۲۰۰۶ء
۷۶۔	اسلم لودھی، محمد	''قومی ہیرے''	لاہور، طاہر سنز، پبلشرز، اُردو بازار، اگست ۲۰۰۷ء
۷۷۔	اعجاز حسین، ڈاکٹر	''مذہب و شاعری''	اُردو اکیڈمی، س۔ن
۷۸۔	الطاف حسین حالی	''مقدمہ شعر و شاعری''	لاہور، شیخ مبارک علی تاجران کتب، ۱۹۲۹ء
۷۹۔	امیر حسین چمن	''ملاقات و حکایات''	اسلام آباد، پرنٹ میڈیا پبلشرز، ۲۰۰۱ء
۸۰۔	انور صابر، ڈاکٹر	''پاکستان میں اُردو غزل کا ارتقاء''	لاہور، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، ۲۰۰۲ء
۸۱۔	انیس ناگی	''تنقیدِ شعر''	لاہور، میری لائبریری، ۱۹۶۸ء
۸۲۔	ایضاً	''مشاہدات''	لاہور، مکتبہ جمالیات، ۱۹۹۳ء
۸۳۔	بخاری، ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل	''الجامع الصحیح'' (جلد ۱)	عثمانیہ مصری، ۱۹۳۲ء

۸۴۔ بزمی انصاری "امیر العروض" لاہور، مطبع، ۱۹۳۹ء

۸۵۔ تحسین فراقی، ڈاکٹر "افادات" (شعری مطالعات) لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء

۸۶۔ ترمذی، امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ "جامع ترمذی" (جلد۲) لکھنؤ، مطبوعہ اصح المطابع، ۱۳۱۶ھ

۸۷۔ جمیل ملک "ندیم کی شاعری" راول پنڈی، نوید پبلشرز، این/۲۲۲/ پراچہ سٹریٹ، ۱۹۷۲ء

۸۸۔ جیلانی کامران "ہمارا ادبی اور فکری سفر" لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، طبع اوّل، ۱۹۸۷ء

۸۹۔ حسن رضوی "گفت و شنید" لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء

۹۰۔ حسن، محمد، ڈاکٹر "اُردو ادب میں رومانوی تحریک" ملتان، کاروانِ ادب، ۱۹۹۳ء

۹۱۔ حمید اختر "کال کوٹھڑی" لاہور، طبع سوم، اکتوبر ۱۹۸۸ء

۹۲۔ خورشید ربانی (مرتبہ) "آدھی ملاقات" اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء

۹۳۔ رضادانی جواد، سیّد محمد "علم بدیع درزبان فارسی" چاپ تہران، س۔ن

۹۴۔ رفیع الدین اشفاق، سیّد، ڈاکٹر "اُردو میں نعتیہ شاعری" کراچی، اُردو اکیڈمی، سندھ، اکتوبر ۱۹۷۶ء

۹۵۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر "اصناف ادب" لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء

۹۶۔ سجاد ظہیر "ترقی پسند ادب کی تحریک کا منشور" لکھنؤ، اپریل ۱۹۳۶ء

۹۷۔ ایضاً "مضامینِ سجاد" لکھنؤ، اُتر پردیش، اُردو اکیڈمی، ۱۹۷۹ء

۹۸۔ سردار جعفری "ترقی پسند ادب" (جلد اوّل) علی گڑھ، انجمن ترقی اُردو، ہند، ۱۹۵۱ء

۹۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر "اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، چھبیسواں ایڈیشن، ۲۰۰۴ء

۱۰۰۔ سنبل نگار، ڈاکٹر "اُردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ" لاہور، مجلس ترقی ادب، س۔ن

۱۰۱۔ سی۔اے قادر "اخلاقیات" لاہور، مجلس ترقی ادب، طبع چہارم، دسمبر ۱۹۸۰ء

۱۰۲۔ شبانہ محمود (مرتبہ) "انگارے۔ایک جائزہ" کتابیات، ۱۹۸۸ء

۱۰۳۔ شبلی نعمانی "شعر العجم" (حصہ پنجم) لاہور، تاج بک ڈپو، ۱۳۲۵ھ

۱۰۴۔ شفقت رضوی، پروفیسر ''اُردو میں نعت گوئی'' کراچی، جہانِ حمد پبلی کیشنز، ۲۶/۳۸ بی ون ایریا، ۲۰۰۲ء

۱۰۵۔ شکیل الرحمٰن، ڈاکٹر ''احمد ندیم قاسمی ۔ ایک لیجنڈ'' لاہور، اساطیر، ۲۰۰۳ء

۱۰۶۔ ضیاء ساجد (مرتبہ) ''مٹی کا سمندر'' لاہور، مکتبہ القریش، بار اوّل، ۱۹۹۱ء

۱۰۷۔ طارق سعید ''اسلوب اور اسلوبیات'' لاہور، نگارشات، میاں چیمبرز، ۳۔ ٹیمپل روڈ، ۱۹۹۸ء

۱۰۸۔ طفیل، محمد ''صاحب'' لاہور، ادارہ فروغ اُردو، بار دوم، ۱۹۶۴ء

۱۰۹۔ طفیل محمد، بشیر موجد (مرتب) ''ندیم نامہ'' ملتان، مجلسِ اربابِ فن، ۱۹۷۶ء

۱۱۰۔ عابد رضا بیدار ''جدید اُردو غزل'' (۱۹۴۰ء سے ۱۹۸۵ء تک) دہلی، مطبوعہ کتاب نما، اپریل ۱۹۸۷ء

۱۱۱۔ عابد علی عابد، سیّد ''اسلوب'' لاہور، مجلسِ ترقی ادب، طبع دوم، جون ۱۹۹۶ء

۱۱۲۔ ایضاً ''البدیع'' لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء

۱۱۳۔ ایضاً ''البیان'' لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء

۱۱۴۔ عاشق حسین بٹالوی ''ہماری قومی جدوجہد'' لاہور، آئینہ ادب، س۔ن

۱۱۵۔ عالم خان، محمد، ڈاکٹر ''اُردو افسانے میں رومانی رجحانات'' لاہور، علم و عرفان پبلشرز، س۔ن

۱۱۶۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر ''غزل اور مطالعہ غزل'' کراچی، انجمن ترقی اردو، س۔ن

۱۱۷۔ عبدالرحمٰن، ہاشمی، قاضی ''شعریاتِ اقبال'' لاہور، سفینہ ادب، ۱۹۸۶ء

۱۱۸۔ عبدالکریم خالد ''نئے پرانے مضامین'' لاہور، اظہار سنز، ۱۹۔ اُردو بازار، ۱۹۹۸ء

۱۱۹۔ عبداللہ، سیّد، ڈاکٹر ''ادب و فن'' لاہور، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء

۱۲۰۔ ایضاً ''وَلی سے اقبالؔ تک'' لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء

۱۲۱۔ عزیز حامد مدنی ''جدید اُردو شاعری'' (حصہ دوم) لاہور، انجمن ترقی اُردو، طبع اوّل ۱۹۹۴ء

۱۲۲۔ عطاالحق قاسمی ''مزید گنجے فرشتے'' لاہور، چوک گڑھی شاہو، جولائی ۱۹۹۷ء

۱۲۳۔ عظیم ملک، محمد ''رہ وادی خیال'' لاہور، مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۶۹ء

۱۲۴۔ علامہ اقبال، محمد، ڈاکٹر — ''کلیاتِ اقبال'' — لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، پبلشرز، ۲۰۰۴ء

۱۲۵۔ علی صدیق، محمد — ''توازن'' — کراچی، ادارۂ عصرِ نو، اکتوبر ۱۹۷۶ء

۱۲۶۔ علی ناصر زیدی — ''ہماری کائنات'' — کراچی، ہمدرد بیت الحکمت، ۱۹۹۳ء

۱۲۷۔ فتح محمد ملک، پروفیسر — ''تعصبات'' — لاہور، مکتبہ فنون، طبع اوّل، جون ۱۹۷۳ء

۱۲۸۔ ایضاً — ''احمد ندیم قاسمی، شاعر اور افسانہ نگار'' — لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء

۱۲۹۔ فراق گورکھ پوری — ''حاشیے'' — الٰہ آباد، سنگم پبلشنگ ہاؤس، س۔ن

۱۳۰۔ فرزانہ سیّد — ''نقوشِ ادب'' — لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء

۱۳۱۔ فرمان فتح پوری — ''اُردو شاعری کا فنی ارتقاء'' — لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۵۰۔لوئر مال، ۱۹۹۷ء

۱۳۲۔ ایضاً — ''اُردو کی نعتیہ شاعری'' — کراچی، حلقہ نیاز و نگار، طبع دوم، ۱۹۹۸ء

۱۳۳۔ ایضاً — ''اُردو رُباعی'' (فنی و تاریخی ارتقاء) — لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء

۱۳۴۔ فیض احمد فیض — ''میزان'' — لاہور، ناشرین، ۱۹۶۲ء

۱۳۵۔ ایضاً — ''نقش فریادی'' — لاہور، مکتبہ کارواں، س۔ن

۱۳۶۔ ایضاً — ''زنداں نامہ'' — لاہور، مکتبہ کارواں، س۔ن

۱۳۷۔ ایضاً — ''دست تہ سنگ'' — لاہور، مکتبہ کارواں، س۔ن

۱۳۸۔ قدرت اللہ شہاب — ''شہاب نامہ'' — لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء

۱۳۹۔ قمر رئیس (مرتبہ) — ''ترقی پسند ادب'' — دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۹ء

۱۴۰۔ کامران، محمد، ڈاکٹر — ''انگارے'' (تحقیق و تنقید) — لاہور، ماورا، بار اوّل، ۲۰۰۵ء

۱۴۱۔ کامل قریشی، ڈاکٹر (مرتبہ) — ''اردو غزل'' (ہندو پاک غزل سیمینار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ) — دہلی، اُردو اکادمی، مارچ ۱۹۸۷ء

۱۴۲۔ مبین مرزا (انتخاب و ترتیب) — ''اُردو کے بہترین شخصی خاکے'' (جلد دوم) — اسلام آباد، الحمرا پبلشنگ، بار اوّل، اکتوبر ۲۰۰۲ء

۱۴۳۔ مجتبیٰ حسین — ''نیم رُخ'' — لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۶ء

نمبر	مصنف	کتاب	ناشر
۱۴۴۔	مجید امجد	''کلیاتِ مجید امجد''	لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ستمبر ۲۰۰۳ء
۱۴۵۔	مسرت حسن، ڈاکٹر	''قدیم انسان''	لاہور، پولیمر پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء
۱۴۶۔	مسلم، امام بن الحجاج قشیری نیشاپوری	''الجامع الصحیح''	مطبوعہ عثمانیہ مصری، س۔ن
۱۴۷۔	مظفر وارثی	''گئے دنوں کا سراغ''	لاہور، خزینۂ علم وادب پبلشرز، ۲۰۰۰ء
۱۴۸۔	ممتاز حسین	''ادب اور شعور''	کراچی، اُردو اکیڈمی، سندھ، ۱۹۶۱ء
۱۴۹۔	ایضاً	''ادب اور روحِ عصر''	کراچی، شہرزاد، اگست ۲۰۰۳ء
۱۵۰۔	منصورہ احمد، منصور آفاق (ترتیب)	''گل پاشی''	لاہور، اساطیر، ۱۹۹۶ء
۱۵۱۔	منور علی، ملک	''پسِ تحریر''	لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء
۱۵۲۔	مہدی حسین ناصری	''مخزن الفوائد''	الٰہ آباد، مشن پریس، ۱۹۲۲ء
۱۵۳۔	ناہید قاسمی، ڈاکٹر	''جدید اُردو شاعری میں فطرت نگاری'' (۱۸۷۴ء سے ۲۰۰۰ء تک)	کراچی، انجمن ترقی اردو، ڈی ۱۵۹، بلاک (۷)، گلشن اقبال، ۲۰۰۲ء
۱۵۴۔	ایضاً	''ندیم کی غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ''	لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء
۱۵۵۔	ایضاً	''پاکستانی ادب کے معمار، احمد ندیم قاسمی، شخصیت اور فن''	اسلام آباد، اکادمی ادبیات، H-8/1، ۲۰۰۹ء
۱۵۶۔	نجیب جمال، ڈاکٹر	''محاسن'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ)	ملتان، بیکن بکس، گلگشت، باراوّل، ۱۹۹۴ء
۱۵۷۔	نصیر احمد ناصر، ڈاکٹر	''فلسفۂ حسن''	لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۴ء
۱۵۸۔	نوازش علی، ڈاکٹر (مرتبہ)	''پاکستان میں اُردو کے پچاس سال''	راول پنڈی، گندھارا بکس، اصغر مال روڈ، ۲۰۰۵ء
۱۵۹۔	وزیر آغا، ڈاکٹر	''نظم جدید کی کروٹیں''	لاہور، سنگت پبلشرز، ہی لوئر مال، چوتھا ایڈیشن، ۲۰۰۷ء
۱۶۰۔	ایضاً	''اُردو شاعری کا مزاج''	لاہور، مجلس ترقی ادب، ۲۔کلب روڈ، باراوّل، ۲۰۰۸ء
۱۶۱۔	وقار عظیم، سیّد	''تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان'' (جلد ششم وجلد ہفتم)	لاہور، پنجاب یونی ورسٹی، ۱۹۷۲ء

رسائل و روزنامے

نمبر شمار	نام	کیفیت	پبلشرز و سنہ اشاعت
۱۶۲۔	''اخبارِ اُردو''	ماہ نامہ	اسلام آباد، اگست ۲۰۰۸ء
۱۶۳۔	''ادب سرائے''	سہ ماہی	لاہور، ''خصوصی شمارہ''، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷ء
۱۶۴۔	''ادبِ لطیف''	ماہ نامہ	لاہور، اکتوبر ۱۹۵۵ء
۱۶۵۔	''ادبیات''	سہ ماہی	اسلام آباد، ''خصوصی شمارہ''، ندیم نمبر، جلد ۱۷، شمارہ ۷۳، اکتوبر/ دسمبر ۲۰۰۶ء
۱۶۶۔	''افکار''	ماہ نامہ	کراچی، شمارہ ۱۴، آزادی نمبر، ۱۹۵۲ء
۱۶۷۔	''افکار''	ماہ نامہ	کراچی، ندیم نمبر، شمارہ ۵۸/ ۵۹، جنوری/ فروری ۱۹۷۵ء

168- "Annual of Urdu Studies" Centre for South Asian Studies, University of Wisconsin, No.1, 1981.

نمبر شمار	نام	کیفیت	پبلشرز و سنہ اشاعت
۱۶۹۔	''اوراق''	ماہ نامہ	لاہور، جلد ۲۷، شمارہ ۶/ ۷، جون/ جولائی ۱۹۹۲ء
۱۷۰۔	''اوصاف''	روزنامہ	۱۲/ جولائی ۲۰۰۶ء
۱۷۱۔	''اوصاف''	روزنامہ	۹/ اگست ۲۰۰۶ء
۱۷۲۔	''ایکسپریس''	روزنامہ	۱۲/ جولائی ۲۰۰۶ء
۱۷۳۔	''ایکسپریس''	روزنامہ	۱۶/ جولائی ۲۰۰۶ء
۱۷۴۔	''بیاض''	ماہ نامہ	لاہور، خصوصی شمارہ، ندیم نمبر، نومبر ۲۰۰۶ء
۱۷۵۔	''بیاض''	ماہ نامہ	لاہور، مارچ ۲۰۰۷ء
۱۷۶۔	''بیاض''	ماہ نامہ	کراچی، شمارہ نمبر ۱، جلد نمبر ۱۶، جنوری ۲۰۰۸ء
۱۷۷۔	''جموں و کشمیر''	روزنامہ	مظفر آباد، ۱۵/ جولائی ۲۰۰۶ء

۱۷۸۔ ''جناح''	روزنامہ	لاہور، ۱۴/ جولائی ۲۰۰۶ء
۱۸۹۔ ''جنگ''	روزنامہ	کراچی، ۲۸/ اپریل ۲۰۰۴ء
۱۸۰۔ ''جنگ''	روزنامہ	لاہور، ۱۱/ جولائی ۲۰۰۶ء
۱۸۱۔ ''جنگ''	روزنامہ	لاہور، ۱۴/ جولائی ۲۰۰۶ء
۱۸۲۔ ''خبریں''	روزنامہ	لاہور، ۱۶/ جولائی ۲۰۰۶ء
۱۸۳۔ ''خبریں''	روزنامہ	لاہور، ۴/ اگست ۲۰۰۶ء
۱۸۴۔ ''راوی''	مجلّہ	لاہور، جی۔سی یونیورسٹی، ۲۰۰۷ء
۱۸۵۔ ''سخن''	مجلّہ	لاہور، اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی، ۲۰۰۴ء
۱۸۶۔ ''سنڈے ٹائمز''	ہفتہ وار	۲/ اگست ۲۰۰۶ء
۱۸۷۔ ''سنگِ میل''	ماہ نامہ	پشاور، شمارہ ۲،
۱۸۸۔ ''سورج''	سہ ماہی	لاہور، جون ۲۰۰۸ء
۱۸۹۔ ''سیارہ ڈائجسٹ''	ماہ نامہ	لاہور، ۱۹۹۹ء
۱۹۰۔ ''سیپ''	سہ ماہی	کراچی، شمارہ ۳۴
۱۹۱۔ ''ضیاء بار''	علمی وادبی مجلّہ	سرگودھا، گورنمنٹ کالج، جلد ۸، شمارہ ۱، جون ۱۹۹۱ء
۱۹۲۔ ''عالمی اُردو ادب''	سہ ماہی	دہلی، ''ندیم نمبر''، ۱۹۹۷ء
۱۹۳۔ ''عبارت''	سہ ماہی	حیدرآباد، ندیم نمبر، شمارہ ۶۔۵، اکتوبر ۱۹۹۶ء تا مارچ ۱۹۹۷ء
۱۹۴۔ ''فنون''	سہ ماہی	لاہور، جلد ۲۱، شمارہ ۴، ۵، ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۵ء
۱۹۵۔ ''فنون''	سہ ماہی	لاہور، دسمبر ۱۹۹۶ء
۱۹۶۔ ''فنون''	سہ ماہی	لاہور، شمارہ ۱۱۴
۱۹۷۔ ''فنون''	سہ ماہی	لاہور، جدید غزل نمبر
۱۹۸۔ ''فنون''	سہ ماہی	لاہور، اگست ۲۰۰۴ء

۱۹۹۔ ''فنون'' سہ ماہی لاہور، شمارہ ۱۲۴، جنوری/اپریل ۲۰۰۵ء

۲۰۰۔ ''فنون'' سہ ماہی لاہور، خاص شمارہ، ندیم نمبر، شمارہ ۱۲۸، دسمبر ۲۰۰۸ء تا دسمبر ۲۰۰۹ء

۲۰۱۔ ''قومی زبان'' ماہنامہ کراچی، مارچ ۲۰۰۸ء

202- " Leader " Allah Abad April 5, 1933.

۲۰۳۔ ''ماہِ نو'' ماہنامہ لاہور، جولائی ۲۰۰۷ء

۲۰۴۔ ''مخزن'' شش ماہی لاہور، شمارہ ۱۳، جلد ۷، ۲۰۰۷ء

۲۰۵۔ ''مخزن'' شش ماہی لاہور، شمارہ ۱۵، جلد ۸، ۲۰۰۸ء

۲۰۶۔ ''مخزن'' شش ماہی لاہور، شمارہ ۸، ۲۰۰۹ء

۲۰۷۔ ''معاصر'' سہ ماہی لاہور، جولائی ۲۰۰۰ء

۲۰۸۔ ''معاصر'' سہ ماہی لاہور، ندیم نمبر، جلد ۷، ۸، شمارہ ۲، ۳، ۴، اپریل ۲۰۰۷ء تا مارچ ۲۰۰۸ء

۲۰۹۔ ''مونتاج'' سہ ماہی لاہور، شمارہ ۱، جنوری/اپریل ۲۰۰۷ء

۲۱۰۔ ''مونتاج'' سہ ماہی لاہور، شمارہ ۳، ستمبر تا دسمبر ۲۰۰۷ء

۲۱۱۔ ''نردبان'' ماہنامہ سرگودھا، فروری، مارچ ۱۹۹۵ء

۲۱۲۔ ''نقوش'' سہ ماہی لاہور، شمارہ ۳

۲۱۳۔ ''نقوش'' سہ ماہی لاہور، شمارہ ۲۷۔۲۸، نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء

۲۱۴۔ ''نقوش'' سہ ماہی لاہور، مئی، جون ۱۹۵۳ء

۲۱۵۔ ''نقوش'' سہ ماہی لاہور، سالگرہ نمبر، ۱۹۵۳ء

۲۱۶۔ ''نقوش'' سہ ماہی لاہور، شمارہ ۳۹۔۴۰، مارچ ۱۹۵۴ء

۲۱۷۔ ''نقوش'' سہ ماہی لاہور، جون ۱۹۸۵ء

۲۱۸۔ ''نگار'' ماہنامہ کراچی، شمارہ ۱، جلد ۵۷، جنوری/فروری ۱۹۵۰ء

۲۱۹۔ ''نگار'' ماہ نامہ کراچی، اکتوبر ۱۹۵۶ء

۲۲۰۔ ''نوائے وقت'' روزنامہ ۲۷/ جولائی ۲۰۰۶ء

۲۲۱۔ ''نوائے وقت'' روزنامہ راول پنڈی، ۵/ اگست ۲۰۰۶ء

۲۲۲۔ ''نیوز پوسٹ انڈیا'' روزنامہ ۲/ اپریل ۲۰۰۸ء

۲۲۳۔ ''ہماری زبان'' ہفت روزہ نئی دہلی، جنوری ۲۰۰۸ء

مقالہ جات

نمبر شمار	مقالہ نگار	عنوان مقالہ	ادارہ و سنہ اشاعت
۲۲۴۔	آتکہ	''اُردو شاعری میں نعت گوئی''	مقالہ برائے ایم۔اے،اُردو، لاہور،اورینٹل کالج ،پنجاب یونی ورسٹی،۱۹۹۶ء
۲۲۵۔	سلمیٰ ہما	''جدید اُردو غزل میں امیجری''	مقالہ برائے ایم۔اے،اُردو، لاہور،اورینٹل کالج ،پنجاب یونی ورسٹی،۱۹۷۳ء
۲۲۶۔	طارق محمود ہاشمی	''جدید اُردو نظم میں تصورِ انسان''	مقالہ برائے ایم۔اے،اُردو، لاہور،اورینٹل کالج ،پنجاب یونی ورسٹی،۱۹۹۴ء
۲۲۷۔	غلام عباس	''ندیم بحیثیت شاعر''	مقالہ برائے ایم۔اے،اُردو، لاہور،اورینٹل کالج ،پنجاب یونی ورسٹی،۱۹۸۸ء
۲۲۸۔	محمد عباس	''احمد ندیم قاسمی کی ادبی شخصیت کی تشکیل''	مقالہ برائے ایم۔اے،اُردو، سرگودھا،یونی ورسٹی آف سرگودھا،۲۰۰۷ء
۲۲۹۔	مزمل حسین	''اُردو میں علمِ بیان اور علمِ بدیع کے مباحث'' (تحقیقی وتنقیدی جائزہ)	مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی،اُردو، لاہور،اورینٹل کالج ،پنجاب یونی ورسٹی،۲۰۰۵ء
۲۳۰۔	منیر احمد	''قیامِ پاکستان کے بعد بہاول پور میں اُردو مرثیہ''	مقالہ برائے ایم۔فل،اُردو، بہاول پور،اسلامیہ یونی ورسٹی،۲۰۰۵ء

۞ ۞ ۞